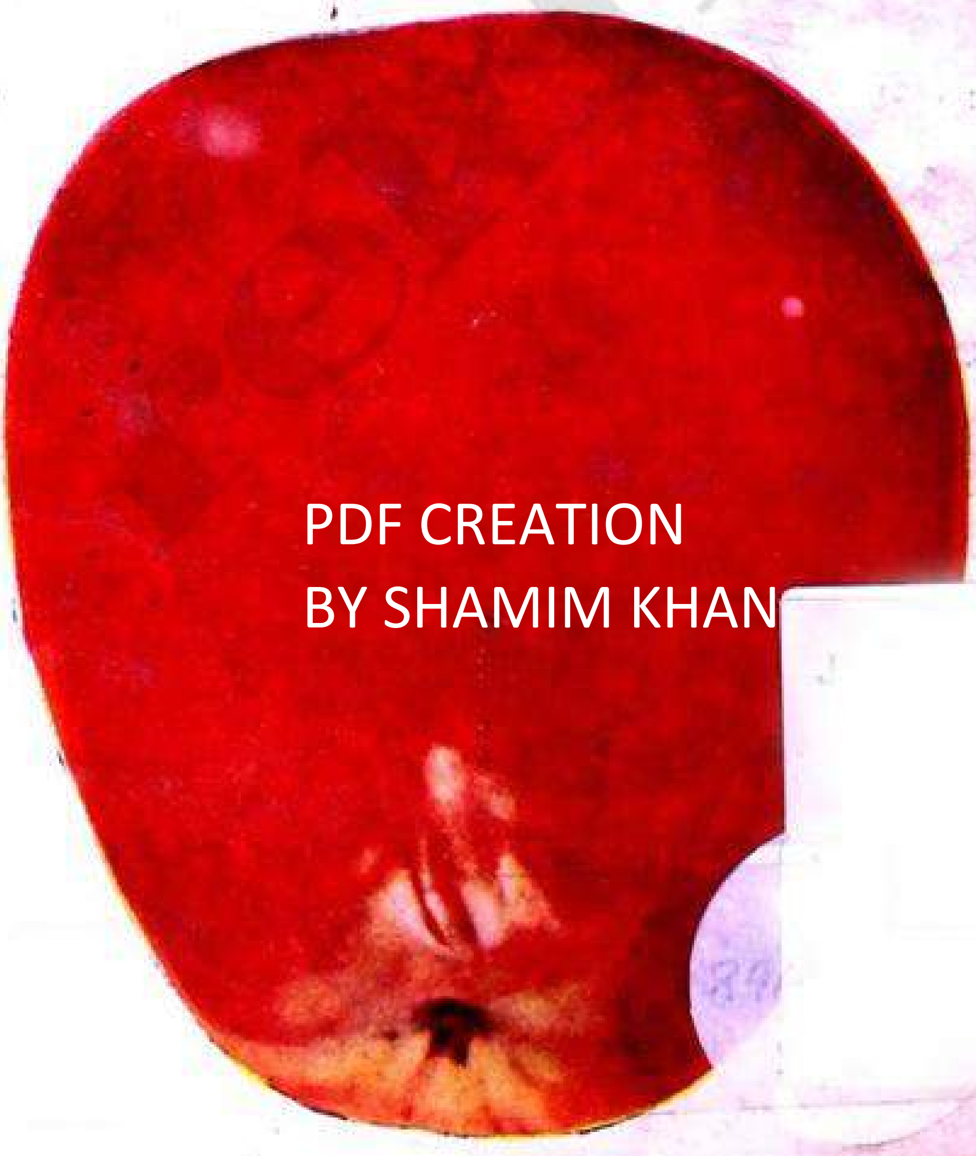
شیرازہ

کشمیری عجائبات نمبر



جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز۔ سری نگر

ماہنامہ

شیرازہ

سری نگر

کشمیری عجائبات نمبر

جلد ۲۶ * اگست ستمبر ۱۹۸۷ * شمارہ ۸-۹

نگران و مدیر اعلیٰ

محمد یوسف ٹینگ

مدیر

محمد احمد اندرابی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر

ناشر: -- سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر

مطبع: -- فوٹو لیتھو ورکس۔ دہلی

خطاط: -- محمد صدیق - غلام نبی کول

شرح چندہ

سالانہ ------ ۲۰؍ روپے

فی کاپی ------ ۲؍ روپے

شیرازہ میں چھپنے والے مضامین میں ظاہر کی گئی
آراء سے اکیڈمی یا ادارے کا
کلاً یا جزواً متفق ہونا ضروری نہیں

خط و کتابت کے لئے پتہ

محمد احمد اندرابی

ایڈیٹر "شیرازہ" (اردو)

جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی۔ لال منڈی۔ سری نگر

ترتیب

حرف آغاز

اگست۔ ستمبر کی مشترکہ اشاعت "کشمیری عجائبات نمبر" پر مشتمل ہے۔

کشمیر اپنے قدرتی حُسن اور دلفریب نظاروں کی وجہ سے سارے عالم میں مشہور ہی نہیں، منفرد مقام بھی رکھتا ہے۔ ماضی میں بھی اور آج بھی یہ رشکِ بریں خطۂ ارض اپنے پرایوں ۔ سبھی کیلئے باعث کشش رہا ہے۔ جو بھی یہاں آیا، اسے اس سرزمین کی کوئی نہ کوئی خصوصیت، خوبی یا انوکھا پن، جو کسی عجوبے سے کم نہیں، بھا گیا اور کچھ نہ کچھ کہنے یا لکھنے پر اُکساتا رہا۔

ہماری فارسی تواریخ میں تو "عجائبات کشمیر" کے عنوان سے باضابطہ علیحدہ ابواب مخصوص ہیں۔ ہماری دستکاریاں اور ہُنرمندیاں کسی عجوبے سے کم تر نہیں۔ جب آج کے برق رفتار اور مشینی دور میں ان پر نظر ڈالی جائے تو لگتا ہے کہ یہ بڑی تیزی سے معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ چنانچہ دو تین سال قبل کشمیری شیرازہ کا "کشمیری عجائبات نمبر" ترتیب دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تو ادبی حلقوں میں اس کی کافی سراہنا ہوئی۔

اکیڈیمی میں ہمارے سبھی رفقا نے "شیرازہ" کے نگران و مدیرِ اعلیٰ (اور اکیڈیمی کے سیکرٹری) جناب محمد یوسف ٹینگ کی اس تجویز پر لبیک کہا کہ مذکورہ خصوصی شمارے میں شامل مواد کو (بشمول اُردو) دوسری زبانوں میں شایع ہونے والے "شیرازہ" گروپ میں بھی شایع کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے کشمیری عجائبات نمبر میں شامل بیشتر مضامین کا اُردو ترجمہ کرایا۔ چند نئے موضوعات پر بھی مضامین لکھوائے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ زیرِ نظر شمارے میں اور مضامین کو شامل کرنے کی بھی گنجائش تھی۔ ہم نے اپنی طرف سے کوشش بھی کی تھی لیکن نتیجہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا۔ بہرحال جو بھی مواد ہم سے اکٹھا ہوسکا، اسے قارئین کی نذر کیا جارہا ہے۔

اس شمارے میں شامل مندرجات کے بارے میں ہمیں آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔

۔ محمد احمد اندرابی

محمد یوسف ٹینگ

عنبری سیب

کشمیر کا ثمرِ فردوس

کشمیر کا ماضی کچھ بہت خوبصورت چیزوں سے آراستہ تھا۔ ممکن ہے مستقبل اس سے زیادہ خوبصورت ہو۔ لیکن جب انسانی کاوش کی کوئی لطیف اور حسین چیز ختم ہونے لگتی ہے تو اداسی اور اتلاف کا احساس فطری ہے۔ کشمیر سے جو چیزیں رخصت ہو رہی ہیں اُن سے نظر اور نظارے، مہک اور مشام، ذوق اور ذائقے، لذت اور لطف، رنگ اور رامش، صوت اور صدا، آواز اور آہنگ کی کتنی ہی عجیب و غریب، ناقابلِ بیان، رنگا رنگ اور نادر قسم کی بے شمار کیفیات وابستہ ہیں۔ ان کی بالیدگی اور پرورش بڑی محنت اور بڑی ریاضت سے ہوئی تھی اور ان سے ہی کشمیر کا وہ مجموعی تاثر اور تصور وابستہ تھا جو اسے دنیا کا فردوس بناتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا نقصان صرف کشمیر کا ہی نہیں بلکہ انسانی وراثت کا نقصان ہے۔

عنبری سیب اس زوال آمادہ وراثت کا ایک بہت ہی المناک پہلو پیش کرتا ہے۔ میری تحقیقات کے مطابق یہ سیب اپنی لطافت اور ذائقے کے حساب سے صرف کشمیر کی مٹی سے مخصوص تھا۔ یہ سیب آہستہ آہستہ عدم کے اندھیارے میں ڈوب

رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی رنگ، نکہت، ذائقے اور خوبصورتی کا ایک کارواں رخصت ہو رہا ہے۔

سیب بہت قدیم میوہ ہے۔ سامی نسل کے مذہبی صحیفوں مثلاً زبور، انجیل وغیرہ میں اس سے وابستہ بہت سی روایات و حکایات بیان ہوئی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت آدمؑ جب بہشت سے نکالے گئے تو اُن کے اخراج کا باعث یہی ثمر ممنوعہ (سیب) تھا۔ جوں ہی انہوں نے اس کو چکھا، جنت کی مقدس زمین اُن کے لئے تنگ ہو گئی۔ جب زمین پر اُن کی پسلی سے نکلی ہوئی عورت حوّا اُن کے سامنے آئی تو اسی پھل کے اُفقی (HORIZONTAL) انداز میں دو نصف حوّا کے سینے پر اُبھرے ہوئے نظر آئے۔ یہی پستان ہیں جن کو دیکھ کر اب بھی آدم کے بیٹے رقصِ بسمل کرنے لگتے ہیں اور دُختِ حوّا انہیں شجرِ ممنوعہ کی طرح چھپاتی پھرتی ہے۔ اسی طرح ان صحائف میں سیب کی ٹہنی اور سانپ کی وہ مشہور لیجنڈ بھی بیان ہوئی ہے جو بہت سے شاعروں کے لئے طبع آزمائی کا مرغوب موضوع رہتی چلی آئی ہے۔

سیب کی شکل انسانی دل سے مشابہ ہے۔ اس لئے عاشق اور معشوق اس کو اپنے دل کی کیفیت بیان کرنے کے لئے بطورِ علامت بھی شکل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بالپن میں لڑکے اور لڑکیاں اپنے خطوں پر یہ نشان ♡ بناتے رہتے ہیں۔

سیب کا نباتاتی نام Malus Purmila ہے۔ یہ تقریباً ساری دنیا کے اُن علاقوں میں ہوتا ہے جو بہت شدید گرمی اور بہت ہی شدید سردی سے محفوظ ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے بیان کے مطابق یہ جنوب اور مشرقی ایشیا کا باسی NATI-VE ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ وہاں کے اصل باشندوں کی اوّلین غذا تھا۔ کیٹو (cato) نے جو تیسری صدی قبل مسیح میں گذرا ہے اس کی تین قسموں کا ذکر کیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ یورپ سے ہی ہندوستان، چین اور جاپان میں آیا۔ معتدل آب و ہوا کے

اِن علاقوں میں سیب کی ہزاروں اقسام پائی جاتی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ہی مطابق صرف امریکہ میں اس کی سات ہزار قسمیں موجود ہیں۔ یورپ کے اکثر ممالک اور بحیرۂ روم کے کنارے آباد ساحلی ملکوں میں سیب کثرت سے ہوتے ہیں۔ سوویت یونین کی ایشیائی جمہوریتوں میں بھی سیب کثرت سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ ارمینیا کی راجدھانی کا نام ہی الماآتا ہے (جس کے معنی ترکی میں سیبوں کا باپ کے ہیں)۔ ہندوستان ایران اور افغانستان کے بہت سے علاقوں میں یہ پھل پیدا ہوتا ہے۔ فارسی شاعری میں محبوب کے چہرے سے متعلق سیبِ زنخ کی ترکیب تقریباً ہر اہم شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ محبوب کی ٹھوڑی پر مسکراتے وقت جو دلربا گڈھے پڑتے ہیں ان کا دائرہ سیب کے دوسروں پر موجود گڈھے جیسا ہوتا ہے اور یہی اس تشبیہ کی توجیہہ ہے۔

کشمیر میں سیب کب سے آیا ہے، اس پر دو رائیں ممکن ہیں۔ لیکن اس میوے کے لئے کشمیری میں ایک خالص مقامی لفظ "ژونٹھ" موجود ہے جو اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ اگر یہ اس زمین کی خود رو پیداوار نہ بھی رہا ہو۔ پھر بھی اس کا کشمیر سے تعلق بہت قدیم ہے۔ اتنا قدیم کہ یہ اس مٹی کی مہک سے شرابور ہو گیا ہے۔ ہمارے جنگلوں میں اس کی کچھ جنگلی قسمیں بھی ملتی ہیں۔ اور اسی لئے اس تعلق کی قدامت کا صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔

کلہن پنڈت کی "راج ترنگنی" میں بھی سیب کا ذکر موجود ہے اگرچہ اس نے عنبری کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس حوالے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراجوں کے دربار میں پہونچنے والا یہ پھل ہو نہ ہو امبری ہی ہے۔ کتاب کی چھٹی ترنگ کے شلوک "۳۵" سے ۳۶۰ تک یہ ذکر رانی دیدا (۹۸۰ء - ۱۰۰۳) میں ہوا ہے۔ دیدا جب بوڑھی ہونے لگی تو اسے اپنے جانشین کا خیال آیا۔ اس نے اپنے بھائی اُدے راج کے بیٹوں کو بلایا۔ انکی ذہانت کا

امتحان کرنے کے لئے اُن کے سامنے ڈھیر سارے سیب ڈال دیئے اور اُن سے کہا کہ جو لڑکا سب سے زیادہ سیب لے کر آئے گا اُسے وہ اپنا یوراج بنائے گی۔ باقی لڑکوں نے چھینا جھپٹی شروع کی لیکن سنگرام الگ بیٹھا تماشہ دیکھتا رہا۔ جب باقی لڑکے جھپٹنے پلٹنے کے بعد لہولہان ہو کر کچھ سیب لے کر آئے تو دیدا نے دیکھا کہ سنگرام کے پاس کچھ کم سیب نہیں مگر اُسے خراش تک نہیں لگی۔ اُس نے سنگرام سے پوچھا کہ وہ کس طرح لڑنے بھڑنے کے بغیر ہی اتنے سیب جمع کرنے میں کامیاب ہوا۔ سنگرام نے جواب دیا "میں نے انہیں آپس میں لڑوا دیا۔ اور خود نہ صرف زیادہ پھل وصول کئے بلکہ کسی چوٹ سے بھی بچا رہا"۔ دیدا خوش ہو گئی اور سنگرام کو اپنا ولی عہد نامزد کر لیا۔ اسی طرح مرزا حیدر دوغلات (۱۵۴۲ - ۱۵۵۲ء) نے شاید عنبری سیب کو چکھ کر ہی اپنی کتاب تاریخ رشیدی میں لکھا کہ "کشمیر کا سیب بہت عمدہ ہوتا ہے"۔

لل دید (چودھویں صدی عیسوی) کے کلام میں سیب کا ذکر اسی ترتیب اور تلفظ کے ساتھ آیا ہے جیسا کہ "راج ترنگنی" میں کلہن نے کیا ہے۔ وہ الگ الگ موسموں کے ان پھلوں کے ایک ہی وقت پک جانے کو کلجگ کی نشانی قرار دیتی ہے ؎

تیلہ بالہ آسن تتھی کیرن   ٹنگ ژونٹھ ہین زیرن عہ ستی
ماجہ کورہ اتھہ واس کرتھ تیرن   دۄہ دین برن غارن عہ ستی ن

[اس زمانے میں ناشپاتی اور سیب خوبانیوں کے ساتھ (ایک ہی وقت) پک جایا کریں گے۔ ماں بیٹیاں باہنوں میں باہنیں ڈالے گھر سے نکلا کریں گی۔ اور دن بھر غیروں کے ساتھ گلچھڑے اُڑایا کریں گی]

ن: "لل واکھیانی" مرتب ملے۔ کے وانچو۔ یہ واکھ حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین سے بھی منسوب ہے۔ (م۔ ی۔ ٹ)

عنبری سیب کشمیر میں سیبوں کا بادشاہ ہے اور سچ پوچھئے تو ساری دنیا کے سیبوں کا بھی۔ اس کا نام عنبری کیوں پڑا؟ میرا خیال یہ ہے کہ اس کی خوشبو اتنی تیز اور حواس پسند ہوتی ہے کہ کشمیریوں نے اس کے ڈانڈے 'عنبر' کی لازوال خوشبو سے ملا دیئے۔ عنبر کی خوشبو ایک سمندری مچھلی سے حاصل ہوتی ہے اور عنبر مشک کا ذکر سنسکرت اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ سر والٹر لارنس نے بھی اس کا پہلا نام "عنبرو" (Ambru) ہی دیا ہے۔

عنبری سیب کا بوٹا جنگلی پودے پر عنبری درخت کی ٹہنی کا پیوند لگا کر اگایا جاتا ہے۔ یہ پیوند بارہ سے پندرہ سال تک کے عرصے میں پھل دینے لگتا ہے۔ لیکن پھر یہ ایک بلند و بالا گھیرے دار درخت کی صورت میں پھلتا ہے۔ اپنے جوبن میں اس درخت سے ایک ہزار تک سیب حاصل کئے جا سکتے ہیں اور اس کی عمر ایک سو سال تک بھی ہو سکتی ہے۔ یہ درخت اپنے بوڑھاپے میں بھی جب اس کا تنا بوڑھاپے سے نڈھال بھی ہو رہا ہو، پھل دیتا ہے۔ اس کا تنا اپنے کمال میں چھ فٹ سے زیادہ لپیٹ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ جب یہ پیڑ سوکھ جاتا ہے تو اس کی لکڑی اپنی تیز آگ اور دیرپا انگاروں کی خاصیت کی وجہ سے کافی مانگ میں رہتی ہے۔

عنبری سیب کے درخت پر بہار کے اختتام یعنی اپریل کے آخر میں شگوفے نکل آتے ہیں۔ شگوفے ایک سیلاب کی طرح آتے ہیں اور سارے درخت کو یا قوت لگے ہوئے روپہلے زیوروں سے لد پھند دیتے ہیں۔ عنبری سیب کا شگوفہ باقی شگوفوں کی نسبت زیادہ گلابی مائل ہوتا ہے اور اس لئے رنگ کی ایک عجیب جلوہ آرائی کرتا ہے۔ بقول سر والٹر لارنس .... "میرے خیال میں فطرت کا سب سے اہم کرشمہ کشمیر میں بادام کے شگوفے اور گل سوسن کا رنگ ہیں۔ لیکن جب سیب کے پھول پرجوش سورج کے لمس سے کھلتے ہیں تو یہ شگوفہ بادام کی لطافت سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں"۔ لیکن یہ شگوفہ بہت ہی نازک مزاج اور حساس ہوتا ہے۔ اس کیلئے دھوپ کی دھیمی آنچ ضروری ہوتی ہے۔ ذرا زیادہ بارش ہوئی یا تھوڑی سی خنکی بڑھ گئی تو شگوفہ تباہ ہو سکتا ہے۔ شگوفے دو سے تین ہفتوں کے اندر آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں کی ذیلی شاخوں پر چھوٹے چھوٹے سبز سیبوں کی ایسی افراط اگ آتی ہے گویا پتے تک ثمر کا روپ اختیار کر گئے ہوں۔ چھوٹا سا پھل پتوں کی اوٹ میں آہستہ آہستہ نشو و نما پانے لگتا ہے۔ یہی زمانہ ہوتا ہے جب بیوپاری باغ میں جا کر اس کو خریدنے کی پہل کرتا ہے۔ وہ سیب کے درخت کو دیکھ کر تقریباً سو فیصدی صحیح اندازہ لگاتا ہے کہ اس پر سے کتنی پیٹیاں حاصل کی جا سکتی ہیں اور اسی حساب سے قیمت ادا کرتا ہے۔

دو مہینوں میں یہ پھل خاصا بڑھ جاتا ہے اور اگست کے مہینے میں اس پر رنگ کی لکیریں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس دوران اسے اعتدال کی گرمی کے علاوہ مناسب مگر پھوار کی صورت میں بارش کی احتیاج بھی رہتی ہے لیکن ذرا گرمی سردی کا میزان بگڑ گیا تو یہ شہزادی بھی بگڑنے لگتی ہے۔ رنگ آنے کے مہینوں یعنی ستمبر اور اکتوبر عموماً خشک ہونے چاہئیں۔ لیکن رنگ کا آخری اور طوفان بردوش جلوہ ستمبر کے آخر یا اکتوبر کے اوائل میں بارش کے چند چھینٹوں کے بعد ہی نکھار دکھاتا ہے۔ جس طرح دلہن کا سنگار عروسی کی سحر کے نہانے سے دمکنے لگتا ہے۔ جب عنبری سیب پر پورا رنگ آ جاتا ہے تو واقعی ایسے لگتا ہے جیسے سبز نیلمیں پتوں کے درمیان یاقوت یا عقیق کے دانے چمک رہے ہوں۔ چاندنی میں اس رنگ کی تیزی ایسے لگتی ہے جیسے پیڑ پر چراغ جل رہے ہوں۔ یہ رنگ ایسا خالص اور پاکیزہ گلابی ہوتا ہے کہ فطرت کے کارخانے سے باہر اس کی صفا اور رنگ

پیدا کرنا تقریباً محال ہے۔ نہ اس میں غیر پسندیدہ گہرائی ہوتی ہے اور نہ غیر ضروری نقاہت۔ کشمیر کے معشوقوں کے رخساروں کو اس کی رنگت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض شعراء نے اُن گڑھوں کو، جو مسکراتے وقت معشوق کے رخساروں پر پڑتے ہیں سیب سے تشبیہ دی ہے کیوں کہ یہ گڑھے سیب کے دانے جیسے گول ہوتے ہیں۔ حافظ شیرازی کا شعر ہے ؏

بہ بیں کہ سیب زنخ دانِ او چہ مے گوید
ہزار یوسف مصری فتادہ در چاہ است

اکتوبر میں جب یہ میوہ اپنے عروج کو پہونچتا ہے تو عنبری کے باغ میں جانا نظر اور مشام دونوں کے لئے ایک انتہائی فرحت افزا تجربہ ہوتا ہے۔ بھاری بھاری پھلوں سے جھکی ہوئی شاخیں گویا گلابی رنگ کی کہکشاں جیسی لگتی ہیں۔ اور عنبری کی خوشبو ساری فضا کو معطر اور شرابور بنا دیتی ہے۔ اس مہک سے واقعی جیسے روح کے روشندان کھل جاتے ہیں۔ اُسی وقت اس سیب کی وجہ تسمیہ جادو کی طرح سر چڑھ کر بولنے لگتی ہے۔ یہ زمانہ سیب کے لئے بڑا نازک ہوتا ہے۔ اگر ہوا کا زیر و بم ذرا زیادہ ہو تو پکے ہوئے سیب، جن کا ڈنٹھل پک کر اب شاخ سے الگ ہونے کے لئے آمادہ و تیار ہوتا ہے، نیچے آ گرتا ہے۔ ایک ایک شاخ سے تین سے چار پھلوں کی لڑی آویزاں ہو سکتی ہے جو اس انزال کے لئے اور بھی زیادہ سازگار ہوتی ہے۔ اس وقت پر آندھی آنے سے اسّی فی صدی تک کی فصل ضائع ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ ایک بار سیب اپنی بلندی سے گرا تو زخمی ہو جاتا ہے اور یہی زخم اس کو سڑا دینے کا باعث بنتا ہے۔ بہرحال اگر ان آفتوں سے نجات ہو تو سیب کو حاصل کئے جانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مزدور سیب کے درخت پر چڑھ کر ہاتھوں سے ایک ایک دانہ کاٹ کر انہیں خاص تیلیوں سے بنی ہوئی ٹوکری، جس کے اندر ملائم ٹاٹ لگا ہوتا ہے کہ نازک پھل کو کوئی خراش وغیرہ نہ آئے، میں رکھتا جاتا ہے۔ یہ ٹوکری جسے کشمیری میں "زاٹن" کہتے ہیں۔ پھر رسی سے باندھ کر نیچے لائی جاتی ہے جہاں زمین پر کھڑا دوسرا شخص اپنے گلے میں پڑی ہوئی بڑی سی چادر میں اس کو ڈال دیتا ہے اور پھر انبار میں جمع کرتا ہے۔ پیڑ بڑا ہو تو اس کی خارجی ٹہنیوں پر جو اتنی پتلی ہوتی ہیں کہ کسی آدمی کا بوجھ نہیں سہار سکتیں، خاص قسم کی moveable سیڑھیاں (پہلے لکڑی کی اور اب المونیم کی) استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد انبار سے چھنائی کا کام شروع ہوتا ہے۔ چار قسموں کے سیب الگ الگ ڈھیروں میں ڈالے جاتے ہیں:-

(۱) وہ سیب جو خاصا موٹا ہو اور اس پر چاروں طرف بھرپور رنگ بھی ہو۔ یہ سب سے اعلیٰ قسم ہوتی ہے اور ایک سیب آدھے کلو وزن کا بھی ہو سکتا ہے۔

(۲) وہ سیب جو زیادہ موٹا نہیں ہوتا لیکن جس پر بہت شوخ اور ہمہ گیر رنگ چڑھا ہوا ہو۔ اس قسم کا سیب اپنی رنگت میں بہر طور موٹے سیب پر بازی لے جاتا ہے۔ یہ عموماً بیضوی مگر لمبی شکل کا ہوتا ہے۔

(۳) وہ سیب جو موٹا تو ہو مگر جس پر رنگ کی صرف چند لکیریں ہوں اور زیادہ سطح سبزی مائل ہو۔ یہ کم پسندیدہ قسم ہوتی ہے۔

(۴) وہ سیب جو بہت چھوٹا ہو اور جس کا رنگ بھی کچھ کچھ ماند ہو، عموماً مربّہ بنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

پہلی دو قسم کو کائرو کی لکڑی سے بنی ہوئی پیٹیوں میں بھر لیا جاتا ہے۔ پہلی قسم کے سیب چار تہوں میں اور دوسری قسم کے پانچ تہوں میں بھرائی کرنے والے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ وہ تہوں کو قطاروں میں ایسے سجاتے ہیں کہ اُن پر نظر ڈالنے سے ہی آنکھ کو لذت آجاتا ہے۔ ایک تہہ میں بیس سے تیس تک دانے

لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر تہہ کے نیچے دھان کی خشک گھاس لگائی جاتی ہے تاکہ اس ملائم لمس میں یہ بہت ہی لطیف ثمر کسی گزند سے محفوظ رہے۔ بہت سی صورتوں میں اس گھاس کے نوکیلے سروں کو نرم بنانے کے لئے اسے خوب کوٹا جاتا ہے۔ اوپر کی تہہ کو رنگ برنگ کے حریری کاغذوں سے سجایا جاتا ہے۔ اسے "سر تہہ" کہتے ہیں اور دساور میں خریدار اسی تہہ کو دیکھ کر دام کا فیصلہ کرتا ہے۔ پیٹی کو بند کرکے اس پر فرم کا ٹھپہ لگایا جاتا ہے اور سیب کی قسم کا بھی۔ اور پھر یہ گاڑیوں میں جموں، دلی وغیرہ روانہ ہوتا ہے۔ بہت سی صورتوں میں یہ برف خانوں (cold stores) میں رکھا جاتا ہے اور پھر اسے وقت وقت سے نکال کر بیچا جاتا ہے۔ کشمیر کی آب و ہوا میں عنبری سیب اپریل، مئی کے مہینوں تک محفوظ رہ سکتا ہے مگر دلی میں برف خانے بھی اس کی زندگی دراز کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ امبری سیب کے چھلکے پر ایک ہلکے سفید رنگ کا پاؤڈر سا لگا ہوتا ہے۔ یہ سیب اُگانے والوں کا خیال ہے کہ جب تک یہ پاؤڈر ماند نہ پڑجائے سیب اس کے اثر سے تازہ اور تندرست رہتا ہے لیکن اکثر تاجر سیب کو چمکانے کے لئے یہ صاف کر دیتے ہیں اور اس طرح سیب کا یہ قدرتی حفاظتی مادہ زائل ہوجاتا ہے۔

عنبری سیب کشمیر کے سیبوں میں سب سے زیادہ طویل عمر پاتا ہے۔ اسکی رنگت اگرچہ بدستور رہتی ہے لیکن چند ماہ کے بعد یہ پھسپھسا سا ہوجانے لگتا ہے جس کسی نے عورت کے پستانوں کو سیبوں کے مترادف قرار دیا تھا اُس نے شاید اس بات کا مشاہدہ کیا ہو جس طرح عورت کی چھاتیاں جوبن میں کسی ہوئی، سخت اور سرکش لگنے کے بعد عمر گذرنے کے ساتھ ڈھلنا شروع ہوتی ہیں اور ان پر جھریاں نظر آجاتی ہیں اسی طرح عنبری سیب بھی مہینے گذرنے کے ساتھ سکڑنا شروع ہوتا ہے۔ اس کا رس کم ہونے لگتا ہے اور عورت کے پستان کی طرح اس کا ریشہ بھی پھسپھسا ہونے لگتا ہے۔ البتہ اس کی مہک میں کچھ اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ عنبری کے ذائقے کا صحیح تذکرہ کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ سیب بہت ہی لطیف ذائقے کا ہوتا ہے۔ شیرینی اور مٹھاس بہت مناسب مقدار میں مگر اس میں بھی چپچپاہٹ کا شائبہ نہیں۔ اس کے ذائقے کو شہد کے ذائقے سے ہی ملایا جاسکتا ہے۔ ابتداء میں یہ رس سے بھرپور ہوتا ہے اور دانتوں سے کاٹنے پر بھی نہ سخت محسوس ہوتا ہے اور نہ دانتوں پر کوئی ناگوار مٹھاس چھوڑ دیتا ہے۔ ویلی آف کشمیر کے لائق مؤلف سروالٹر لارنس نے اس کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ذائقے کو (انگریزوں کیلئے ضرورت سے) زیادہ میٹھا قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے انگریزوں کو اس لطیف مٹھاس کی عادت ہی نہیں کیوں کہ انہیں اس قسم کے پھل کی نعمت حاصل ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ ترشی مائل ذائقے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ عنبری سیب کی طبی خاصیتوں کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ یہ حاملہ اور زچہ عورتوں کے لئے مفید ہے۔ کیونکہ اس میں نباتاتی لوہا بڑی مقدار میں ہوتا ہے۔ اس کو امراض قلب کے لئے بھی بہت مفید مانا گیا ہے۔ کشمیر میں معدے کے السر (ulcer) کی جو علت موجود ہے، سیب عنبری اس کیلئے بھی اچھا ہے کیوں کہ اس کی لطیف چاشنی معدے میں تیزابیت کو کم کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ بہت زود ہضم بھی ہے۔ یہ سیب اعلیٰ قسم کی شراب بنانے میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کو خاص مہک عطا کرتا ہے۔ اس سے سرکہ بھی تیار ہوتا ہے۔

عنبری سیب کی کئی قسمیں ہیں — دودھ عنبر، مُہر عنبر وغیرہ۔ کشمیر میں پچھلی صدی میں انگریزوں نے فرانس کے سیبوں کے بوٹے منگولئے جنہیں کشمیری

اب بھی فراشی (فرانسیسی کی کشمیری) کہہ کر پکارتے ہیں۔ آزادی کے بعد Deli-cious ۔ مہاراجی، امریکن وغیرہ قسمیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ان میں رنگ تو اچھا ہوتا ہے لیکن ان کا ذائقہ عنبری سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چونکہ یہ بوٹے پانچ چھ برسوں میں فصل دینا شروع کرتے ہیں اس لئے جلد از جلد پیسہ بٹورنے والوں کے لئے یہ بہت مرغوب ہیں۔ عنبری سیب کی دیر پیوندی اور دورسم میزی کیلئے انہیں فرصت نہیں۔ اس لئے عنبری کے نئے باغات نہیں لگ رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پرانے پیڑ اب بوڑھے ہو چکے ہیں اور دس پندرہ سال کے عرصے میں یہ خوبصورت اور خوش ذائقہ ثمر بہشت بالکل عنقا ہو کر رہ جائے گا۔ اُدھر منڈیوں کی حرکیات Dyna-mics ۔ نے بھی اس کے لئے بہت مشکل پیدا کر لی ہے۔ چونکہ یہ اب بازار میں کم دستیاب ہوتا ہے اس لئے اب اس کا ذائقہ بھی بہت کم لوگوں کو از بر ہے۔ جو پہلے چاہنے والے تھے وہ ختم ہو گئے (پنجاب میں اردو پڑھنے والے اخبار بینوں کی طرح۔ کہا جاتا ہے کہ پنجاب کے شہروں میں جو جنازہ چلتا ہے اس کو دیکھ کر ستم ظریف کہتے ہیں کہ اردو اخبار کا ایک اور قاری کم ہو گیا۔ یہی بات عنبری سیب پر صادق آتی ہے)۔ چونکہ ذائقہ یاد نہیں اس لئے خریداری نہیں۔ اور چونکہ بڑی مقدار میں نہیں ملتا اس لئے خریدار کی دلچسپی قائم نہیں رہ سکتی۔ خریدار کی دلچسپی قائم نہیں تو اُگانے والے کے لئے کوئی تحریک نہیں۔ اس طرح سے یہ اُگانے والے اور کھانے والے کی ضرورتوں کے درمیان ایک شیطانی چکر میں پھنس کر فنا ہو رہا ہے۔ عنبری کو اب ایک اور مصیبت نے آن گھیرا ہے۔ چونکہ اس کے درختوں کی تعداد بہت کم ہے لہٰذا نسل کشی (Cross Pollination) کے ایجنٹ بھی بھٹک گئے ہیں۔ یہ بھنورے وغیرہ اب صرف عنبری کے مادہ اور نر درختوں پر بیٹھ کر زرگل نہیں سمیٹتے بلکہ یہ عنبری کے درخت سے اڑ کر پاس کے Delicious یا امریکن کے

شگوفے پر بیٹھتے ہیں اور اس طرح سے تبادلۂ تخم کی اس اولین منزل سے ہی ملاوٹ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو عنبری جیسے کٹر پسند اور نازک جواہر پھل کا سارا ذائقہ اور خاصہ زائل کر دیتا ہے۔ اسی لئے آج کا عنبری اُس عنبری سے بہت گھٹیا ہے جسے ہماری پیڑھی کے لوگوں نے بچپن میں چکھا تھا۔

کشمیر کے عنبری کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس کے لئے شوپیان کے علاقے کی زمین بہت سازگار ہے۔ ابتدا میں شوپیان کا ہی عنبری سب سے زیادہ مشہور اور پسندیدہ تھا۔ شوپیان میں پانی کی افراط ہے۔ وہاں وادی کے نچلے میدانوں سے زیادہ ٹھنڈی آب و ہوا اور چکنی اور سخت مٹی ہے۔ اور یہ چیزیں عنبری سیب کے لئے اکسیر رہی ہیں۔ بعد میں یہ سری نگر اور سوپور بھی پہونچ گیا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ سیب شوپیان کے سیب کے مقابلے میں ایسے ہی لگتے ہیں جیسے کلو ہماچل کے سیب کشمیری سیب کے سامنے۔ شوپیان کے میوے کی لطافت، رنگت اور نکہت کسی اور جگہ کے عنبری میں پیدا نہیں ہوتی۔ یہ میوہ شوپیان سے پہلے مزدوروں کی پیٹھ پر "ڈالیوں" میں جاتا تھا۔ مورخ حسن نے لکھا ہے کہ کچھ لوگ اسے تحفتاً اپنی دستاروں میں بھی بیرون کشمیر لے جاتے تھے۔

امریکہ میں اس سیب کو منگوانے کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ کچھ امریکی فروٹ گرو ور کشمیر آئے اور عنبری پر دل دے بیٹھے۔ لیکن جب اس کا پیوند امریکہ لے جانے کی کوشش کی گئی تو امریکی حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی کہ اس کے ساتھ کوئی بیماری وہاں کے باغات میں وارد نہ ہو۔

عنبری اگرچہ Sanjoe's Scab اور Scab جیسی بیماریوں کی زد میں رہا ہے۔ لیکن اس کی جڑیں چونکہ کشمیر کی مٹی سے مانوس ہو گئی تھیں اس لئے یہ بیماریاں اس کو اکھاڑنے میں ناکام رہیں اور معمولی سی دوا پاشی

سے اُن کا علاج ہو جاتا تھا مگر نئی اور اجنبی قسموں کے سیب scab کے آگے جس طرح "کشتوں کے پُشتے" لگانے کا منظر پیش کر رہے ہیں اُس نے کشمیر کی میوہ انڈسٹری کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ عنبری شاید اب دوبارہ زندہ ہو بھی نہیں سکتا۔ تجارتی اور بازاری مصلحتوں نے اس خوبرو، خوشنما، خوشبو اور خوش ذائقہ ثمر کو عدم کی کھائی کے کنارے لا کھڑا کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ کشمیر کی لطیف صوفیانہ موسیقی کی طرح ہمارے معاشرے کی ایک ایک بہت ہی جمیل متاع لڑھک رہی ہے ؎

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

امبری سیب کے متعلق کچھ اور اہم باتیں

(۱) یہ میوہ اوپر کے بستے (جس سے یہ درخت کی ٹہنی سے لگا رہتا ہے اور جسے انگریزی میں STYMEN کہتے ہیں) پھل (جو چھلکے۔ گوشت اور بیچوں بیچ چھپے ہوئے بیج کے چند دانوں پر مشتمل ہوتا ہے) اور زیریں حصے جس میں چند سخت بال جیسی کوئی چیز ہوتی ہے) کا مجموعہ ہوتا ہے۔

(۲) یہ عموماً ڈھلانوں (SLOPES) پر خوب اُگتا ہے کسی میدانی جگہ میں یہ رطوبت سے خراب ہو سکتا ہے۔

(۳) عنبری سیب ایک مکمل غذا مانا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریزی فوج کیلئے اس کا راشن کیا گیا۔ کشمیر کا تقریباً سارا میوہ فوجی مقاصد کے لئے مخصوص کیا گیا چنانچہ اس دوران کشمیری تاجروں نے خوب پیسہ کمایا۔ اسطرح راتوں رات دولت مند بننے والوں کو کشمیری "جرمن خوجہ" کے تمسخر آمیز نام سے پکارتے تھے۔

(۴) فارسی کا عنبر اور سنسکرت کا امر ایک ہی خوشبو کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس لئے عنبری سیب کو اگر امبری بھی کہا جائے تو ٹھیک ہے۔

(۵) عنبری کا درخت عورت کی طرح تقریباً چودہ سال کے بعد پھل دیتا ہے۔ اس پر شوریدہ کاشمیری کی نکتہ سنجی ملاحظہ ہو۔ ؎

پھل دیتا ہے چودہ سال کے بعد بوٹا تیرا آدمی ہے؟ کیا ہے؟

اس نظم "سیب عنبریں" کے چند اور شعر یوں ہیں ؎

دیکھا ہے بہ خواب جس نے تجھ کو فرزند اُسے عطا ہوا ہے

لاریب ہے سیب عنبریں تو میووں کے جہاں کا بادشاہ ہے

لیکن یہ ہوا چلی ہے کیسی نایاب تو بیش ہو رہا ہے

رطب اللسان آم کے ہیں غالب شوریدہ کو ذوق بس ترا ہے

موتی لال ساقی

کانسی کے مجسمے

فنِ لطیف کو آگے لے جانے میں کشمیر کا حصّہ زمانۂ قدیم سے ہی قابلِ تحسین رہا ہے۔ اس فن کی رنگا رنگ تاریخ میں کوئی بھی تذکرہ تب تک نامکمل رہے گا جب تک کہ اُس میں کشمیر کا ذکر نہ ہو۔ فلسفۂ جمالیات ہو یا ادب، مجسّمہ سازی ہو یا موسیقی، مُصوّری ہو یا فنِ تعمیر ــــ فنونِ لطیفہ کے ان سبھی شعبوں میں کشمیر کو انفرادیت حاصل رہی ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ ان شعبوں میں کشمیری فن کاروں نے مختلف ذرائع سے اثر تو قبول کیا لیکن وہ نقّالی کے پیچھے نہ رہے بلکہ انہوں نے تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہر چیز کو اپنا مخصوص رنگ عطا کیا۔ تخلیقی کوششوں کو پروان چڑھا کر کشمیریوں نے ہر شعبے میں نام کمایا ہے۔ فنِ تعمیر، مُصوّری اور مجسمہ سازی وغیرہ جیسے شعبوں میں تو علیحدہ علیحدہ سکول وجود میں آ گئے۔ ان کی شہرت آج بھی شائقینِ فن کو اپنی اور کھینچتی ہے۔

کشمیر میں مجسّمہ سازی کا فن اگرچہ گاندھار مجسّمہ سازی کے اثر کے تحت جنم

لیتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ فن اپنا ایک الگ رنگ اختیار کرتا ہے۔ مقامی اثر سے یہ فن قوت حاصل کر کے جاندار بنتا گیا۔ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد ہماری مجسمہ سازی کی روایت نے گاندھار اثر کے ساتھ ساتھ گُپت، پرتہار اور متھرا جیسے سکولوں کا اثر بھی قبول کیا لیکن اس فن کی بنیادی انفرادیت کو ہمارے فن کاروں نے ہر موڑ پر قائم رکھا۔ اس طرح کشمیری مجسمہ سازی ایک ایسا تر و تازہ گُلدستہ بن گئی جس میں رنگا رنگی کے باوجود اپنا الگ مزاج موجود ہے۔

مجسّمہ سازی کے شعبے میں کشمیریوں کا اثر کشمیر تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ حسن کاری کی اس زوردار رَو نے ہماچل پردیش، سوات، لداخ اور تبّت تک اور بعض صورتوں میں اس سے بھی آگے اپنے آپ کو پھیلا دیا۔ کانسی کی مورتیاں بنانا اور ان کی تراش خراش بھی فنِ مجسمہ سازی کا ایک روپ ہے۔ اس شعبے میں بھی پُرانے زمانے میں کشمیر کو امتیاز حاصل تھا اور یہ کانسی کی مورتیاں کا ایک الگ سکول تھا۔ کانسی کے کشمیری مجسموں کو مورتیوں کے لطیف فن میں ایک الگ مرتبہ حاصل ہے۔ دوسرے فنی شعبوں کی طرح کشمیر کی کانسی کی مورتیوں کو اپنا ایک مخصُوص مزاج ملا ہے جس کی وجہ سے یہ آسانی سے دوسری ایسی مورتیوں سے الگ کی جا سکتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ کشمیر میں دھاتوں کی مُورتیوں میں کانسی کے مقابلے میں پیتل کا استعمال زیادہ ہوا ہے، اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سارے ملک میں کشمیر ہی وہ واحد جگہ ہے جہاں مورتیاں بنانے میں کانسی کے مقابلے میں پیتل کو پہلے استعمال کیا گیا۔ کشمیر میں ہی کانسی کی اکثر مورتیاں اندر سے کھوکھلی ہیں اور مورتیاں ڈھالنے کے بعد ان پر نقوش کو اُبھارا گیا ہے۔ مورتیوں کو گڑھنے یا بنانے کے بعد جلا دی گئی ہے۔ کشمیر میں ہی کانسی کی مورتیوں کی دوسری خصوصیت مُنبّت کاری ہے۔ ان مورتیوں میں اکثر

آنکھیں چاندی کی اور ہونٹ تانبے کے بنے ہوئے ہیں۔ جسم [illegible] پہراوا
بھی تانبے کی مُنبّت کاری سے اُبھارا گیا ہے جس سے پہراوا زیادہ خوبصورت بنا
ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مُنبّت کاری کا فنکارانہ برتاؤ جس طرح کشمیر میں ہوا ہے
کانسی کے مجسمے بنانے والا اور کوئی سکول ایسی ہُنرمندی سے منبّت کاری کا
ایسا استعمال نہیں کر پایا ہے۔ بقول پرتاپ دتیہ پالؔ یہ بات ناممکن نہیں کہ یہی ہُنر
بعد میں غزنی کے راستے مشرقی ایران پہنچا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پیتل پر منبت
کاری گیارھویں صدی میں ایرانی ٹھٹھیروں کا خاص فن بن گئی۔ کشمیر کے کانسی کے
مجسموں میں دوسری خصوصیت ان کے پہراوے میں 'خاص کر بدّر پیٹھ (मद्र पीठ)
کی طرف کشمیری کنول اور کشمیری زیورات کا برتاؤ ہے۔ کلیولینڈ میوزیم میں آٹھویں صدی
کی سُورج کی ایک کانسی کی مورتی ہے۔ اس مورتی میں سورج کی کمر پر ایک طرح
کی خاص پٹّی باندھ کر دکھایا گیا ہے۔ پہناوے کے طور پر اس مورتی پر کشمیری پھیرن
کی طرح کا ایک لمبا چوغہ ٹخنوں تک بنا ہوا ہے۔ اس چوغے کے نچلے حصّے میں
پہلوؤں کی طرف چھوٹے چاک موجود ہیں۔ میرے خیال میں یہی پہراوا ہمارے
"کشمیری پھیرن" کا پیش رَو ہے۔ اگر اس پہراوے کے چاک سی لئے جائیں تو
یہ کانسی کی مورتی لونگی باندھے ایک کشمیری پنڈتانی لگتی ہے۔ اور اگر لونگی کو ہٹا لیا
جائے تو یہ پہراوا پرانے ڈھنگ کا کشمیری پنڈتوں کا پھیرن دکھائی دیتا ہے۔ اس
طرح کی پوشاک کو سیتھی یا کشن لباس مانا گیا ہے۔ اس طرح "کشمیری پھیرن" کا
قصہ عیسائی سن سے پہلے تک چلا جاتا ہے؎ وہ اس لئے کہ کشمیر کا شمالی حصّہ
کنشک سے پہلے کشن سلطنت کا حصّہ تھا اور اس سے پہلے یوئچی وغیرہ جیسے
علاقے میناندر کے ماتحت تھے۔ دلّی کے نیشنل میوزیم میں چھٹی صدی کی ایک اور کانسی

؎ ماہرین کا خیال ہے کہ کشمیری "پھیرن" یونانی "پیرہن" سے ماخوذ ہے۔ یہی لفظ انگریزی "اپرن" کی بھی بنیاد ہے۔

کی مورتی موجود ہے۔ اس مورتی کا جامہ آج کل کے "کشمیری پھیرن" کے کافی قریب
ہے اور "پھیرن" کا گلا بھی اچھی طرح پہچانا جا سکتا ہے۔ مورتی 'ساگلر' طرز کی
ایک مالا پہنے ہوئے ہے جو آج بھی وہ کشمیری عورتیں پہنتی ہیں جو پرانے ڈھنگ
کا لباس زیبِ تن کرتی ہیں۔ نیویارک کے میٹروپولیٹن میوزیم میں بھگوان بدھ
کی باون (۵۲) سنٹی میٹر اونچی کانسی کی ایک کشمیری مورتی موجود ہے۔ بدھ کی اس مورتی
میں کانوں سے لٹکتا ہوا ایک زیور بنا ہوا ہے۔ زیور کے نیچے ایک گول گول سی چیز
بندھی ہوئی ہے۔ زیور سے لٹکتے دونوں ٹکڑے مجسمہ ساز نے کندھوں کے ساتھ لگے
ہوئے دکھائے ہیں۔ کانسی کی مورتیاں پرکھنے والوں سے اس زیور کی پہچان نہیں
ہو پائی ہے۔ لیکن کشمیری تمدّن سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی شخص یہ کہہ سکتا
ہے کہ یہ زیور "ڈیجہ ہور"؎ ہے جو کشمیری پنڈتانیوں کا مخصوص زیور ہے۔ "ڈیجہ
ہور" کے اوپر پرانی طرز کی کشمیری پنڈتانیوں کی "تالہ رز" اور اس کے اوپر کانوں
سے لٹکتی "چاکی" بنی ہوئی ہے۔ اگرچہ اب اس طرز کی "تالہ رز" اور چاکیاں نظر
نہیں آتیں کیونکہ ان کی جگہ اب ایک طرح کی سونے کی زنجیر نے لے لی ہے،
لیکن اس کے باوجود اس زیور کی نشاندہی مشکل نہیں۔ "ڈیجہ ہور" پہنے مایا دیوی
کی ایک پتھر کی مورتی سری پرتاپ میوزیم میں بھی موجود ہے۔ بودھ دھرم کی رو سے
کانوں کے لمبے زیلی سرے دانائی اور عقلمندی کے نشان ہیں اور اندازاً "ڈیجہ
ہور" بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ بودھ دھرم کی دین ہے۔ ہو سکتا ہے
کہ "مہایان" میں اسے کوئی اور خاص اہمیت حاصل ہو جسے کھوجنے کی ضرورت ہے۔

؎ حال ہی میں بودھ دور کا ایک Terracota میرے ہاتھ لگا ہے۔ کشمیر میں Terracota کی روایت ہاروَن اور اشکر سے شروع ہوتی ہے اور جو Terracota میرے پاس ہے وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس Terracota میں بھی کسی بودھ دیوی کو "ڈیجہ ہور" جیسا زیور پہنے دکھایا گیا ہے۔ (ارجن دیو مجبور)



بیکنٹھ نرائن — کشمیری مجسمہ سازی کا ایک لاثانی نمونہ

عالموں کا یہ خیال کہ اس زیور کا تعلق وسط ایشیا سے ہے' تصدیق طلب معاملہ ہے۔ لیکن کشمیر میں آج تک اس زیور کا رواج ایک قدیم علامت کے مروّج ہونے کی دلیل ہے۔ جس طرح کشمیری پنڈتوں نے بودھ دھرم سے کافی کچھ لیا اسی طرح انہوں نے "ڈیجہور" بھی حاصل کیا۔ "ڈیجہور" کا عورتوں سے مخصوص ہونا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیوں کہ ہندو عقیدے کے مطابق عورت شکتی' سرسوتی' لکشمی' دُرگا اور کالی وغیرہ کا رُوپ مانی جاتی ہے۔ قابلیت اور علم کی علامت ہونے کی وجہ سے ہی ہندوؤں نے خاص کر کشمیری پنڈتوں نے "ڈیجہور" کو خصوصی طور عورتوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔

کشمیر میں بودھ دھرم کی خاص علامتوں کا پھلنا پھولنا اور محفوظ رہنا ایک تاریخی تقاضا بھی تھا۔ اُس وقت کشمیر میں مہایان کو وہی اہمیت حاصل تھی جو "ہین یان" کو متھرا میں حاصل تھی۔ یہ اہمیت کشمیر کو چودھویں صدی تک حاصل رہی کیوں کہ اس دور میں بھی کشمیری بھکشو بودھ دھرم کا پرچار کرنے دُور دراز ملکوں تک پہنچتے تھے۔ "پرجنیا پارمتا" کی ایک اور کانسی کی مورتی نیویارک میں سیموئل ایلن برگ کے مجموعہ نوادرات میں موجود ہے۔ اس مورتی کے کانوں میں بڑی بڑی بالیاں اور باہوں کے کڑے اس کی خصوصیت ہیں۔ یہ دونوں زیور آج بھی کشمیری دیہات میں عورتیں پہنتی ہیں۔

اس طرح کشمیر کے مجسمہ سازوں نے اپنی کاریگری دکھا کر ایک تو اپنا تمدن دوسروں تک پہنچایا ہے اور دوسرے اس فن کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ بھی کر دیا ہے۔

راج ترنگنی میں اُن کئی قدآور کانسی کے مجسموں کا تذکرہ ملتا ہے جو مختلف بادشاہوں' وزیروں' رانیوں اور صاحبِ ثروت لوگوں نے مندروں اور

استھاپنوں میں لگوائے تھے۔ ان میں سے کچھ مجسمے سونے کے، کچھ چاندی کے اور کچھ پیتل کے تھے۔ پریہاس پور اور مارتنڈ مندر میں بھی مہاراجہ للتادتیہ نے مندروں میں سونے کی مورتیاں نصب کی تھیں۔ سرینگر اور پریہاس پور میں بودھ وہاروں میں بھگوان بدھ کے تانبے کے قدآور مجسمے موجود تھے۔ لیکن مخصوص تاریخی حالات کی وجہ سے ان میں سے ایک بھی مجسمہ محفوظ نہیں رہا۔ بھگوان بدھ کے سرینگر کے تانبے کے مجسمے کا ذکر کرتے ہوئے کلہن رقمطراز ہے کہ جب کھیم گپت نے جیندر وہار کو جلا دیا تو بھگوان بدھ کا تانبے کا قدآور مجسمہ مبہوت سا کھڑا سارے شہر کو دیکھ رہا تھا۔ سرینگر میں ہی پاندریٹھن وہار میں متھرا سے لائی گئی بھگوان بدھ کی دھات کی قدآور مورتی تھی جو ترک وزیر چنکن نے راجہ للتادتیہ کو ایک قیمتی ہیرا دے کر خرید لی تھی۔ یہ قدآور دھات کی مورتی کلہن کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ نامساعد حالات کا شکار ہونے کے باوجود آج بھی دنیا کے عجائب گھروں میں کشمیر کے کانسی کے مجسموں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے جن کو دیکھنے سے کشمیر میں کانسی کی مورتیوں کا روشن ماضی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے کہ ہمارے یہاں ایک زمانے میں مورتیاں بنانے کا فن عروج پر تھا اور آس پاس کے ماحول کو روشن کر رہا تھا۔

کشمیر کے جو بھی کانسی کے مجسمے محفوظ رہے ہیں ان میں ہندو دھرم سے متعلق مجسموں کی تعداد اگرچہ اتنی زیادہ نہیں لیکن بودھ مورتیوں کی تعداد کسی حد تک زیادہ ہے۔ جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے مورتی بنانے کے فن کے شعبے میں کشمیر کو بالکل اسی طرح ایک الگ سکول کا درجہ حاصل تھا جس طرح بہار اور بنگال کو حاصل ہے۔ لیکن کشمیریوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے نہ صرف روایت کو برقرار رکھا بلکہ مجسمہ سازی کے فن میں کافی اضافہ کیا۔ چنانچہ اسی انفرادی مزاج کی وجہ

سے کشمیر کی کانسی کی مورتیاں ہر مجموعۂ نوادرات میں فن شناسوں کو آسانی سے ہاتھ آجاتی ہیں۔

دھات کی مورتیوں کے علاوہ کشمیر میں ہاتھی دانت کی مورتیاں بھی بنتی تھیں۔ ساتویں صدی کے کارکوٹ دور کی ہاتھی دانت کی اولوکیشور کی مورتی بمبئی کے پرنس آف ویلز میوزیم میں موجود ہے۔ مورتی میں بالوں کے گھنگھروں کا پیراؤ، زیور اور پوشاک قابل دید ہے۔ مجسمہ ساز نے جس کاریگری سے مورتی کے جسم کو ڈھالا اور سجایا ہے اُسے دیکھ کر تصور کے بھی پسینے چھوٹتے ہیں۔ یہ مورتی کشمیر کی ہاتھی دانت کی مجسمہ سازی کا ایک شاہکار ہے۔

پرنس آف ویلز میوزیم میں محفوظ "وشنو" کی کانسی کی ایک مورتی بھی دیکھنے لائق ہے۔ پچیس سینٹی میٹر اونچی اس کانسی کی مورتی کا تعلق نویں صدی سے ہے۔ گرڑ پر بیٹھے وشنو کی اس مورتی کو بڑی نفاست سے بنایا گیا ہے۔ وشنو گرڑ پر سوار ہے اور چار دیویاں دو اطراف سے اس کے گن گا رہی ہیں۔ یہ دیویاں پتوں پر کھڑی ہیں۔ وشنو کے چار سر ہیں جن میں پہلا آدمی کا، دوسرا شیر کا، تیسرا وراہ کا اور چوتھا اکشس کا ہے۔ اس مورتی کی چار باہیں ہیں۔ اس کے اوپر کے دو ہاتھوں میں گرز اور چکر ہے۔ مورتی کے منڈل کا دایاں حصہ ٹوٹا ہوا ہے۔ مورتی کے نچلے دو ہاتھوں میں کنول اور شنکھ ہیں۔ گرڑ کنول پر کھڑا ہے اور اس کی بھی چار باہیں ہیں جن میں سے دو ہاتھ وشنو کو سہارا دے رہے ہیں جبکہ دوسرے دو ہاتھ امرت کا مٹکا تھامے ہوئے ہیں۔ مورتی کی خاص بات اس کے سجانے میں پتوں کا استعمال ہے جس کی وجہ سے اس کی نزاکت میں اضافہ ہوا ہے۔ مختلف چہروں کی آنکھیں منبت کاری کا نتیجہ ہیں۔ بقول ڈگلس بیرٹ یہ کانسی کا مجسمہ اپنی قسم کا واحد نمونہ ہے۔ اس طرز کی اور دو مورتیاں ویری ناگ سے دریافت ہوئی ہیں اور مجسمہ سازی کے اعتبار سے ان میں

بہت کم تفاوت ہے۔ ذیوتسر کے اوتار چکر میں وشنو کے سر پر "نرسمہا"، "آدمی" "وراہ مکھ" اور اس کے اوپر گھوڑے کا مکھ ہے۔ یہ روپ وشنو کو "ہے گریو" (گھوڑے کی گردن والا) راکشس کو مارنے کے لئے اختیار کرنا پڑا تھا۔

ویکنٹھ نارائن کی مورتی کشمیر میں پہلی بار اونتی پور سے دریافت ہوئی ہے۔ اونتی پور کے کھنڈرات کا تعلق نویں صدی سے ہے اور اسی طرز کی ویکنٹھ نارائن کی دسویں صدی کی مورتیاں جنوب مشرقی راجستھان سے دریافت ہوئی ہیں۔ سبھی محققوں نے مجسمہ سازی کے معاملے میں کشمیر کی اس دین کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ہرمن گویز لکھتے ہیں :-

"تہذیبی طور کافی ترقی کرتے ہوئے کشمیر نے اپنا خاص شیوی اور ویشنوی عقیدہ ہندو مجسمہ سازی سے پروان چڑھایا۔ اس کی دین تین مکھ والا وشنو ہے جس میں شاہی مکھ کے ساتھ نرسمہا اور وراہ مکھ دکھائے گئے ہیں اور سورج کے بھی کئی مکھ اور بازو ہیں۔ اس طرز کی سورج کی مورتی ساسانی پوشاک میں مارتنڈ سے دستیاب ہوئی ہے۔"

نیویارک کی ڈورس وینر گیلری میں "اُش نیش وجے دیوی" کی دسویں صدی کی سترہ سینٹی میٹر اونچی کانسی کی ایک مورتی موجود ہے۔ اس مورتی کی خاص خصوصیت منڈل کی چوڑائی ہے جو کشمیر کے مخصوص فنِ تعمیر کی عکاسی کرتی ہے۔ مورتی کی چوڑائی "چھتراولی" کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ طرز آج بھی کشمیر میں رشی طرزِ تعمیر میں دکھائی دیتا ہے جس میں گمپا اور ستوپا کو ایک کر دیا گیا ہے اور اوپر کی اور "چھتراولی" کو چڑھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیوی بازو بند، چھاتی کا مخصوص ہار اور چوڑیاں پہنے ہوئے ہے۔ یہ سب زیور آج بھی کشمیر میں مروج ہیں۔

پان ایشین مجموعے میں شامل "پرجنہ پارمتا" کی کانسی کی ایک مورتی اس

طرح بنائی گئی ہے کہ اس میں دیوی نے "ڈیشیہ ہنود" طرز کا ایک زیور پہن رکھا ہے۔

کشمیر کے کانسی کے مجسموں پر تفصیل سے تحقیق کا کام کرنا ابھی باقی ہے۔ ان مورتیوں میں سے اکثر اس صدی کی چھٹی دہائی میں اُس وقت ہاتھ آئی ہیں، جب تبت میں سیاسی تبدیلی وجود میں آئی۔ ان مورتیوں میں سے اکثر غیر ملکی عجائب گھروں اور کئی ذاتی مجموعوں کا حصہ بن گئیں۔ اس سے قبل کچھ مورتیاں اس وقت دریافت ہوئیں جب ۱۹۴۸ء میں مہاراجہ کشمیر تخت سے دستبردار ہوا۔ اس وقت تک سمجھا جاتا تھا کہ کشمیر کے کانسی کے مجسموں میں سے آٹے میں نمک کے برابر حصہ بچ پایا ہے۔ کشمیر کے کانسی کے مجسمے کس طرح تبت پہنچے اس سلسلے میں یہ بات واضح ہے کہ کشمیر میں سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے کشمیری بھکشو گھر چھوڑ کر بھاگ گئے اور اُن علاقوں کی طرف چلے گئے جہاں بودھ مذہب کو برتری حاصل تھی اور اسی کے ساتھ یہ کانسی کی مورتیاں بھی عبادت کے لئے وہاں پہنچائی گئیں۔ چنانچہ آٹھویں اور نویں صدی کی کانسی کی کئی خوبصورت مورتیاں، جن میں گوتم بدھ کی مورتیاں اور ستوپ بھی شامل ہیں، آج بھی لداخ کی بودھ خانقاہوں میں موجود ہیں۔ سیڑھیوں والی یا تہہ دار چھتیں خاص طور سے کشمیری فنِ تعمیر کو نمایاں اور ظاہر کرتی ہیں۔ چنانچہ خدوخال کے لحاظ سے بھی یہ مورتیاں کشمیر کی ہی دکھائی دیتی ہیں۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اپنے عروج کے دور میں کشمیری مجسمہ سازوں نے اپنے اردگرد اُس سارے خطّے کو جس میں سوات، لداخ، تبت اور دیگر علاقے شامل ہیں، اتنا متاثر کیا کہ کشمیری فن نے ان علاقوں میں بھی اپنی جگہ بنا لی۔ چنانچہ ان جگہوں سے کانسی کی جو مورتیاں دریافت ہوئی ہیں وہ خالص کشمیری طرز کی لگتی ہیں۔ مشہور فن شناس شوراما مورتی وضاحت کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:۔

"چمبہ کے بارمور اور چھتراہی گاؤں میں "جومہیش مردنی" بیٹھے ہوئے نرسمہا، کماری اور ایسی کانسی کی جو مورتیاں ملی ہیں اُن کا مکھ لمبا مگر صورت دلکش ہے۔ یہ مورتیاں اٹھارہویں صدی کی کشمیری مجسمہ سازی کی نشان دہی کرتی ہیں"۔

شورا ما مورتی کا یہ بیان اس بات کو واضح کرتا ہے کہ کانسی کے مجسمے بنانے کا کشمیری سکول ہماچل پردیش میں زمانۂ حال تک کی روایت رہ چکا ہے۔

کانسی کی کشمیری مورتیاں جن عجائب گھروں کو زینت عطا کرتی ہیں اُن میں پان ایشین مجموعہ، سپنک اینڈ سنس لنڈن، برلن میوزیم، لاس اینجلز کنٹری میوزیم آف آرٹ، شری پرتاپ میوزیم سرینگر، نیشنل میوزیم دہلی، پرنس آف ویلز میوزیم بمبئی، ٹارنٹو یونیورسٹی، الکنس میوزیم کنساس، کلیولینڈ میوزیم، نارٹن سائمن کے جمع کردہ نوادرات، رچ مونڈ میوزیم آف فائن آرٹس، تبت ہاؤس نئی دہلی، سٹیل آرٹ میوزیم، میٹرو پالیٹن میوزیم نیویارک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مختلف تہذیبوں کا سنگم ہونے کی وجہ سے دوسری چیزوں کی طرح کشمیر کے کانسی کے مجسموں پر قریبی ممالک کا اثر عیاں ہے۔ لیکن اس اثر نے اس فن کو داغدار نہیں کیا ہے بلکہ اس میں ہر طرح سے اضافہ ہی کیا ہے میرا ذاتی خیال ہے کہ جو فنکاری کشمیری کاریگروں نے پتھر اور دھاتوں میں دکھائی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے قبل یہ کاریگری لکڑی کی تعمیرات میں بھی دکھائی گئی ہوگی۔ اس کے بعد اسی پرانی روایت نے نئے نئے رنگ اختیار کئے اور کشمیر کی شہرۂ عالم دستکاریاں وجود میں آئیں۔ اس بات کو سمجھنا بھی مناسب ہے کہ مجسمہ سازی اور فن تعمیر کے ساتھ ساتھ ہماری دستکاریاں بھی زمانۂ قدیم سے ہی وجود میں آئی ہوں گی۔ چنانچہ وٹیلے اپنی "چیمبرز ان شو" نام کی کتاب میں تحریر کرتے ہیں کہ کشمیر پھولوں کا ملک ہے اور یہ دستکاریوں اور ایمبرائیڈری کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس حقیقت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے یہ دعویٰ باور کرنے کے لائق نہیں لگتا کہ کشمیر کی دستکاریوں کا منبع وسط ایشیا ہے اور وہ بھی چودھویں صدی کا ---!

• --- (کشمیری سے ترجمہ)

مترجم: ارجن دیو مجبور

شیرازہ میں چھپنے والی نگارشات

- --- ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔
- --- ہندوستانی تاریخ و تمدن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری و تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔
- --- ریاست کے تمدن اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔
- --- فن تعمیر، آرٹ اور مصوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنیوالی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔
- --- منظومات، بشرطیکہ معیاری ہوں، قبول کی جاتی ہیں۔

مولوی محمد ابراہیم

بُرزپشَ

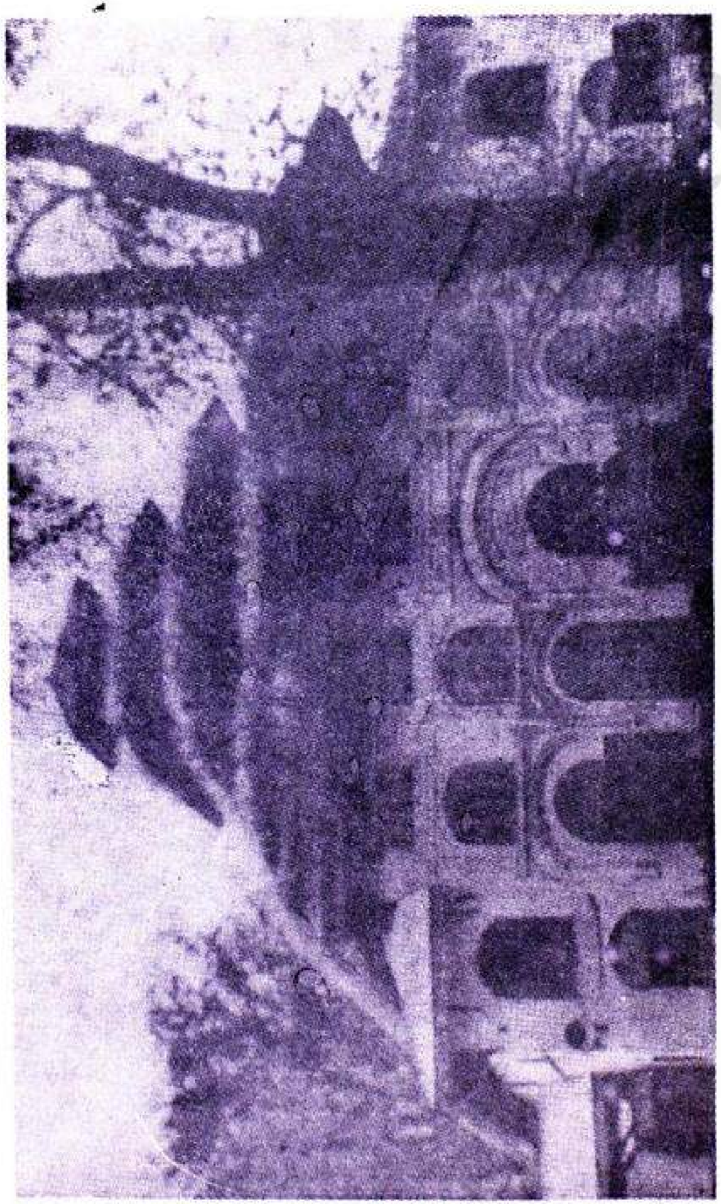
آج سے بیس پچیس برس اُدھر بُرزہ پش (بھوج پتر کی چھت) کشمیری مکانات کا ایک عام دستور رہا ہے۔ بُرزہ پش غریبوں سے زیادہ امیروں اور متوسط طبقہ کے لوگوں کے مکانات کی بالائی چھتیں تھیں۔ جبکہ غریب اور مفلوک الحال لوگ بارش و برف سے اپنے مکانات کا بچاؤ یا تو گھاس پھوس یعنی چھپر کی یا پھر سیدھی سادی تعمیری لکڑی کے تختوں کی چھتوں میں سمجھتے تھے۔ بُرزہ پش دو لفظوں کا مرکب ہے۔ "برزہ" بزبان کشمیری بھوج پتر اور "پش" بمعنی سقف و بام ہے۔ آسان اور بامحاورہ اردو میں اس کا ترجمہ "بھوج پتر" کی چھت ہے جو آج سے کم و بیش پچیس ۲۵ سال اُدھر کشمیری مکانات کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔

آپ نے اس وقت تک ٹین کی چھت، شنگلی کی چھت، گنبدنما ڈاٹ کی چھت، سیمنٹ اور بجری کے سلیب کی چھت کھپریل اور گھاس پھوس (چھپرا) کی چھت کے بارے میں سنا ہوگا۔ مگر برزہ پش فی الحقیقت ایک عجیب و غریب چھت ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بُرزہ پش غیر اہل کشمیر کے لئے فی الواقع ایک اجنبی

شے ہے جبکہ اہل کشمیر کے لئے یہ چھت کافی سے زیادہ مقبول اور شناسا تھی۔ گو کہ آج خود اہل کشمیر کے لئے ٹین اور دیگر اشیا کی ایجاد کے باعث غیر اہل کشمیر کی طرح بُرزہ پش ایک اجنبی سی شئے ہوتی جارہی ہے۔

بُرزہ جسے فارسی میں توز اور اردو میں بھوج پتر کہتے ہیں قدیم زمانے میں کشمیر میں بطور کاغذ کے استعمال کیا جاتا تھا جس پر دانایان کشمیر حساب و کتاب کے علاوہ دینی و ثقافتی کتابیں تحریر کیا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے بھوج پتر کشمیر میں شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانے تک رائج تھا۔ حکومت جموں و کشمیر کے محکمہ تحقیق و اشاعت سرینگر، کشمیر کی قلمی لائبریری میں بھوج پتر پر تحریر سنسکرت زبان کے متعدد نسخے بھی محفوظ ہیں۔

بُرزہ جو دراصل پیاز کی طرح تہہ بہ تہہ جڑی ہوئی درخت کی ایک چھال ہے کشمیر کے گھنے جنگلوں میں بافراط پایا جاتا ہے۔ اسے کشمیر کے دور و دراز کے جنگلات سے گھوڑوں پر لاد کر شہر سری نگر میں لایا جاتا تھا۔ قدیم زمانے میں جامع مسجد سری نگر کے نزدیک، جو ہمیشہ سے شہر کا دل اور مرکز رہا ہے، بُرزوں کی منڈی تھی۔ جامع مسجد سری نگر کے علاوہ یہ منڈی نوا کدل سری نگر کے قریب بھی تھی۔ چنانچہ جو اشخاص برزہ فروشی کا کام کیا کرتے تھے اہل کشمیر کی اصطلاح میں اسی پیشہ کی مناسبت سے بُرزہ کہلاتے تھے۔ چنانچہ آج بھی بعض خاندان بُرزہ کے کاروبار کے باعث برزہ کہلاتے ہیں۔ آج سے بیس پچیس سال قبل عمہ برزہ نامی ایک حجام، جو برزوں کا کاروبار کیا کرتا تھا اور راجویری کدل سری نگر میں سکونت پذیر تھا، اسی نام سے موسوم تھا۔ نوا کدل سری نگر میں بھی بُرزہ خاندان کے افراد موجود ہیں۔ کشمیر میں جو مقامات برزوں کی پیداوار کے لئے مشہور ہیں اُن میں بُرزہ بال اور تاریخی مقام برزہ ہوم ہے۔ علاوہ ازیں سونہ مرگ کے جنگلات میں بھی بھوج پتر کے درخت



آثار شریف حضرتبل کی قدیم عمارت کی چھت بھی بھوجپتر کی بنی تھی

بافراط دستیاب ہیں۔ برزوں پر لکھی جانے والی تحریر نہایت روشن اور چمکدار ہوتی ہے۔

بہرکیف بُرزہ یا بھوج پتر کشمیر میں علاوہ کاغذ کا نعم البدل ہونے کے کشمیر کے مکانات کی بالائی چھتوں پر بطور فرش کے بھی استعمال ہوتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ مکانات کی لکڑی کی کڑیوں پر لکڑی کے تختے معمولی سی اٹھان کے ساتھ کیلوں سے جڑ دئے جاتے ہیں۔ بعد ازاں بُرزے، جو متعدد تہوں کا مجموعہ ہوتے تھے، تمام چھت پر فرش کر دئے جاتے۔ پھر گارا ڈال دیا جاتا۔ اس کے بعد کمہاروں کے آوے سے نکلی ہوئی راکھ گارے پر بکھیر دی جاتی اور اس عمل کے بعد سب سے آخر میں اتنی مٹی ڈال دی جاتی کہ چھت زیادہ بوجھل نہ ہو جائے اور سہارا دینے والی کڑیاں اسے برداشت کر سکیں۔ موسم سرما میں "بُرزہ پش" انتہائی خنک اور آرام دہ ہوتی تھی۔ چھت کے دبیز اور موٹی ہونے کے باعث جون جولائی اور اگست کی گرمیاں اہل خانہ پر مطلق اثر انداز نہ ہوتی تھیں۔ نیز یہ کہ خود مٹی کا مزاج بھی سرد ہے اس لئے بھی برزہ پش (چھتیں) عام طور پر سرد رہتی تھیں۔ چونکہ بُرزہ پش کا بالائی حصہ نمناک اور تر مٹی کا ہوتا تھا اس لئے موسم گرما کی بارشیں اس پر طرح طرح کے گل کھلاتی تھیں۔ ان میں گُل لالہ، زیرہ، سونچل، واندہ ہاک، لبولہ اور موسم گرما کے دیگر پودے اور گھاس پھوس بکثرت اُگتے تھے اور اس طرح گھر بیٹھے چمن کا نظارہ ہو جاتا تھا۔ اس امر کا تذکرہ جہانگیر بادشاہ نے تزکِ جہانگیری میں، جہاں وہ یہاں کے مکانات کا ذکر کرتا ہے، خاص طور پر اس طرح کیا ہے:

"عام طور پر کشمیر کے مکانات تین یا چار آشیانہ (طبقات) ہیں۔ ان کی چھتیں موسم گرما میں قدرتی پھولوں اور نباتات کے ذریعہ ایک عجیب سماں پیدا کرتی ہیں"۔

شاہ جہاں کے عہد کا ملک الشعرا طالب کلیم اپنی مثنوی "تعریف کشمیر" میں غالباً اسی

امر کی جانب اشارہ کرتا ہے:

دگر بخت از دریاری درآمد — بشہرستان عیشم رہبر آمد
چہ گویم بعد ازیں تعریف و آئین — کہ شہری را زیک گل کردہ رنگین
کسے کشمیر را بستان نہ گوید — بغیر از روضۂ رضوان نہ گوید
جہانِ دلکشائے کشور فیض — کہ ہر روزن درو باشد در فیض
عمارتش ہمہ از چوب از آنست — کہ خاکش ہمچو آب رو گرانست
دریں کشور عزیز است آنچناں خاک — کہ می آرند از ہندوستان خاک
ز جوش سبزہ در ایں عالم پاک — نیارد ریخت کاتب بر قسم خاک
بود زیں گونہ در آفاق کم شہر — کہ ہم باغست وہم دریا وہم شہر
زخانہ تا بہ کشتی پا نہادی — میانِ سبزہ و گل اوفتادی

[دوبارہ قسمت یاور ہوکر مجھے شہرستان عیش میں لے آئی۔ اس کے بعد کیا تعریف کروں ۔یوں سمجھ لو تمام شہر ایک پھول سے رنگین کردیا گیا ہے۔ کشمیر کو معمولی چمن نہیں بلکہ روضۂ رضوان (جنّت) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک دلکش جہاں اور کشور فیض ہے' اس کا ہر روزن دروازۂ فیض ہے۔ یہاں کی عمارات لکڑی کی ہیں' اس لئے مٹی آبرو کی طرح یہاں مہنگی ہے۔ جوشِ سبزہ کے باعث کاتب اپنے لکھے ہوئے پر مٹی نہیں چھڑک سکتا۔ دنیا میں ایسا شہر بہت کم ہے کہ باغ بھی ہو' دریا بھی اور شہر بھی۔ گھر سے کشتی تک سبزہ و گل ہی قدم پڑے گا۔]

مؤرخ حسن (تاریخ حسن۔ جلد اوّل' صفحہ ۲۸۲) کشمیر کے مکانات کی تاریخ میں رقمطراز ہیں:

"درسالف زمان ساکنانِ این گلستان خانہ ہائے دو آشیانہ و سہ آشیانہ و پنج آشیانہ از چوبہا تراشیدہ بہ کمال متانت تعمیر کردند اما

درواقعاتِ آتش تباہ می شدند۔ آنگاہ خانۂ دو طبقی ہمگی از سنگ و خشت برافراشتند و بحادثۂ زلزلہ ویران گشتند۔ لہٰذا بہ تدبیر میرزا حیدر کاشغری خانہا ئے سہ آشیانہ و چہار آشیانہ دار مرکب از چوب و سنگ و خشت برافراشتند تاکہ از آسیب زلزلہ و آتش کم ضرر می دیدند' ازاں باز ہماں مروّج است۔ و طاق ہائے غرفہ و پنجرہ و بنائے حمام و فرشِ بوریا از مخترعاتِ میرزا حیدر است۔ و بام خانہا ئے این جا دو طرف سلامی داری باشند۔ و در میانِ شہر بام خانہا اوّل تختہ نشایندہ بالائے آن تو ز فرش گسترہ خاک می ریزند۔ و در اطراف دیہات خانہ ہائے دو طبقی و سہ طبقی از خشت خام اکثر تعمیر می سازند کہ در طبقۂ سفلی چہارپا و در طبقۂ اوسط بود و باش خود و در طبقۂ بالا اسباب زمستانی و اثاث می گذارند و بام ہا را خس پوش می سازند۔"

[زمانۂ گذشتہ میں اس چمن کے باشندے دو' تین اور پانچ طبقے مکانات تراشیدہ لکڑی سے تعمیر کیا کرتے تھے جو نہایت ہی مضبوط اور سنگین ہوا کرتے تھے' تاہم آگ سے تباہ ہوجاتے تھے بعدازاں اینٹ اور پتھر سے دو طبقہ مکانات تعمیر کرنے لگے' مگر یہ بھی زلزلوں سے تباہ و برباد ہوجاتے تھے۔ بعد ازاں میرزا حیدر کاشغری کے مشورہ سے تین اور چار منزلہ مکانات لکڑی' پتھر اور اینٹ سے بنانے لگے۔ اس سے زلزلہ اور آگ کا خطرہ کم ہوگیا۔ تب سے یہی طریقہ رائج ہے۔ بالاخانے کے طاق' پنجرے' حمام اور فرشِ بوریا (کشمیری وگو) اسی میرزا حیدر کی مخترعات سے ہے۔ یہاں کے مکانات کی چھتیں دونوں طرف سے سلامی دار (اٹھی ہوئی) ہوتی ہیں۔ شہر (سرینگر) میں گھروں کی چھتوں پر پہلے تختے بچھاتے ہیں اور پھر اُن پر بھوج پتر پھیلا کر مٹی ڈال دیتے ہیں۔ مگر دیہات میں کچی اینٹوں سے دو یا تین منزلہ مکان تعمیر کرتے ہیں۔ نچلے

طبقہ میں مال مویشی، بیچ کے طبقہ میں بود و باش اور اوپر کی منزل میں جاڑوں کا سامان اور اسباب خانہ ہوتا ہے۔ چھتوں کو گھاس پھونس یعنی چھپر سے ڈھانپ دیتے ہیں]۔

شہر سری نگر میں آج سے دس پندرہ برس پہلے، بالخصوص حضرت بل کے علاقے میں چھپر (یعنی چھپی) کے مکانات بکثرت تھے اور بُرزہ پُش کے مکانات کا رواج بھی اسی مدت تک تھا۔ اب ان کی جگہ ٹین اور سیمنٹ کی سلیبوں نے لے لی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں مؤخر الذکر پنجاب وغیرہ کے اثر سے ہے۔

بُرزوں یا بھوج پتر کی چھتیں بہت کم لاگت چاہتی تھیں، ساتھ ہی ساتھ بہت جلد تعمیر ہو جاتی تھیں۔ صرف تختے بچھانے اور ان پر بُرزے پھیلانے کی دیر ہوتی کہ یہ چھت بن کر فی الفور تیار ہو جاتی تھی۔ "بُرزہ پُش" سے مکان کی ہر منزل آرام دہ اور ٹھنڈی رہتی تھی۔ اس پر مرمت اور دیگر ضروریات کے وقت بآسانی چڑھا جا سکتا تھا کیوں کہ چھت کے ایک جانب سلامی (بلندی) کی جگہ پر ایک ڈھکنے دار روشن دان یا دروازہ "وو گہ" پہلے ہی سے بنا دیا جاتا تھا تاکہ گھاس پھوس کی کثرت یا فالتو برفباری کو بیلچوں کے ذریعہ چھت سے نیچے گرایا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے موسم سرما میں بیلچہ دار گلی کوچوں میں بلند آواز سے مزدوری پر برف گرانے کے گشت لگایا کرتے تھے۔ مگر اب ایسی قسم کی آوازیں صرف تاریخ کا ایک جزو بن کر رہ گئیں ہیں۔ اس میں بہت حد تک عوام کی خوشحالی کو بھی دخل ہے۔

بُرزو کی چھت مکان کی چار دیواری اور کھڑکیوں کے نصب ہو جانے کے بعد ایک یا دو روز میں بن کر تیار ہو جاتی تھی۔ یہ لکڑی کی سنگلی کی چھتوں سے زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتی تھی کیوں کہ سنگلی آفتاب کی تمازت اور برف و باراں کی کثرت کے باعث زیادہ سے زیادہ پندرہ برس تک ٹھیک رہتی تھی۔ بعد ازاں نئی سنگلی کا انتظام کیا جاتا تھا لیکن بُرزہ پُش دیکھ ریکھ سے تقریباً سو دو سو برس

تک اچھی اور عمدہ حالت میں رہتی تھی۔ برف و بارش سے چھت کی مٹی چونکہ گرتی اور سرکتی رہتی تھی اس لئے ہر دو یا تین سال بعد موسم گرما میں اس پر جدید مٹی ڈالی جاتی تھی تاکہ غائب شدہ مٹی کا نعم البدل ہو سکے۔ بُرزہ پُش کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اگر تمام چھت کی از سر نو مرمت کی جاتی تو مٹی کے نیچے کے تمام بُرزے ماسوائے بہت تھوڑوں کے صحیح اور درست حالت میں ہوتے تھے اور انہیں دوبارہ اُسی چھت پر نئی مٹی کے ساتھ بچھا دیا جاتا تھا۔ بُرزوں کے پھیلانے میں چونکہ میخوں کی ضرورت نہ تھی اس لئے بُرزہ پُش زیادہ سلامی دار نہیں ہوتی تھی، ورنہ چھت سے بُرزوں کے سرکنے کا احتمال تھا۔ بالفاظ دیگر بُرزہ پُش مائل بہ ہمواری ہوتی تھی کیوں کہ اسی صورت میں چھت پہ بُرزوں کا مضبوطی سے ٹھہرنا ممکن تھا۔

بُرزہ پُش اگر ایک طرف مالی اور جلد تعمیر ہونے کے اعتبار سے ایک مفید شئے تھی تاہم اس کے کچھ نقصانات بھی تھے۔ مثلاً یہ کہ بھوج پتر کی چھت کو بالعموم چوہا لگنے کا احتمال رہتا تھا جس کے باعث چھت میں جگہ جگہ سوراخ ہو جاتے تھے اور بعض وقت بارش چو چو کر مکان کے اندر آ جاتی تھی جس سے مکان اور مکین دونوں نقصان اٹھاتے تھے۔ دوسرے موسم سرما میں شدید برفباری کے باعث کثرتِ بوجھ کے باعث احتمال رہتا کہ کہیں چھت بیٹھ نہ جائے۔ بعض اوقات اس موقعہ پر مال مویشی اور افراد خانہ دب کر ہلاک ہو جاتے تھے کیوں کہ اس وقت دو بوجھ ہو جاتے، ایک چھت کی مٹی کا اور دوسرے برف کا۔ تیسرے یہ کہ بُرزہ پُش شکل و صورت میں چونکہ خام مٹی کی زمین تھی اس لئے نفاست پسند طبائع کے نزدیک اس قسم کی چھت ایک بھونڈی شکل سے زیادہ نہ تھی اور اس کی عدم پختگی دل میں ہمیشہ باعثِ اضطراب رہتی۔ گو کہ یہ اور بات ہے کہ اپنی خوش حالی اور

رواج کے دوران بُرزہ چھت مکانات کے غلاف کا بہترین اور قابل انحصار وسیلہ تھی۔

زمانہ پہیئے کی طرح ہر وقت گردش اور چکر میں ہے۔ جو چیز کل تک قابل اعتبار تھی آج بے اعتبار ہے۔ یہی کیفیت بُرزہ پُش کے ساتھ بھی پیش آئی۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کے بڑھتے ہوئے تمدّن نے جہاں کشمیری رسم و رواج کی بہت سی پسندیدہ اور مرغوب رسموں کو بدل ڈالا ہے وہی معاملہ برزہ پُش کے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔ برزہ پُش کے زوال کا سب سے بڑا سبب تیزی سے کشمیر میں جدید فنِ تعمیر کا رواج ہے جو ظاہر ہے کہ ہندوستان کے وسیع و عریض علاقوں سے آیا ہے۔ اس کی بدولت اب کشمیر میں ڈاٹ دار یا سلیب والی چھتیں بالعموم استعمال ہونے لگی ہیں۔ کشمیر میں حد سے زیادہ ٹین کی درآمد بھی بُرزہ پُش کے زوال کا باعث ہوئی۔ کیوں کہ چھتوں پر ٹین کے استعمال سے لوگوں نے خود کو حد سے زیادہ بے فکر محسوس کیا ہے۔ ساتھ ہی نفاست اور ٹین کا ہلکا پن' اور برفباری کے موقع پر برف کا خود بخود زمین پر ایک شور کے ساتھ آجانا سونے پہ سہاگہ ثابت ہوا۔ لوگ ٹین کی چھتوں کے باعث چوہوں کی تباہی' بار بار چھتوں پر مٹی ڈالنے' گھاس پھوس اُکھیڑنے اور اسی قسم کے متعدد بکھیڑوں سے بھی آزاد ہو گئے۔ نیز یہ کہ ٹین کی چھتیں پائیداری اور مضبوطی میں سنگلی اور بھوج پتروں کی چھتوں سے بدرجہا بہتر تھیں۔ ان کے علاوہ لوگوں کی اقتصادی و معاشی خوشحالی نے بھی بُرزہ پُش کے زوال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

کشمیر میں (چھوٹی جگہ ہونے کے باعث) ہر رواج جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا ہے۔ یہاں کے چند لوگوں نے پہلی بار چھتوں کے لئے ٹین استعمال کیا تو بقیہ لوگ بڑی تیزی کے ساتھ اس تبدیلی کی جانب مائل ہو گئے اور انہوں نے بھی

اپنی تعمیرات ٹینوں کے حوالے کر دیں۔ کشمیر کے آستانوں میں سب سے آخری برزہ پُش آستان حضرت بل کی تھی جس کو ۱۹۶۹ء میں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے موجودہ ڈاٹ کی چھت یعنی گنبد میں تبدیل کر دیا۔ بُرزہ پُش دراصل مٹی کی چھت تھی مگر چونکہ اس کا سہارا بھوج پتر تھا اس لئے تمام چھت اسی کے نام سے بُرزہ پُش کہلانے لگی جس طرح بعض وقت جُز سے کُل شہرت پاجاتا ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بُرزہ پُش کے حق میں زمانہ کب پلٹا کھاتا ہے؟ غالباً کبھی نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

زیارت حضرت بل کی تعمیر جدید کے بعد ریاستی محکمہ آثار قدیمہ نے زین العابدین (بڈشاہ) کے عہد میں بنی سید محمد مدنی کی مسجد کی بُرزہ پُش کی مرمت کی۔ چھت کی ظاہری صورت میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ البتہ ٹین پوشی کے بعد اس پر تختے بچھا کر اس پر دوبارہ بھوج پتر بچھائے گئے اور اس کے اوپر دوبارہ مٹی ڈالی گئی اور اس طرح اس قدیم مسجد کی نئی چھت دیکھنے والوں کو بالکل اپنی اصلی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح سے کسی تاریخی عمارت پر موجود یہ واحد بُرزہ پُش ہے ــــ (ادارہ)

بشیر اختر

پنجرہ کاری

کشمیری زبان کا ایک مشہور شعر ہے سہ

زالی پنجرہ منزی نظر تراو
بالی اسہ نے تنبہ لاو

(پنجرہ کاری یہ پچوں کے روزنوں سے ذرا جھانک ــ میرے محبوب! میرا دل مچلنے لگتا ہے ہمیں اپنا روئے روشن دکھا)

یہ شعر میں اپنے بچپن میں اُٹھتے بیٹھتے ہمیشہ ہر گلی کے موڑ سے گزرتے ہوئے گنگنایا کرتا تھا۔ جالی دار پنجروں کو چیرتی ہوئی محبوب کی شوخ نظروں کے تیر سہتے ہوئے آرزومندی کیا ہوتی ہے' اس کا مجھے تجربہ تھا نہ احساس۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ میرے گھر کی تیسری منزل پر ایک لمبا دالان تھا جس کے چاروں اطراف میں جالی دار پنجرے والی کھڑکیاں تھیں جن میں سے ہر صبح طلوع آفتاب کے وقت سورج کی کرنیں چھنکر آتیں جیسے آبشاروں میں سے پانی رستا ہے۔ پنجروں میں سے چھنتی ہوئی دھوپ کی لکیریں ننگی زمین پر نقش ونگار سجاتیں اور پھر انکو بدل

دیتیں تکون' مربع' سہ گوشہ' دُمدار تاروں جیسی شبیہہ اور روپہلی مالائیں ـ طلوع آفتاب سے دن ڈھلنے تک دھوپ کے یہ دھبّے سینکڑوں نقوش بناتے۔ آج یہ جالی دار پنجرہ کاری کی کھڑکیاں ہیں نہ وہ دالان۔ زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ فن تعمیر کا معیار بدل چکا ہے۔ جس جگہ پرانے زمانے میں ٹھاور تعمیر ہوتے تھے ان کی جگہ اسٹار طرز کی چھتوں نے لی رکھی ہے۔ دروازوں کے چوکھٹوں میں جہاں منقش لکڑی استعمال ہوتی تھی اور برآمدوں اور طاقوں اور دیواروں پر جہاں گذشتہ زمانہ میں گولائی والے کھرپے سے پھول پتے اُبھارے جاتے تھے اب وہاں ڈسٹمپر کا استعمال ہوتا ہے۔

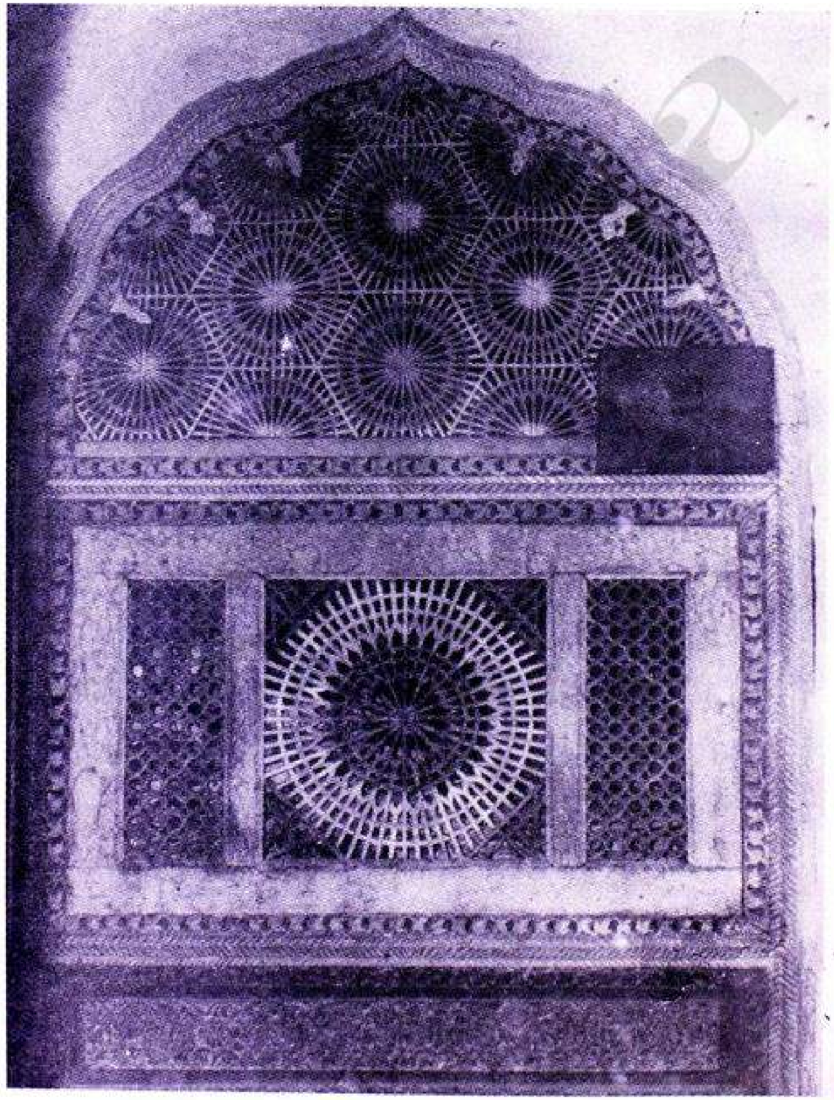
اسلام کشمیر میں چودھویں صدی کے آغاز میں وارد ہوا ـ یہ مذہب کشمیر تک پہنچنے سے قبل یورپ' افریقہ اور وسط ایشیا کے دور دراز علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ علاوہ مذہبی انقلاب کے مسلمانوں نے ان تمام ملکوں کے فن تعمیر پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ چنانچہ ایران' ترکی' منگولیا اور مراکش جیسے دور دراز ممالک کے فن تعمیر میں عربی خطاطی' نقاشی اور گُل کاری کا بڑا چلن تھا۔ اسلامی فن تعمیر میں باقی قوموں کے فن تعمیر کے مقابلے میں بڑا فرق یہ تھا کہ مسلمان بُت گری اور بُت تراشی کے زبردست مخالف تھے۔ اس کے مقابلے میں یونانی اور بازنطینی کاری گر براکٹوں Eves چھت کے اوپر لگی ہوئی تختیوں کی جگہوں پر مختلف جانوروں کی شبیہہ منقش کرتے تھے۔ چشموں کے نیچے شیروں کے دھڑ بناتے تھے اور ان ہی میں سے پانی کے جھرنو کے خارج کرتے۔ اس طرح سے ہندوستانی فن تعمیر کی نمایاں خصوصیت دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں ہیں جو آج بھی اجنتا' ایلورا' کونارک اور سانچی جیسے ستوپوں اور مناروں کے اندر نظر آتی ہیں۔

مسلمانوں نے بُت شکنی کی اور فن تعمیر میں خطاطی اور مینا کاری کے توسط سے

اپنے جمالیاتی ذوق کی آسودگی کرلی۔ انہوں نے اس فن کو پتھروں پر اسی مہارت سے برتا جیسے کسی کاغذ کے ورق پر برتا ہو۔ باقی قوموں کے مقابلے میں انہوں نے اپنے اعتقادات، اساطیر اور تہذیبی قدروں کو تجریدی صورت دی۔ انہوں نے ابہام کو بروئے کار لایا اور فطرت کے مناظر کو ذریعہ اظہار بنایا۔ چاند، سورج، تارے، پھول، انگور کی بیل کو اپنے فن کا MOTIF بنالیا اور یہی تصویریں مختلف جہتوں اور مختلف نقوش میں پیش کرکے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

دین دار ہونے کے ساتھ ساتھ عرب بڑے ریاضی داں بھی تھے۔ انہوں نے اقلیدس کو اپنا سب سے عظیم ذریعۂ اظہار بنایا اور دائروں، مربعوں، ہشت کونوں اور لکیروں کے ذریعے فنِ تعمیر اور خطاطی جیسے نازک فنوں کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اسلام پردہ داری کا قائل ہے۔ گھروں اور دعوتی محفلوں کے لئے ایک علیحدہ زنان خانہ بنانے کا رواج تھا۔ ملکائیں اور اُن کی سہیلیاں پردوں کی آڑ میں رہ کر دربار کی کاروائیاں دیکھا کرتی تھیں۔ شاید پردہ داری کی یہی ضرورت دیوان خانوں کے اندر چلمن لگانے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اسی سے پنجرہ کاری کے رواج کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ پنجرکاری کا آغاز کشمیر میں مسلمان کاری گروں کے ورود کے بعد ہوتا ہے۔ تواریخی حوالوں کو زیرِ نظر رکھ کر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کشمیر میں "زامنہ ڈب" پہلی عمارت ہے جس میں پنجرہ دار کھڑکیاں استعمال ہوئیں۔ "زامنہ ڈب" دُنیا کا سب سے پُرانا SKY SCRAPER (فلک بوس عمارت) ہے۔ مرزا حیدر دوغلات کے مطابق یہ عمارت بارہ منزلہ تھی اور ہر منزل میں پچاس کمرے تھے جن میں دالان اور پنجرہ دار کھڑکیاں تھیں۔ یہ ساری کی ساری چوبی عمارت تھی۔ چیکوں کے عہدِ حکومت



پنجرہ کاری ـــ ایک قدیم نمونہ

میں اس عمارت کو نذرِ آتش کیا گیا۔ اس سبب سے اس عمارت کا کوئی نقش باقی نہ رہا۔ زین العابدین کے عہد میں سید محمد مدنی صاحب کی مسجد تعمیر ہوئی۔ جس کے ہر چہار اطراف میں دیواروں پر روغنی ٹائلیں لگائی گئی تھیں۔ اس کے چند طاقوں کے اندر اب بھی کہیں کہیں پتھروں کے اندر کندہ ہوئی جالیاں موجود ہیں جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پنجرکاری کا آغاز بڈشاہی عہد سے قبل ہوا ہوگا۔ اگرچہ اس میں اس درجہ نفاست نہیں ہوا کرتی تھی۔

زین العابدین پندرھویں صدی کے ساتویں دہے تک کشمیر کا حکمران تھا۔ اس نے ایران، ترکستان، روم اور ہندوستان کے مختلف بادشاہوں کے ساتھ ذاتی تعلقات استوار کر لئے تھے۔ ان تعلقات کے باعث مختلف ممالک کے اہلِ علم اور اہلِ فن کشمیر آتے تھے اور کشمیری کاری گروں کو ان ممالک کے دوروں پر جانے کے مواقع میسر ہوتے تھے۔ چنانچہ اس دور کی خطاطی، مرصع کاری اور فنِ تعمیر کے بہت سے نمونے آج بھی ہمارے زیرِ نظر ہیں جالی دار پنجرے اس دور میں پتھروں پر بنائے جاتے تھے اور سنگتراشوں کے ذریعہ مختلف قسموں کی سِلوں پر بیل بوٹے کندہ کئے جاتے تھے۔ مگر اس کے باوصف دورِ سلاطین سے قبل یہ فن ابھی گھٹنوں کے بل چل رہا تھا اور پنجرکاری کے فن میں اہلِ کشمیر نے وہ مہارت حاصل نہیں کی تھی جس نے مسجد قرطبہ، مسجد استنبول یا دمشق کی زیارت گاہوں کو اس عہد سے دو سو سال قبل سجا رکھا تھا۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں اس فن نے عروج پایا۔ پتھروں کے علاوہ چوبی کاریگری میں پنجرکاری انتہائی دلآویز ڈیزائنوں اور اقلیدس کے مختلف نقوش کے ساتھ استعمال ہونے لگی۔ پتھروں پر پنجرکاری کا سب سے خوب صورت اور دلآویز نمونہ سرینگر کے ٹھگ بابہ صاحب کے آستانہ پر نظر آتا ہے۔ اس زیارت کی کھڑکیوں اور طاقوں پر سنگِ آہک لگا ہوا ہے۔ جس پر انگور کی بیل کی انتہائی خوب صورت جالیاں موجود ہیں۔

کشمیر میں چوبی کاریگری کی پنجرکاری کا سب سے دلآویز نمونہ قصبہ ترال کے نزدیک ڈاڈہ سرگاؤں میں واقع اکبردین کے روضے میں موجود ہے۔ اکبردین صاحبؒ زرے دیدؒ کے والدِ بزرگوار تھے۔ زرے دید حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین رشیؒ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ اکبردین صاحبؒ کا آستان ہشت کونہ پر تعمیر ہوا ہے جو کشمیر کے اکثر لودھ خانقاہوں میں عام تھا۔ طرزِ تعمیر کے اعتبار سے یہ آستان چینی اور ایرانی فنِ تعمیر کی آمیزش معلوم ہوتا ہے۔ اس کی چھت تین تہوں والے پگوڈا طرز کی ہے جس پر رومی طرز کا خوب صورت کلس چڑھا ہوا ہے۔ آٹھ کونوں والے کلس پر ہر چہار اطراف قدِ آدم جالی دار کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں۔ ہر کھڑکی کا ڈیزائن دوسری کھڑکی سے بالکل الگ اور یکسر مختلف ہے۔ گمان غالب ہے کہ کھڑکیاں بنانے والے فنکار کاریگر نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تاکہ تمام رائج الوقت خوبصورت ڈیزائن ایک جگہ محفوظ کئے جا سکیں۔ ان ڈیزائنوں کے ساتھ مشابہ چند نقوش خانقاہِ ترال اور زیارت بٹہ مالو صاحب میں موجود ہیں۔

سولہویں صدی کے دوران یورپ میں یہ رواج تھا کہ وہ مکانوں اور سرکاری دفاتر میں چوبی دار کھڑکیوں کے بدلے شیشہ لگی ہوئی کھڑکیاں استعمال کرتے تھے۔ کھڑکی کے پٹوں پر ہرے، لال، پیلے اور گلابی رنگت والے شیشے بڑی مہارت کے ساتھ لگائے جاتے تھے تاکہ کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ نہ صرف شیشے کے دریچوں سے مختلف رنگوں سے جگمگاتی ہوئی فضا دیکھ کر مسرور ہو جاتے تھے بلکہ یہ رنگ سورج کی کرنوں کے باعث ایک

قدرتی میناکاری کا حسین نمونہ بھی پیش کرتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ دیوان خانوں کے ساتھ ملحق پنجرکاری والے دالان اسی سبب سے "زوئنہ ڈب" (چاند کا دالان) کہلائے۔ یعنی ایسے دالان کہ جن کے پنجروں کے روزنوں سے رنگ برنگ کی روشنی اندر چلی آئے۔ اس طرح کے "زوئنہ ڈب" زمانہ قدیم میں پورے شہر میں مروّج تھے۔ مگر اب ایسے مکانات کے بچے کھچے نمونے مائسمہ اور تاشوان کے صرف ایسے علاقوں میں نظر آتے ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں پرانے زمانے میں حافظائیں رقص و نغمہ کی محفلیں آراستہ کرتی تھیں۔ صفاکدل میں پنڈت بلکاک در کا مکان پنجرکاری کا انتہائی دلآویز اور خوب صورت نمونہ تھا۔ مگر وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ ان کھڑکیوں کے تمام پنجرے بدل دئے گئے۔ شاید یہ ہمارے ذوق جمال کی انتہا ہے۔ اسی طرح مخدوم صاحبؒ کے پرانے آستانۂ عالیہ کی پنجردار کھڑکیاں بھی بدل دی گئیں اور ان کی جگہ شیشے دار کھڑکیاں لگا دی گئی ہیں۔

ہندوستان میں بزرگوں کے مزاروں کے ارد گرد جنگلہ بندی کا رواج ہے یا بادشاہوں کے اصلی مرقد کے بدلے دوسری منزل کے تعویذ رنگ وغیرہ چڑھایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کشمیر میں حضرات اولیاء کے آستانۂ عالیہ پنجرکاری کے خوب صورت ڈیزائنوں سے مزین جالی دار ڈھکن لگائے جاتے تھے جو عام طور سے نیچے چوکور اور اوپر دائرے کی صورت میں ہوتا تھا۔ اس ڈھکن کے اوپر پھر زربفت، کمخواب یا دوسرے قیمتی کپڑوں کے غلاف چڑھائے جاتے تھے۔ ایسا ایک خوبصورت ڈھکن سری نگر میں راہ باب صاحب کے آستانے میں بھی ہے جس میں اقلیدس کے ڈیزائنوں کی مدد سے سورج، ستارں اور ایسی ہی چیزوں کے نقوش کھینچ لئے گئے ہیں۔ ایسے ہی خوبصورت ڈھکن

بابا نصیب صاحب کے آستانے اور چرار شریف میں بھی موجود ہیں۔

پنجرکاری کے خوب صورت ڈیزائن زمانہ قدیم میں ڈولیوں پر بنائے جاتے تھے جن میں دلہن کو گھمایا جاتا تھا۔ ایک ایسی ڈولی "آئنہ زانیانہ" (آئینہ دار ڈولی) کہلاتی تھی جس کے پنجروں میں رنگ برنگے شیشے استعمال ہوتے تھے۔

فن تعمیر میں اب پنجرکاری کا استعمال تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ البتہ کبھی کبھی کسی ہوس بوٹ کی تعمیر میں جنگلہ بندی کی حد تک اس فن کا استعمال اب بھی ہوتا ہے۔

ہ کشمیری سے ترجمہ:
مترجم: برج پریمی

محمد شعبان نور پوری

جالکدوزی اور سوزن کاری

جالکدوزی اور سوزن کاری ہاتھ سے بنی ہوئی چیزوں کی وہ حُسن کاری ہے جو عام طور سے دھاگے سے ہوا کرتی ہے ۔ موجودہ زمانے میں ان دونوں چیزوں کو ایک ہی نام سے موسُوم کیا جاتا ہے ۔ یہ مشترکہ نام "امبرائیڈری٭" ہے چونکہ امبرائیڈری ایک ایسا ہُنر ہے جس میں ایک کاری گر ماہ و سال ایک کر کے اپنی جگر کاوی اور محنت سے کوئی چیز تیار کرتا ہے اس لئے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت اور افادیت ہے یا نہیں۔ کیونکہ یہی چیزیں مشینوں کے ذریعے سے کم سے کم لاگت اور کم سے کم وقت میں بنائی جا سکتی ہیں ۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کیا مشینوں سے ویسے ہی پھول بنائے جا سکتے ہیں جن میں وہی خوب صورتی ہوا کرتی ہے جو اصلی پھول کا جوہر ہے ۔ اور یہ مصنوعی پھول اصلی پھول کے مانند دکھائی دے سکتے ہیں ۔ اس کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ حقیقی پھول میں وہ فطری عنصر شامل ہے جو مصنوعی طور پیدا نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح جب کسی چیز کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے اور پھر مُصوّر اسی چیز کی

٭ EMBROIDERY

تصویر بناتا ہے ۔ اگرچہ یہ دونوں چیزیں ــــ یعنی فوٹو اور تصویر خوبصورت اور دیدہ زیب نظر آئیں گی ۔ پھر بھی فوٹو سے زیادہ تصویر میں کشش ہوگی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصویر فن کے حقیقی عمل سے تعلق رکھتی ہے ۔ یہی چیز اس کو خوبصورت اور دلکش بناتی ہے ۔ اس کے برعکس فوٹوگراف میں فن کا کوئی دخل نہیں ۔ یہ کسی چیز کی نقل ہوتی ہے جبکہ تصویر بذاتِ خود ایک چیز ہوتی ہے ۔ امبرائیڈری میں بھی یہی عنصر شامل ہے ۔ کیوں کہ یہاں صرف فن سے ہی کام لیا جاتا ہے ۔ فن فن پارے کو فطری رنگ عطا کرتا ہے اور جب یہ انسانی ہاتھوں سے بنی ہوئی چیز فطرت کا جُز لگے تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہیں گے اور اس بات پر اعتبار ہی نہ آئے گا کہ یہ انسانی ہاتھوں سے بنی ہوئی چیز ہے ۔ جب جب بھی اس کی طرف نظریں مرکوز ہوں گی تو ایسا لگے گا کہ اس کی دلکشی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ۔ ایک عجیب قسم کی فرحت بخشنے والی لذّت اس کو دیکھنے سے محسوس ہوتی ہے ــ یہ فن کی تاثیر ہے ۔ اس کی ضرورت ایک انسان کو قدم قدم پر ہے ۔ ان چیزوں کو پیش کرنا اور ان سے لذّت حاصل کرنا انسان کی امتیازی خصوصیت ہے جو نہ صرف اس کو مشین کے پرزے سے الگ کرتی ہے بلکہ اس کو باقی مافوق الفطرت عناصر سے بھی اعلیٰ درجہ بخشتی ہے ۔ امبرائیڈری میں بھی یہی ایک خوبی ہے کہ اس سے فن کے اعلیٰ نمونے سامنے آتے ہیں ۔ اسی لئے اس نوع کی امبرائیڈری مشینی امبرائیڈری سے ممتاز درجہ رکھتی ہے ۔ یہ اس لئے ہے کہ ہاتھ کی امبرائیڈری میں ایک فن کار کے جذبات بھی شامل ہوتے ہیں جو اپنا خون پسینہ ایک کر کے اس کو ایک اہم موڑ عطا کرتا ہے ۔ یہی دیکھنے والوں کے نازک احساسات کو قوت عطا کرتے ہیں اور اس پر ایک حسین تاثر قائم کرتے ہیں ۔ لہٰذا یہ بات عیاں ہے کہ مشینی امبرائیڈری کے آنے سے روایتی امبرائیڈری پر کوئی اثر نہیں پڑا ۔ بلکہ یہ آنے والے زمانے میں بھی

اپنی انفرادیت قائم رکھ سکتی ہے۔

امبرائڈری باقی ہاتھ کے کاموں میں سے ایک پرانا ہنر ہے محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس فن کا ارتقاء انسانی شعور کی ترقی کے ساتھ ہوا ہوگا۔ اور پھر زیبائش کا وجود بھی اس میں شامل ہوا ہوگا۔ اس کا سراغ ایشیا کی قدیم امبرائڈری سے بھی ملتا ہے۔ دُنیا کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کی امبرائڈری وجود میں آئی ہے۔ یہ فرق ان جگہوں پر مختلف قسم کا خام مال میسر ہونے کے سبب اور مختلف قسم کے مقامی کلچر کے باعث پیدا ہوا ہے۔ مصر کی نقاشی اور مصوری دکھاتی ہے کہ قدیم زمانے میں پہننے جانے والے کپڑوں پر بھی امبرائڈری کی جاتی تھی۔ یہاں کے مذہبی مقامات پر رنگارنگ مصوری بتاتی ہے کہ یہاں کے لوگوں کی پوشاک پر ہی نہیں، پردے، خیمے وغیرہ پر بھی امبرائڈری ہوتی تھی۔ یہ بات بھی بتائی جاتی ہے کہ چین میں حضرت عیسیٰؑ سے کوئی ایک ہزار سال قبل امبرائڈری کا جنم ہوا تھا۔ یہاں کے کچھ قدیم آرائش کے نمونے دیکھ کر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰؑ سے چھ مہینے پہلے وجود میں آئی ہے۔ ہندوستان میں بھی امبرائڈری کی تاریخ پرانی ہے۔ موہنجوداڑو کے مقام پر حضرت عیسیٰؑ سے تقریباً تین ہزار سال قبل جو نمونے ملتے ہیں ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ابتدا سے ہی اس قسم کی کوششیں ہوا کرتی تھیں۔ وادیٔ سندھ میں بھی اس قسم کے نشانات ملتے ہیں۔

کشمیر میں بھی پرانے وقت سے ہی امبرائڈری کا کام ہوتا چلا آیا ہے۔ ابھی کچھ وقت پہلے ہاروَن کے مقام پر حضرت عیسیٰؑ سے دو سال قبل کے جو پلیٹ ملے ہیں ان میں شال پہنی ہوئی عورت کی تصویر منقش ہے۔ اس پر امبرائڈری کے واضح اثرات ہیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مختلف ادوار میں بعض سیاسی اور قدرتی حالات کے باعث یہ اثرات رونما ہوئے ہیں

چودھویں صدی میں کشمیر میں اسلام وارد ہونے سے قبل ہاتھ سے بنی بہت سی چیزوں کا کام ختم ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد جب حضرت میر سید علی ہمدانیؒ اور ان کے ساتھی یہاں تشریف لائے تو انہوں نے ایران سے اپنے ساتھ کچھ فن کار (کاریگر) لائے جنہوں نے یہاں کے بے جان ہاتھ کے کاموں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ پندرھویں صدی میں ان کاموں کو پھر سے فروغ ملنا شروع ہوا۔ اس لحاظ سے یہ یہاں کا سنہری زمانہ تھا۔ زین العابدین (بڈشاہ) کے دورِ حکومت (۱۴۲۰ء — ۱۴۷۰ء) میں بڈشاہ نے بھی ایران سے کچھ فن کار اور کاریگر یہاں منگوائے جو یہیں آباد ہو گئے۔ ان پختہ کار کاریگروں اور فن کاروں میں امبرائڈری کے مختلف ماہر بھی شامل تھے۔ انہوں نے اس کام کو ترقی دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری امبرائڈری پر ایران کے واضح اثرات ہیں۔

امبرائڈری آرائش اور زیبائش کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ یہ کام کپڑوں پر کیا جاتا ہے۔ کپڑے پہننے اور تحفے تحائف کے ہوتے ہیں۔ یہ کپڑے مقامی طور پر پسند نہیں کئے جاتے ہیں پر ان کی سجاوٹ اور رنگارنگی کی وجہ سے ان کی مانگ دنیا کے کونے کونے میں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ناقابل فراموش ڈیزائن کاری ہے۔ اگرچہ ان ڈیزائنوں میں جیومیٹری کی شکلیں بھی شامل ہیں مگر اکثر ان پر گل کاری ہی کی جاتی ہے۔ دونوں قسم کے ڈیزائنوں میں کشمیر کا مقامی رنگ چھایا ہوا ہوتا ہے جو فطرت کے بہت قریب ہے اور کاریگروں نے اس کو بڑی لگن کے ساتھ ابھارا ہوتا ہے۔

کسی بھی کپڑے پر امبرائڈری کا کام کرنے سے قبل اس قسم کی نقش نگاری کی جاتی ہے جو اس پر ابھارنی مقصود ہو۔ یہ نقش نگاری کاغذی سٹینسل کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ اس کے بعد کاریگر سوئی سے مختلف رنگوں کے دھاگوں

کی مدد سے گل کاری کرتا ہے اور آخر پر اس کی دھلائی کر کے اسے قابلِ دید چیز بنایا جاتا ہے۔

امبرائیڈری کا کام جن کپڑوں پر کیا جاتا ہے ان کے عام طور پر دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ اُن کپڑوں کا ہے جو بچھانے اور پردوں کے کام آتا ہے۔ ان پر جو امبرائیڈری کا کام ہوتا ہے وہ ذرا بڑے سائز کا ہوتا ہے اور اسے "جالکدوزی" کہا جاتا ہے۔ دوسرا حصہ ان کپڑوں پر مشتمل ہے جو پہننے اور اوڑھنے کے کام آتے ہیں۔ ان پر جو کام کیا جاتا ہے وہ بڑا نازک اور چھوٹے سائز کا ہوتا ہے اور اس کام کو "سوزن کاری" کہا جاتا ہے۔

○ **جالکدوزی** ـــــ جالکدوزی کو اون کا کام بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کڑھائی کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے سے بوٹے اُبھارنے کے لئے رنگدار اُون استعمال کیا جاتا ہے۔ بوٹے مختلف قسم کے اُبھارے جاتے ہیں۔ کسی کپڑے پر اڑتے ہوئے پرندوں کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ کسی پر جنگلی جانوروں کی اور عام طور پر کشمیر کے پھولوں، پتوں اور مختلف میووں کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ چنار کے پتے، بادام وغیرہ کی تصویریں بھی منقش کی جاتی ہیں۔ یہ پھول اس صورت میں نہیں بنائے جاتے ہیں جو ان کی فطری صورت ہوتی ہے۔ اس سے یہ ایک الگ سی چیز معلوم ہوتی ہے اور بڑی دلکش اور خوبصورت لگتی ہے۔

جالکدوزی کے کام سے کل چار آئیٹم تیار کئے جاتے ہیں۔ (۱) نمدے، (۲) گبے، (۳) کرول امبرائیڈری اور (۴) فر سے بنی ہوئی چیزیں۔

○ **نمدے** ـ نمدہ کپڑے کی نسبت ایک موٹی چیز ہوتا ہے۔ یہ فرش پر بچھانے کے کام آتا ہے۔ یہ چوکور بھی ہوتا ہے اور گول شکل کا بھی۔ چھوٹے سائز کا بھی اور بڑے کا بھی۔ عام طور پر یہ ۲' × ۳'، ۳' × ۴'، ۴' × ۶'، ۶' × ۹' اور ۹' × ۱۲' سائز کے ہوتے ہیں۔ ایک نمدے کا وزن ایک کلو سے آٹھ کلو تک ہوتا ہے۔ نمدے اون اور روئی سے بنائے جاتے ہیں۔ نمدے میں اون کا ہونا لازمی امر ہے کیوں کہ اس کے بغیر نمدے کا تصور ناممکن ہے۔ روئی ملاوٹ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے نمدہ بڑا مضبوط بنتا ہے۔ آرائش کے علاوہ نمدے انسانی جسم کو سردیوں میں گرمی بھی پہنچاتے ہیں۔ اسی لئے یہ عام طور پر سردیوں میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے بنانے کے وقت کاریگر اُون اور روئی کو الگ الگ کر دیتا ہے اور پھر دونوں کو ملا کر استعمال کرتا ہے۔ کئی جگہوں پر یہ دو چیزیں الگ الگ استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک تہہ کسی "وگو" چٹائی یا بھگو پر ڈال دی جاتی ہے اور اس پر صابن کے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کو ہاتھ سے پھیلایا جاتا ہے۔ پھر دوسری تہہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور اس پر بھی یہی عمل ہوتا ہے۔ اس عمل کو دو چار بار دُہرایا جاتا ہے۔ پھر اس کے کنارے پر حاشیہ سا بنا دیا جاتا ہے۔ کاریگر اس بھگو کو سمیٹتا ہے اور پھر زور سے کسی رسی سے باندھ کر کس لیتا ہے۔ اس کے بعد ایڑی سے دبا دبا کر اُدھر اِدھر گھماتا ہے۔ کافی وقت تک یہ عمل جاری رکھ کے رسی کھول دی جاتی ہے۔ اور اس میں سے نمدہ نکالا جاتا ہے۔ اس کو خشک کیا جاتا ہے اور کڑھائی کر کے اس پر ڈیزائن بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ اچھی طرح سے دھویا جاتا ہے اور آخر پر یہ خوبصورت ڈیزائن کا نمدہ تیار ہو جاتا ہے۔

نمدہ سازی کا ارتقاء ایشیا میں ہوا ہے۔ یہیں سے یہ کشمیر میں آئی ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ عیسوی سن کے شروع ہونے کے ساتھ ساتھ ہی شروع ہوا ہے۔ اُنیسویں صدی کی ابتدا تک یارقند سے نمدے بڑی تعداد میں لائے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ کم تعداد میں آنے لگے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء – ۱۹۱۸ء) کے دوران

نمدے کافی تعداد میں کشمیر درآمد ہوتے تھے۔ ۱۹۲۹ء سے امریکہ نے بھی کشمیر سے نمدے خریدنے شروع کئے پھر جلد ہی یہ ملک وسط ایشیا کے نمدوں کا سب سے بڑا گاہک بن گیا۔ ان ہی نمدوں کو کشمیر کے اصلی نمدے کہتے ہیں۔ کیوں کہ وسط ایشیا سے جو نمدے یہاں درآمد کئے جاتے تھے وہ بالکل سادہ ہوتے تھے اور اُن پر یہاں جالکدوزی کی جاتی تھی۔ پھر باقی ممالک کو بھجوا دیے جاتے تھے۔ بیوپاریوں کے مطابق ۱۹۴۰ء تک دو لاکھ نمدے فی سال یہاں سے درآمد کئے جاتے تھے مگر لیہہ کا راستہ بند ہو جانے کے بعد وسط ایشیا کے ساتھ یہ کاروبار بالکل بند ہو گیا۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں وہاں سے کوئی بھی نمدہ نہیں آیا۔ کیوں کہ یہاں نمدوں کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی بنا پر سری نگر میں نمدے بنانے کی صنعت قائم ہوئی۔ اس سے پہلے بھی یہاں معمولی قسم کے نمدے بنائے جاتے تھے مگر ان کی تعداد وسط ایشیا سے آئے ہوئے نمدوں سے بالکل کم تھی۔ ۱۹۲۹ء سے بہت سے کاری گر اس کام کی طرف متوجہ ہوئے تو اس طرح سے اس صنعت میں وسعت پیدا ہو گئی۔ ۱۹۳۸ء سے یہاں نمدہ سازی کی صنعت کا باضابطہ آغاز ہوا جس سے مقامی نمدہ سازوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

• گبے۔ گبہ آرائش کا ایک کپڑا ہے جو عموماً کمرے میں بچھایا جاتا ہے یہ کبھی کبھی پردوں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ گبہ کسی گرم کپڑے پر کڑھائی کرنے سے بنتا ہے۔ اس کپڑے کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک پٹو کو کاٹ کر بنتا ہے۔ یہ ٹکڑے مختلف رنگوں سے رنگے جاتے ہیں اور کچھ اس طرح سے جوڑے جاتے ہیں کہ دیکھنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ گبہ ٹکڑے جوڑنے سے بنایا گیا ہے۔ یہ پوری چادر اور کمبل کا بھی بنتا ہے۔ کاری گر اس کپڑے کو پہلے رنگ لیتا ہے اور پھر مختلف رنگ کی اُون سے اس پر بڑی خوبصورت گلکاری

کرتا ہے۔ اس کام کو فیتے کا کام کہتے ہیں۔ کاری گر اپنے خیال کے مطابق دو دھاگے یا تین دھاگے والی اون استعمال کرتا ہے۔ اس قسم کے گبے عام طور پر کشمیر میں ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ لوگ یا تو فرمائش پر ایسے گبے بنواتے ہیں یا پھر بنے بنائے ہی خرید لیتے ہیں۔ دوسری قسم کے گبے سوتی کپڑے پر کڑھائی کے کام سے اون کے استعمال سے بنائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے گبے کو "چین سٹیچ" کہا جاتا ہے۔ "چین سٹیچ" گبے اور عام گبے میں کپڑا الگ الگ ہوتا ہے۔ چین سٹیچ گبے پر ایک خاص قسم کے سنہری دھاگے سے کام کیا جاتا ہے اور آخر پر یہ کپڑا کسی بھی جگہ اپنا اصلی روپ ظاہر نہیں کرتا ہے۔ کبھی کبھی اس پر اُون کے بجائے سٹیل کا تار بھی استعمال ہوتا ہے جس سے یہ قالین کی سی شکل و صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس پر قالین کی لاگت سے بہت کم خرچہ لگتا ہے۔ یہ مختلف ناپوں کے بنائے جاتے ہیں۔ بڑے سے بڑا گبہ ۹ × ۱۲ سائز کا ہوتا ہے۔ اس گبے میں لائننگ لگا کر اُون بھی بھرا جاتا ہے۔ اس طرح یہ زیادہ ہی نرم اور آرام دہ چیز بنتی ہے۔

گبہ سازی کی ابتداء اور ارتقاء کا کوئی تاریخی سُراغ نہیں ملتا۔ لیکن اس ضمن میں کئی حکایتیں عام ہیں۔ ایک روایت کے مطابق آج سے لگ بھگ دو سو سال قبل اسلام آباد میں ایک غریب درزی رہتا تھا۔ اس کا نام لسہ طوط تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ناداری کی حالت میں اس نے بہت سے رنگ کے پٹو کے ٹکڑوں کو بستر بنانے کے لئے آپس میں جوڑا۔ چوں کہ یہ ایک نئے قسم کا بستر معلوم ہونے لگا۔ اور جب لوگوں کی نظریں اس پر مرکوز ہوئیں تو اُن کو یہ ایک نئی چیز معلوم ہوئی۔ انہوں نے بھی اسی طرح کے پٹو کو جوڑنے کا کام کیا اور اسی سے کشمیر میں گبہ سازی کی شروعات ہوئیں۔ اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ گبہ سازی کی صنعت دُنیا میں کشمیر ہی کی دین ہے۔ دوسری روایت ہے کہ کابل سے عبدالرحمان نامی ایک پناہ گزین کشمیر

آیا۔ وہ یہاں کسی گاؤں میں رہنے لگا۔ اس نے اپنی کوششوں سے جالکدوزی کی شروعات سے گبہ سازی کا آغاز کیا۔ ایک اور روایت یوں ہے کہ ایک دن مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۵۰ء – ۱۸۵۵ء) یہاں ایک گاؤں سے سفر کر رہا تھا کہ گاؤں کے ایک بزرگ نے ان کو میوے کا رس اور دودھ پیش کیا۔ جب مہاراجہ وہاں سے چلا گیا تو اس نے اس مہمان نواز سے وہ گبہ مانگ لیا جس پر اس نے مہاراجہ کو بٹھایا تھا۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گبہ کی صنعت نے اس وقت تک کشمیر میں بڑی ترقی کر لی تھی۔ جین سٹیچ گبے بعد میں تیار ہونے شروع ہوئے۔ گبے کشمیر میں زیادہ تر اسلام آباد (اننت ناگ) میں بنائے جاتے ہیں۔ سری نگر بارہمولہ اور باقی علاقوں میں بھی آج کل گبے بنائے جاتے ہیں۔ شروع میں جو گبے بنتے تھے وہ زیادہ قیمتی نہیں ہوتے تھے لیکن بعد میں جب اس کام نے کافی ترقی کی تو معیاری گبے بننے لگے حتیٰ کہ امیر لوگوں نے بھی ان کو خریدنا شروع کیا۔

○ کرول امبرائڈری — اس کام میں دسوتی کپڑے پر کڑھائی کا کام کرنے سے بہت ساری چیزیں بنتی ہیں۔ مثلاً پردے، بیگ، میز پوش، کشن کور، بیڈ شیٹ وغیرہ۔ اس میں ایک دھاگے والا اون برتا جاتا ہے۔ یہ کام کشمیر میں ابھی نو آموز ہی ہے۔ مگر پھر بھی یہ چیزیں کافی مقبول ہوئی ہیں اور پسند کی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں عام طور پر ضرورت کی جگہ استعمال ہوتی ہیں۔ اس کام کو کشمیر سے باہر اندرون ملک اور بیرونی ممالک میں بھی پسند کیا جاتا ہے۔

○ فر کا کام — فر کی صنعت بہت ہی قدیم صنعت ہے۔ جب انسان غاروں اور گپھاؤں میں رہتا تھا وہ جانوروں کا شکار کرتا تھا اور اس سے اپنا پیٹ بھر لیتا تھا اور پھر سردی سے بچنے کے لئے اون اور چمڑے سے اپنے آپ کو

ڈھانپتا تھا۔ آج کل کے ترقی یافتہ دور میں بھی انسان جانوروں کا شکار کرتا ہے اور ان کے چمڑے سے لباس بناتا ہے۔ چونکہ کشمیر میں بہت سارے جنگلات ہیں جن میں قسم قسم کے جنگلی جانور ہیں مثلاً شیر، خرگوش، ریچھ وغیرہ۔ ان کے چمڑے کو فر کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بلی، گیدڑ وغیرہ کا چمڑا بھی فر کے کام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پالتو جانوروں میں سے بکری کے بچے کا چمڑا بھی اس کام میں استعمال ہوتا ہے۔ اس چمڑے کو ٹمبر کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس کام کے لئے ایک نئے قسم کا مصالحہ بنایا گیا جس کو رنگریزن کہتے ہیں۔ یہ بڑا چمکدار اور ملائم ہوتا ہے۔ اس مصالحے کے وجود میں آنے کے بعد اس صنعت میں ایک نیاپن آگیا اور یہ کام کافی پھیل گیا۔ کشمیر میں اس کام کے لئے رنگریزن باہر سے آتا ہے۔ فر سے انواع و اقسام کے پہناوے کی چیزیں بنتی ہیں۔ مثلاً کوٹ، جاکٹ، دستانے، بیگ، ٹوپیاں، بیڈ روم کی چپلیں، بیڈ روم سلیپر بوٹ، کمر بند اور کشن کور وغیرہ۔ فر کے کپڑوں پر پھر جالکدوزی کا کام کیا جاتا ہے جس سے یہ اور بھی زیادہ دیدہ زیب لگتے ہیں۔ اس قسم کی چیزوں کو دنیا کے کونے کونے میں پسند کیا جاتا ہے۔ ہر سال یہاں ایک کروڑ سے زیادہ مختلف چیزوں کے کپڑے بنائے جاتے ہیں۔

○ **سوزن کاری** — سوزن کاری کڑھائی کے کام سے زیادہ مشکل اور نازک ہے۔ اس کام میں دھاگا بھی بڑا پتلا استعمال کیا جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ وقت بھی درکار ہے۔ لہٰذا یہ کپڑے بھی زیادہ نفیس اور دیدہ زیب ہوتے ہیں۔ سوزن کاری کے دو حصے ہوتے ہیں:

(۱) رنگر کام

(۲) زر دوزی

• رفنگر کا کام ۔ یہ کام رفل اور پشمینہ کے کپڑوں اور شالوں پر گل کاری کرنے سے ہوتا ہے۔ کپڑے مردوں کے بھی ہوتے ہیں اور عورتوں کے بھی اور ان دونوں قسموں کے کپڑوں پر رفنگری کی جاتی ہے۔ مردانہ کپڑوں میں سے کوٹ، چوغہ (گون) اور مفلر پر یہ کام کیا جاتا ہے۔ زنانہ کپڑوں میں سے یہ کام فراک، پھرن، چوغے، رومال اور ساڑھی وغیرہ پر کیا جاتا ہے۔ جہاں فراک اور پھرن کے کناروں، بازو اور گریبان پر یہ کام کیا جاتا ہے وہاں ساڑھیوں اور رومالوں پر کہیں کہیں ہی پر کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کام غلافوں، بیگوں اور تکیوں پر بھی کیا جاتا ہے۔ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو رفنگری شالوں پر کرنے سے مقبول ہے۔ یہ اکثر شالوں پر کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے یہ ہاتھ کا کام تصور کیا جاتا ہے۔

شال ایک خوبصورت اوڑھنی ہی نہیں پہناوا بھی ہے۔ کیوں کہ یہ زیبائش کے علاوہ گرمی بھی دیتا ہے۔ اسی لئے یہ سردی کے موسم میں اوڑھا جاتا ہے۔ عام طور پر شال دو ناپوں کے ہوتے ہیں۔ مردانہ شال تین گز ڈیڑھ گز اور زنانہ شال دو گز ایک گز کا ہوتا ہے۔ ان شالوں پر رفنگری کا کام کم بھی کیا جاتا ہے اور زیادہ بھی۔ جس شال کے دو سروں پر کام کیا جاتا ہے اس کو "دوردار" شال کہا جاتا ہے۔ یہ چھوٹے حاشیہ کا بھی ہوتا ہے اور بڑے حاشیہ کا بھی۔ عام طور پر بادام اور چنار کے پتوں کی تصویریں اس پر منقش کی جاتی ہیں۔ کسی شال پر ان تصاویر کے علاوہ چار کونوں پر دھاگا بھی بچھایا جاتا ہے۔ کئی شالوں پر کہیں کہیں گل بوٹے بھی بنائے جاتے ہیں۔ ان شالوں کو بوٹے والا شال بھی کہا جاتا ہے۔ بوٹے چھوٹے بھی اور بڑے بھی ہو سکتے ہیں۔ چھوٹے بوٹے ڈالنے کو 'دخلی کار' کہا جاتا ہے۔ بہت سے شالوں پر کافی تعداد میں گل کاری کی جاتی

ہے۔ ایسے شالوں کو "جامہ" یا "جامہ وار" کہا جاتا ہے۔ جس جامہ پر زیادہ کام نہ ہو اس کو جالی والا جامہ کہتے ہیں۔ یہ سارا کام دو قسم کا ہوتا ہے۔ سرسری اور کم کام والے شال کو "وٹہ چکن" کہتے ہیں۔ یہ کام عام طور پر رفل شالوں پر کیا جاتا ہے۔ دوسرے قسم کا کام زیادہ گھنا اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس کام کو 'ریزگاری' کہتے ہیں۔ یہ کام پشمینہ شالوں پر بھی کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے شال دونوں طرف یکساں ہوتے ہیں اور ان کو دونوں طرف اوڑھا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے ان کو دو رُخ والے شال بھی کہا جاتا ہے۔ رفنگری سے ایک قسم کا کانی شال بھی بنایا جا سکتا ہے۔ یہ پشمینہ کے بہت سارے ٹکڑوں کو جوڑنے سے تیار ہوتا ہے۔ پشمینے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کچھ اس طرح سے جوڑے جاتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا ہے کہ شال چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑنے سے تیار ہوا ہے۔

کشمیر میں اس قسم کے شال وجود میں آنے کے متعلق بہت سی قیاس آرائیاں کی جاتی رہی ہیں۔ ایک قیاس کے مطابق یہ شال اٹھارویں صدی کے آغاز میں وجود میں آئے۔ کہا جاتا ہے کہ افغان دور میں جب یہاں کا گورنر آزاد خان (۱۷۷۵ء ـ ۱۷۸۳ء) تھا تو ایک کاری گر علی بابا نے ایک جانور کو سفید کپڑے کے ٹکڑے پر چلتا ہوا دیکھا۔ اس طرح سے اس کے پنجوں کے نشانات اس پر منقش ہوئے۔ یہ دیکھ کر اس استاد کاری گر (شالباف) کو اس طرح کے نقش بنانے کا خیال آگیا۔ اس طرح سے اُس نے پہلا سوزن کا شال تیار کیا۔ وہ سرینگر کے سوکالی پورہ کا رہنے والا تھا۔ شال بنانے کا یہ طریقہ مقبول عام ہو گیا اور سبھوں نے اس قسم کے شال بنانا شروع کئے۔ اس قسم کے شال بڑے سستے بنتے تھے۔ ایک اور روایت ہے کہ سولھویں صدی میں مرزا حیدر کے زمانے

میں یہاں ایک ترکستانی ماہر کاری گرنادر بیگ آیا تھا جس نے اس طرح کے رنگدار ڈیزائنوں کے بے شمار شال بنائے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں امبرایڈری بہت پہلے شروع ہوئی ہے۔ ۱۸۰۳ء میں آرمینیا سے ایک تاجر خواجہ یوسف کشمیر آیا۔ اس نے یہاں "املی کار" شالوں کے بہت سے ڈیزائن دکھائے۔ اس طرح سے اس کو اور بھی فروغ ملا۔ سکھ دور (۱۸۱۹ء - ۱۸۴۶ء) میں بھی شال امبرایڈری بہت آگے جا چکی تھی۔ سب سے زیادہ اچھے معیاری اور قابل قدر شال مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں بنائے گئے۔ اس نے اپنے لئے ایک ایسا شال بنوایا جس پر اس کی کامیابیاں منقش کی گئی تھیں۔ اس شال کو بنانے میں پانچ ہزار روپے کی لاگت آگئی۔ پہلے پہل تو یک رُخی شال بنائے جاتے تھے جو صرف ایک ہی طرف سے اوڑھے جا سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے دونوں اطراف جُداگانہ ہوتے ہیں۔ ۱۸۶۴ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے وقت میں دو رُخی شال بنایا گیا۔ یہ شال مصطفےٰ پنڈت اور عزیز پنڈت جیسے کاری گروں نے مشترکہ طور پر تیار کیا۔ اس شال کے دونوں اطراف میں گُل کاری ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ دونوں اطراف سے اوڑھا جا سکتا ہے۔

○ زر دوزی ۔ اس کو طلاء چڑھانا یا طلا کاری بھی کہتے ہیں۔ طلاء زنانہ شالوں اور پھیرنوں پر لگایا جاتا ہے۔ یہ کام انجام دینے سے پہلے کاغذی سٹنسل سے نقش چڑھایا جاتا ہے۔ نقش مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے بھی اور بڑے بھی۔ اس وقت اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کس پہناوے پر کتنے تولے طلاء لگایا جانا مقصود ہے۔ اسی کے مطابق چھوٹا یا بڑا ڈیزائن کپڑے پر ڈالا جاتا ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے دو قسم کے دھاگے درکار ہوتے ہیں۔ ایک اصلی طلاء ہے جو سفید یا زرد رنگ کا ہوتا ہے دوسرا اس طلاء کو بند کرنے کے کام آتا ہے۔ یہ دھاگا ریشم کا بھی ہوتا ہے اور سُوت کا بھی۔

● کڑھائی کا کام ۔ یہ رفل شالوں اور پہناووں پر کیا جا سکتا ہے جس قسم کا نمایاں یا غیر نمایاں کام ہو اُسی قسم کا چھوٹا یا بڑا آرہ (سوئی) استعمال کیا جاتا ہے جو سوزن کاری سے نمایاں کیا جاتا ہے۔ یہ کام سٹیپل دھاگے یا کبھی کبھی اون استعمال کرنے سے بھی کیا جاتا ہے۔ کڑھائی کا کام شالوں کے علاوہ پھیرنوں، فراکوں، کُرتوں، کوٹوں، چوغوں اور ساڑھیوں وغیرہ پر بھی کیا جاتا ہے۔

○ ۔ کشمیری سے ترجمہ

(مترجم ۔ پریمی رُومانی)

محمد یوسف ٹینگ

بید لرزاں

کشمیر کا عجوبۂ روزگار درخت جو صدیوں تک تاریخ میں سفر کرتا رہا

کشمیر کی فارسی تواریخوں میں ایک ایسا درخت تقریباً ڈھائی سو سال سے زیادہ زمانے تک سفر کرتا ہے جسے کشمیر کا ایک بہت ہی نادر عجوبہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی عجیب حیثیت اس حد تک دیکھنے والوں کو دنگ کرتی تھی کہ اپنی زندگی کے دوران یہ تواریخ نویسوں کے علاوہ بادشاہوں کی توجہ کا مرکز بھی رہتا تھا۔ اب یہ درخت زمانے کے اندھے کنوؤں میں کشمیر کے کلاسیکی کانی شال وغیرہ کی مانند گم ہوچکا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ ناقابل تلافی نقصان صرف کشمیر کا نہیں بلکہ سارے عالم نباتات (BOTANY) کا بھی ہے کیوں کہ اس وقت کے سراغ کے مطابق یہ درخت اس خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو عالم نباتات و حیوانات کی بہت سی SPECIES کی طرح نابود ہوچکا ہے۔ ہمارے کرۂ ارض کی ندرت اور آرائش ان ہی عجوبوں کی مرہون منت رہی ہے۔ ان میں سے ایک ایک کا اتلاف ہماری محرومی کو گہرا کرتا جاتا ہے۔ اب اس درخت کی حیات تو کا شاید کوئی امکان نہیں ہے۔ مگر یہ بات تھوڑی سی پریشانی کا باعث ضرور ہے کہ ابھی تک اتنی عجیب قدرتی افزائش کا اس قدر نوٹس نہیں لیا گیا جتنا کہ یہ مستحق تھا یہ ہمارے ذوق کے اکھڑے پن اور اس کی تنگی کا ثبوت بھی ہے۔

اگرچہ اس درخت کے جسمانی نظام کا کوئی حصّہ موجود نہیں ہے لیکن کشمیر میں اس کے وجود کا وقوعاتی (TOPOGRAPHICAL) ثبوت لوک حافظے میں بھی محفوظ ہے اور زمین پر بھی اس کی زندگی کے نشانات مختلف روایتوں کی صورت میں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ ماہرین نباتات اس کے وجود کی مختلف شہادتوں کے دھاگے جوڑ کر اس کے خاندان کا اصل سُراغ لگائیں اور اس بات کا بھی جائزہ لیں کہ اس کے عدم آشنا ہونے کی وجوہات کیا تھیں؟

ہل مقل کا یہ گاؤں جہاں یہ درخت کبھی اپنے بڑے قد کے ساتھ رقص بسمل کرتا تھا "راج ترنگنی" کے فاضل انگریزی تاریخ داں آرل سٹائن کے مطابق اس کتاب کے "شلا تھلا" گاؤں کا ہی روپ ہے۔ سٹائن کے کہنے کے مطابق اس جگہ مہاراجہ اننت کے وقت ایک لڑائی ہوئی۔ وہ اکبر کے درباری ابوالفضل کا حوالہ دے کر کہتا ہے کہ یہاں پہ ایک تھر تھر کانپنے والا درخت ایستادہ تھا۔ سٹائن ابوالفضل کی عبارت کا ترجمہ پیش کرتا ہے:

"اگر اس کی کسی چھوٹی سی ٹہنی کو بھی ہلائیں تو سارا درخت لرزہ براندام ہوجاتا ہے"۔

سٹائن کے مطابق ہل مقل بچھو پرگنے میں واقع تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ گاؤں اب سروے آف انڈیا کے نقشوں پر نظر نہیں آتا۔ اور خود میں اس گاؤں کا محل وقوع ڈھونڈ نہیں سکا۔ تواریخ اور تذکروں کی جو کتابیں ہمارے زمانے تک پہونچ سکی ہیں غالباً ان سب میں اس درخت کی چشم دید گواہی مرزا حیدر دوغلات (وفات ١٥٥١ء) کی تصنیف "تاریخ رشیدی" میں نظر آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ناگام میں، جو کشمیر کا ایک اہم قصبہ ہے، ایک ایسا درخت ہے جو اتنا

اُونچا ہے کہ اگر کوئی تیر چھوڑ دے وہ اس کے سرے پر پہونچ پائے گا۔ جوں ہی کوئی (اس کی) شاخ کو پکڑتا ہے سارا درخت تھر تھر کانپنے لگتا ہے"۔

اس کے بعد مغل اعظم اکبر بادشاہ کا وزیر اعظم اور مورخ ابوالفضل اپنی کتابوں "آئین اکبری" اور "اکبر نامہ" میں اس درخت کا تفصیلی تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے مطابق:

"ہل تھل گاؤں، جو پرگنہ بچھ میں واقع ہے، میں ایک لرزتا ہوا -Qui ring درخت ہے۔ اگر اس کی پتلی سی ٹہنی کو بھی ہاتھ سے حرکت دی جائے تو سارا درخت تھر تھرانے لگتا ہے"۔

"اکبر نامہ" میں وہ کچھ اور تفصیل دیتا ہے:

"جہاں پناہ نے کور خانپورہ کی سرائے میں قیام فرمایا[1]۔ اس جگہ وہ قابل ذکر اور قابل دید درخت واقع ہے جس کو ہل تھل کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ بڑے راستے کی ایک جانب ایستادہ ہے۔ یہ دیکھنے والوں کے لئے ایک بہت ہی عجیب چیز ہے۔ اس کی جڑیں اور تنا بڑے مضبوط ہیں۔ اس کی بہت سی شاخیں اور بے شمار پات ہیں۔ اگر اس درخت کو کسی جگہ بھی چھیڑا جائے تو سارے درخت پر لرزہ کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اگرچہ اس ذات کے بہت سے دوسرے درخت بھی موجود ہیں مگر ان میں یہ بات نہیں"۔

اس حوالے کے نیچے کتاب کا انگریزی ترجمہ کار بیورج لکھتا ہے:-

---

[1] آرل سٹائن اس گاؤں کو خامپور کہہ کر پکارتا ہے اور یہی نام لوگوں کی زبانوں پر بھی ہے، یہ ظاہر ہے اصل خانپور کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہاں پر مغل سرائے کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ یہ پرانی مغل روڈ پر واقع سرینگر داخل ہونے سے پہلے کا آخری پڑاؤ ہے۔

"خانپور کا درخت شاید وہی ہے جس کی طرف حیدر دوغلات اشارہ کرتا ہے اور سراغ دیتا ہے کہ یہ ناگام قصبے میں موجود ہے"۔

"اقبال نامہ" کے مُصنف کے مطابق اس کا نام "ہل مل" ہے جبکہ ابوالفضل "ہل تھل" درخت کی بجائے گاؤں کا نام جتلاتا ہے۔

سر جارج کننگھم کا خیال ہے کہ یہ درخت اُس ذات کا ہے جسکو Princoutg Trequlla کہتے ہیں۔ حیدر ملک چاڈورہ اپنی تاریخ میں اس درخت کا ذکر کرتے ہوئے اسے "ہل تھل" کا نام دیتا ہے۔ اکبر بادشاہ کا ایک اور تاریخ نویس مُلا عبدالقادر "منتخب التواریخ" میں رقمطراز ہے:

"ملک کشمیر میں ہمارے سپاہیوں نے جو عجائبات دیکھے اُن میں خانپور کا بید لرزاں بھی شامل ہے۔ یہ اتنا حساس ہے کہ ذرا سا چھیڑنے سے اس میں لرزہ اور رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے تنے کی موٹائی دو 'ارش' ہے۔ اس کی شاخیں جیسے اُلٹے بید مجنوں کی طرح ہیں۔

(مترجم ڈبلیو۔ ایچ لوئی اس کا بید گریہ (Weeping Willow) کا نام بھی دیتا ہے۔ اس کے مطابق اگر کوئی بچہ بھی اس کی ٹہنی سے ہاتھ لگائے تو سارا درخت کانپنے لگتا ہے اور رقص بسمل کا عالم پیش کرتا ہے)۔

اکبر کے زمانے میں ملا محمد شاہ آبادی نے "راج ترنگنی" کا فارسی ترجمہ کیا۔ یہ مترجم بعض روایات کے مطابق جنوبی کشمیر کے پرگنہ شاہ آباد سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اس کتاب پر تفصیلی حواشی بھی لکھے اور اپنے زمانے کی آگہی کے مطابق مقامات اور ناموں کی درستی بھی کی۔ وہ ہل تھل کے متعلق لکھتا ہے:

"ہل تھل کا ذکر کلہن کہیں پر بھی اس کا نام لے کر نہیں کرتا مگر راجہ اجیتا پیڈ نے جو پانچ گاؤں اپنی رکھیل جیا دیوی کو دیئے وہ ہل تھل

نوگام پرگنے کے علاوہ ارطنو اور سلنو شہر سرینگر کے نزدیک تھے۔" یہ بسمل نقل زمانے کا پہلا تحریری ذکر ہے۔ (بحوالہ راج ترنگنی مرتبہ ڈاکٹر صابر آفاقی)

"تزک جہانگیری" میں شہنشاہ نورالدین جہانگیر بہ نفس نفیس لکھتا ہے:۔

"میں چکور کے شکار کے لئے چاڈورہ گیا۔ یہ حیدر ملک کا آبائی گاؤں ہے۔ میں نے اس گاؤں کا نام نورپورہ رکھ دیا۔ راستے کے کنارے ایک درخت تھا جسے بل نقل کہتے ہیں۔ جوں ہی اس کی شاخ پکڑ لو یہ رقص بسمل کرنے لگتا ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خاصیت صرف اس ایک درخت کی ہے مگر میں نے یہاں بہت سے درخت دیکھے جو اسی طرح تڑپنے لگتے ہیں"۔

جہانگیر کے یہاں اس بات کی پہلی اطلاع ملتی ہے کہ یہ ایک نہیں بلکہ بہت سے ہم خاصیت درختوں کا ذکر ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک دو ضمنی مگر دلچسپ باتوں پر نظر ڈالتے چلیں۔

چاڈورہ کے حیدر ملک اپنے زمانے میں رئیس ملک کشمیر کہلاتا تھا۔ وہ جہانگیر کا معتمد اور معتبر تھا۔ "بہارستان شاہی" کی روایت کے مطابق اسی نے ابہ خان چک کے ساتھ مل کر ملکہ نورجہاں کے پہلے شوہر شیر افگن کو بردوان (بنگال) کے مقام پر قتل کروایا۔ اس کے بعد جیسا کہ معلوم ہے، جہانگیر نے مہرالنساء کے ساتھ شادی کر کے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا اور اس کو نورجہاں کا لقب دیا۔ شیر افگن کے قتل کے بعد جہانگیر نے مہرالنساء کو حیدر ملک کی پناہ میں دے دیا اور اس نے اپنی پہلی بیوگی کا بڑا حصہ حیدر ملک کی آنکھوں کے سامنے ہی گذارا۔ حیدر ملک کو اتنی لطیف مگر آتش انگیز سوغات سونپنے سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر کو اس پر کتنا بھروسہ تھا۔

اس کے علاوہ شاید یہ بھی مصلحت ہو کہ نورجہاں کشمیر میں رہ کر آگرہ اور لاہور کی درباری سازشوں سے دور رہے۔ لگائی بجھائی کرنے والے اس کو جہانگیر کے خلاف نہ بھڑکا سکیں اور وقت کے یقینی مرہم سے شفا پانے کے بعد وہ اپنے محبوب خاوند کے اصل قاتل یعنی جہانگیر کے لئے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا کر سکے۔ حیدر ملک اس خوبصورت مگر عشوہ گر عورت کی اس وقت تک حفاظت کرتا رہا جب تک کہ وہ جہانگیر سے شادی پر آمادہ نہ ہوئی۔ حیدر ملک نے مہرالنساء کو چاڈورہ میں ہی اپنے شاندار قصر میں رکھا ہوا تھا۔ مہرالنساء کے نورجہاں بننے کے بعد ہی حیدر ملک نے جہانگیر سے درخواست کی کہ چاڈورہ کا نام نورپور رکھا جائے اور تزک کے اس حوالے سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ مگر زمانے نے حیدر ملک کی اس مصاحبانہ ادا کو پسند نہیں کیا اور نورپور کا نام شاید اس کے رسوخ کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی بھلا دیا گیا۔ یاد رہے کہ یہ گاؤں اس زمانے میں چکوروں کی ایک محفوظ شکارگاہ کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ نورجہاں اور حیدر ملک کیسے ایک دوسرے سے وابستہ تھے اس کی گونج اس وقت سنائی دی جب انیسویں صدی کے نصف اول میں کشمیر آنے والے مشہور یورپی سیاح وینی (Vigne) نے نورجہاں کو چاڈورہ کے ملک خانوادے کی بیٹی اور کشمیر نژاد قرار دیا۔ (ملاحظہ ہو اس کا سفرنامہ)

اس کے بعد محمد اعظم دیدہ مری کی مشہور تاریخ "واقعات کشمیر" میں اس درخت کا شاید آخری ذکر ملتا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے بعد یعنی اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں یہ درخت کسی آفت ناگہانی کا شکار ہو گیا۔ محمد اعظم نے کشمیر میں موئے مبارک کی آمد کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وہ سنہ ۱۷۶۵ء میں انتقال کر گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ درخت سنہ ۱۷۶۵ء تک موجود تھا۔ وہ اس درخت کو کشمیر کے عجائبات میں شمار کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:۔

"پرگنہ اچھ میں موضع ہل بھل میں ایک درخت ایسا ہے جسے عرعر سفید
کہتے ہیں۔ یہ اتنا بھاری درخت ہے کہ اس کے نیچے کشمیر میں رہنے
والے سائے میں بیٹھتے ہیں۔ مگر اتنا بڑا ہونے کے باوجود اگر کوئی اس
کی ایک ٹہنی کو پکڑے تو سارا درخت بلکہ اس کا تنا تک لرزنے لگتا
ہے۔ اسی لئے شاعر نے کہا ہے ؎

تنم از فاقہ بلرزد چوں درختِ ہل بھل

تاریخ فرشتہ میں مرزا حیدر گورگان کے قتل سے پہلے کی شب کے ذکر میں کہا گیا ہے کہ وہ (سن ۱۵۵۱ء) خانپورہ (ناگام) کے نزدیک اس بیدِ لرزاں کے پیڑ کے پاس صف آرا ہوگیا جس کے سائے میں بائیس مسلح گھوڑ سوار ایستادہ رہ سکتے تھے۔ اس حوالے سے بیدِ لرزاں کی جسامت کی بڑی واضح تصویر ابھرتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی چھتنار چنار جیسا گھیرے دار درخت رہا ہوگا۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق اگر اس درخت کی ایک ٹہنی کو جنبش دی جاتی تو سارا درخت حرکت میں آجاتا تھا۔

کشمیر سے باہر کے مورخوں نے گاؤں اور درخت کو خلط ملط کر کے بڑی الجھن پیدا کر دی ہے۔ اس کا سائنسی نام ماہرین نباتات جان سکتے ہیں مگر اس بات کا کھوج لگانا ضروری ہے کہ یہ درخت کیوں نابود ہوگیا اور اب ہمیں کشمیر میں کیوں اس ذات کا ایک درخت نظر نہیں آتا ہے۔ یہ بات بہر کیف ایک سوالیہ نشان بن جاتی ہے کہ اس قسم کا درخت اگانا اب ممکن ہے کہ نہیں۔ کچھ بھی صورت کیوں نہ ہو "درخت ہل بھل" کشمیر کے ایک عجوبے کی حیثیت سے گفتگو اور دلچسپی کا باعث بنا رہے گا۔

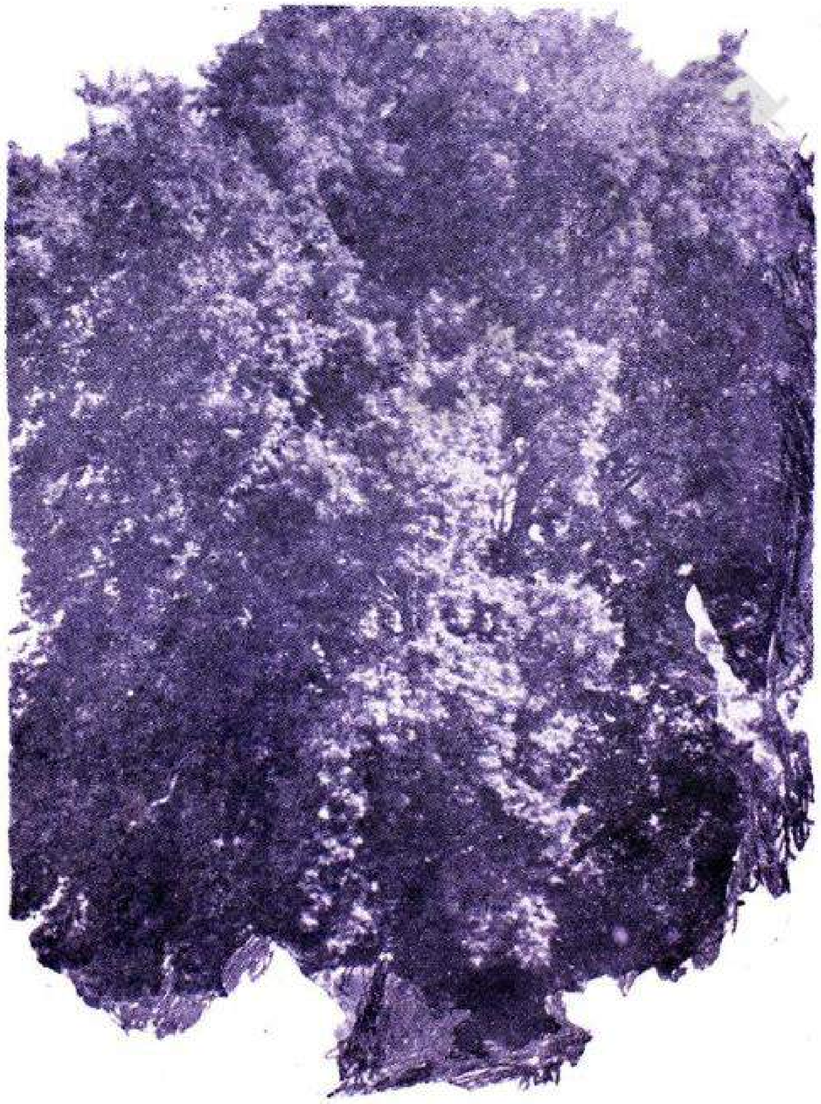
راقم کا باربار یہ بیان رہا ہے کہ کشمیر کی تواریخ کو جتنے اعتبار سے کشمیری زبان میں لکھا جاسکتا ہے کسی اور زبان میں ہرگز نہیں۔ اسی درخت کی بات لے لیجئے۔ کوئی اسے "ہل بھل" کہتا ہے اور کوئی ہل بھل کا درخت۔ کوئی بیدِ مجنوں۔ کوئی بیدِ لرزاں اور کوئی عرعر سفید وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تاریخ کے صفحات سے باہر اس درخت کا جو سراغ کشمیر کی سرزمین اور لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہے وہ اس کا بہت اچھی تصویر ابھارتا ہے۔ ہرگاہ ناگام سے چرار شریف جانے کے لئے آج کی موٹر روڈ کو ترک کر کے پرانے پیدل راستے کو اختیار کیا جائے تو ہم ہایت نار سے آگے ایک بڑی ڈھلان پہنچ سکتے ہیں۔ وہاں اب ہل بھل نام کا کوئی گاؤں نظر نہیں آتا۔ لگتا ہے کہ یہ کسی زلزلے یا بارش کے طوفان سے پیدا شدہ کٹاؤ کی نذر ہوگیا ہے۔ اس علاقے کی ارضی (Geological) ساخت ایسی ہی ہے کہ یہ کریوہ داؤں اور کھوبڑ کھابڑ کھائیوں اور اونچی سطحوں کی زمین ہے جو زیادہ بارش ہونے سے کٹ پھٹ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ بھونچال کی زد میں بھی رہتا آیا ہے۔ ہمارے حافظے میں ہی یہاں بہت سی بستیاں سرک گئی تھیں۔ اب لگتا ہے کہ ہل بھل کا گاؤں بھی مقبول کرالہ واری کے بدرِ ٹیگ (ملاحظہ ہو "گریسی نامہ" از مقبول کرالہ واری) کی طرح بے چراغ ہو چکا ہے اور اس کا اب کوئی نشان موجود نہیں ہے۔ (یاد رہے کہ مقبول کرالہ واری نے جس گاؤں کا ذکر کیا تھا وہ یہاں سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں ہے) اسی ڈھلان کو آج کل "زینۂ کجن" کہہ کر پکارتے ہیں جس کا مطلب کشمیری زبان میں یہ ہے کہ وہ جگہ جہاں لرزنے والے درخت ہوتے تھے۔ یہ نام خسرۂ گرداوری میں بھی نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ درخت (درختوں؟) کی شہرت اتنی تھی کہ جب وہ مٹ بھی گئے پھر بھی اس جگہ کو انہی کے نام سے منسوب کیا جاتا رہا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں جو لکھا

ہے کہ یہ ایک درخت نہ تھا بلکہ درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس کی تصدیق اس نام سے ہوجاتی ہے کیوں کہ "کجُن" جمع کا صیغہ ہے۔ لگتا ہے کہ اس قسم کے کچھ درخت یہاں پر موجود رہے ہوں گے۔ البتہ اُن میں سے ایک درخت زیادہ بڑا تھا اور اس لئے سیّاح سیلانی اسی پر توجہ کر کے اس کا ذکر کرتے تھے۔ اعظم دیدمری نے اس کا رنگ سفید بتایا ہے جس سے یہ بید کا نہیں بلکہ سفیدے کا ہم شکل لگتا ہے۔ مگر اس کی اس وضاحت سے کہ اس کی چھاؤں میں سستا لیا جا سکتا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ صرف سفیدے کی طرح صرف عمودی نہ تھا، بلکہ سیب یا چنار کے درخت کی طرح چھتنار تھا۔ اس کے علاوہ کشمیری میں اس کا خاص نام "ژینتہ کجُ" واضح کرتا ہے کہ یہ بالکل ایک الگ قبیلے کا درخت تھا جس کی اہم خصوصیت اس کی لرزش تھی۔ ان بیانات میں اس درخت سے کوئی میوہ یا فصل بھی منسوب نہیں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ "کجُ" کشمیری زبان میں "بکل" یعنی درخت کی تصغیر کو کہتے ہیں جس سے لگتا ہے کہ یہ درخت زیادہ لمبا (اونچا) نہ تھا اور یہی بات عبدالقادر بدایونی کے بیان میں بھی نظر آتی ہے۔ بہرحال یہ تاریخی درخت صدیوں تک بادشاہوں اور دانش وروں کی دلچسپی کا باعث بنا رہا اور کشمیر کے عجائبات میں اس کا ہمیشہ ذکر ہوتا رہے گا۔ ○

موتی لال ساقی

چنار

پھولوں کی وادی کشمیر کو سنوارنے میں دستِ قدرت نے جس فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی ایک حسین ترین علامت چنار ہے۔ چناروں کی چھتر چھایا نے کشمیر کے حسن میں ٹھنڈک اور ملائمت پیدا کی ہے۔ مادرِ کشمیر کے ماتھے کا جھومر چنار ایک درخت، ایک پیڑ نہیں بلکہ ہماری مخلوط تہذیب کی من کو لبھا نے والی علامت ہے! ایک ایسی علامت جو جلال اور جمال کا ایک لطیف سنگم ہے۔ ہماری دستکاریوں کو ایک مخصوص مزاج عطا کرنے میں چنار کا ایک الگ مقام ہے۔ شال یا لکڑی کی سطح پر جب ہمارے ہنرمند کاری گر چنار یا چنار کے پتّوں کو اُبھارتے ہیں تو لگتا ہے کہ وادی کشمیر کا سارا حُسن و جمال شال یا لکڑی پر سمٹ کر یکجا ہو گیا ہے۔ چنار کا پتہ جب کشمیری شال پر سوزن کاری کے سہارے اُبھر آتا ہے تو کپڑے کی بے جان سطح پر زندگی مسکرانے لگتی ہے۔ سچ مانیئے تو ہماری فنی وراثت کو ایک الگ سمت اور ایک رنگ عطا کرنے میں چنار نے اپنا بھرپور حصّہ ادا کیا ہے۔ سراپا ٹھنڈک اور چھاؤں کا سرچشمہ چنار خزاں میں ایک اور ہی منظر پیش کرتا ہے۔



چنار : ہے نظر کو اعترافِ تنگ دامانی یہاں

چنار کے خزاں زدہ پتے شعلہ بار لگتے ہیں اور چنار دُور سے ایک ایسا لپکتا ہوا شعلہ لگتا ہے جو آسمان کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہتا ہو۔ بادو باراں میں چنار کا کھوکھلا تنا راہ گیروں کی پناہ گاہ بن جاتا ہے۔ آج بھی راہ چلتے مسافر اور خانہ بدوش چنار کے کھوکھلے تنے کے اندر بیٹھ کر رین بسیرا کرتے ہیں۔

ہماری حسین و جمیل دھرتی پر چنار کا وجود رُوح پرور اور روح افزا ہے، ٹھنڈک اور چھاؤں کی ورشا کرنے والے اس پیڑ کی چھاؤں میں ہمارے آبا و اجداد نے کب سے سُکھ اور چین کے مزے لئے اس کے بارے میں ہماری قدیم تاریخ خاموش ہے۔ اس سحُور کن اور مہمان نواز پیڑ کا ذکر راج ترنگنی میں کسی بھی جگہ نہیں ہوا ہے۔ مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جس وقت کلہن نے راج ترنگنی لکھی اس وقت ہمارے یہاں چنار کا وجُود نہیں تھا۔ کلہن جہاں ابھنو گپت، گُن ورمن، سوم آنند اور دوسری درجنوں کشمیری شخصیات کا ذکر کرنا بھُول گیا ہے وہاں اگر اُس نے چنار کا ذکر نہیں کیا ہے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ یہاں پر مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ سنسکرت کی مشہور ڈکشنری "امرکوش" مصنف امرسنگھ نے ایک پیڑ کے سائے میں تیار کی۔ اس کی یہ ڈکشنری ایک نادر دستاویز ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ جس پیڑ کے سائے میں اس نے "امرکوش" کو ترتیب دیا اُس پیڑ کا ذکر اس کی ڈکشنری میں آنے سے رہ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کلہن بھی اسی غفلت شعاری کا شکار رہا ہو۔ کیوں کہ مانوسیت کسی بھی چیز کی قدر و قیمت کو کم کر دیتی ہے۔ چنار ہم کشمیریوں کی زندگی میں اس قدر رچ اور بس گیا ہے کہ ہمیں اس کے حُسن، اس کی چھاؤں، اہمیت اور افادیت کا ذرہ بھر بھی احساس نہیں رہا ہے۔ چنار کی قدر و قیمت تپتے ریگستان کے باسیوں سے پوچھئے جو دُور سے ہی اس پیڑ کو دیکھ کر ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں۔ گڑگڑاتے

زمہریری سرما میں چنار کے پتوں کے کوئلے سے بھری "کانگڑی" ہمارے جسم کو خوش کُن آنچ سے گرم رکھتی اور کیف وسرور سے ہمکنار کردیتی ہے۔ اس کی سرخی مائل لکڑی کو ٹلے وڈ بنانے کے کام بھی لایا جاسکتا ہے جس کا کامیابی کے ساتھ تجربہ بھی کیا گیا ہے۔

چنار کشمیر کا اپنا پیڑ ہے۔ یہ عالی شان درخت اسی دھرتی کی گود میں پیدا ہوکر پروان چڑھا ہے۔ "چنار" کے کشمیری الاصل ہونے کے کئی ایک ثبوت ہیں۔

(ا) اس پیڑ کا کشمیری میں اپنا الگ نام "بونۍ" ہے۔ اگر یہ پیڑ یہاں باہر سے آیا ہوتا تو اس کا نام بھی ساتھ ہی آجاتا۔ اور کسی نہ کسی صورت میں مروّج ہوتا۔ میرے خیال میں کشمیری لفظ "بونۍ" جو بنیاد، مضبوطی اور پائیداری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، بھی اسی درخت کی نسبت سے وجود میں آیا ہے۔ کیونکہ چنار ایک مضبوط درخت ہے اور زوردار سے زوردار ہوا بھی اس کو جڑ سے اکھاڑ نہیں سکتی۔ چنار کا کشمیری نام "بونۍ" سنسکرت "بھوانی" سے ماخوذ مانا جاسکتا ہے۔ سنسکرت میں "بھوانی" "ماتا دیوی" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ماں جو کہ محبت اور سکون کی علامت ہے۔ چنار بھی سکھ اور سکون بہم پہنچانے میں ماں سے کچھ کم نہیں۔ کشمیری میں کچھ دل کش اور بامعنی محاورات اور مرکبات اسی پیڑ کی نسبت سے وجود میں آگئے ہیں مثلاً "چھتر بونۍ" (سایہ دار چنار) "بونہ مُہل تارُن" (چنار میں چھید کرنا معنی کوئی مشکل کام کرنا) "بونہ گُہنُش" (چناروں کی گھنی چھاؤں) وغیرہ۔ یہ محاورات اور مرکبات اس بات کا ثبوت ہیں کہ جس وقت کشمیری زبان اپنا وجود منوا رہی تھی اس وقت چنار کشمیر میں موجود تھا۔

(ب) وادیٔ کشمیر میں جس تیزی کے ساتھ چنار کے پیڑ کی نشوونما ہوتی ہے اتنی تیزی سے دنیا کے کسی اور حصے میں یہ درخت پروان نہیں چڑھتا۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ کوئی چیز اپنی اصلی دھرتی اور اپنے اصلی وطن میں ہی عزت کے ساتھ عروج پاتی ہے۔ کشمیر میں چناروں کی کثرت چنار کے اصلی وطن کی نشاندہی کرتی ہے۔ پیڑوں کے بارے میں دیکھا گیا ہے کہ اگر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کئے جائیں تو اُن کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ختم ہوجاتی ہے مثلاً جو چنار کشمیر سے باہر لے جائے گئے ہیں ان کی چھاؤں پھیلتی نہیں اور ساتھ ہی یہ تناور بھی نہیں ہو پاتے۔ کشمیر میں چنار بیج سے بھی پیدا ہوتا ہے اور شاخیں بھی اگر نصب کی جائیں تو اُگ آتی ہیں۔ یہ چیزیں کشمیر سے باہر کے علاقوں میں نہیں ہوتیں۔

(ج) ماہرینِ نباتات نے کشمیر، فرغانہ (وسط ایشیا) ایران اور یونان کو چنار کا اصلی وطن بتایا ہے۔ کشمیر سے لے کر کاشغر، افغانستان اور سمرقند کے سارے علاقے میں چنار پایا جاتا ہے۔ مگر جس کثرت سے چنار کے درخت کشمیر میں نظر آتے ہیں اتنی کثرت سے یہ پیڑ اور کسی علاقے میں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چنار کے سب سے تناور درخت یا تو ایران میں پائے جاتے ہیں ورنہ کشمیر میں۔ دنیا کا سب سے تناور چنار ایران کے شہر طہران کے مضافات میں کوہ البرز کے پاس ہے۔ اس چنار کا تنا چھیاسٹھ فٹ ہے۔ اس کے بعد اس وقت سب سے موٹا چنار بجبہاڑہ کے باغِ دارا شکوہ میں ہے جس کا تنا ۵۴ فٹ ہے۔ لارنس (۱۸۹۵-۹۵ء) کے زمانے میں لولاب وادی میں ایک ایسا چنار موجود تھا جس کا تنا ساڑھے تریسٹھ فٹ تھا۔ یورپی سیاحوں کے اس بیان میں

کوئی صداقت نہیں کہ کشمیر کو چنار مغلوں کی دین ہے۔ اُن کے اس دعویٰ کو خود مغل مورخین اور شہنشاہ جہانگیر کے بیانات رد کرتے ہیں۔ طبقاتِ اکبری میں لکھا ہے کہ کشمیر میں ایک ایسا چنار موجود ہے جس کے سائے میں دو سو سوار بیک وقت ٹھہر سکتے ہیں۔ شہنشاہ جہانگیر تزکِ جہانگیری میں لکھتا ہے:-

"میں حیدر ملک کے آبائی گاؤں جاڑورہ چکوروں کا شکار کرنے کے لئے گیا۔ یہ جگہ بہت ہی دلکش ہے۔ یہاں ترل ترل بہتی ندیاں اور بلند قامت چنار ہیں۔ شہر سے ڈھائی کوس دور راول پورہ میں ایک چنار کا درخت ہے جس کے تنے کو اندر سے آگ سے کھوکھلا کر دیا گیا ہے۔ پچیس سال پہلے جب میں گھوڑے پر سوار ہو کر یہاں سے گزرا اس وقت میرے ساتھ پانچ گھوڑے اور دو آدمی تھے۔ ہم سبھی لوگ گھوڑوں سمیت چنار کے کھوکھلے تنے کے اندر سما گئے۔ اس کے بعد جب بھی میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو لوگ حیران رہ گئے۔ اب کی بار میں نے پھر کچھ لوگوں کو اس چنار کے کھوکھلے تنے کے اندر جانے کا حکم دیا۔ آخر وہی کچھ ہوا جس کا مجھے پہلے ہی علم تھا۔ اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ میرے والد نے چونتیس افراد کو اس کھوکھلے تنے کے اندر کھڑا رکھا جب کہ اقبال نامہ میں لکھا ہے کہ کھوکھلے تنے میں ستر آدمی سما گئے۔"

چنار کا کشمیر میں موجود ہونا لل دید (چودھویں صدی) کے کلام سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ اپنے ایک واکھ میں اس نے "بوُنۍ" لفظ کا استعمال یوں کیا ہے:-

کیتژن رٔنی چھے شیہج بوُنۍ
نیر وٚہ نبر تہٕ شیہُل کر

ترجمہ:- کچھ لوگوں کے لئے ٹھنڈک پہنچانے والا چنار ہے باہر آ اور اس کی چھایا

سے اپنے آپ کو ٹھنڈک پہنچا۔

ہمارے لوک گیتوں میں بھی چنار کی خوبیوں کی خوب سراہنا ملتی ہے ؎

بٕہ لگے ناوس تہٕ کڈیو غوصہ
وُبقرے توسہٕ بونین تل

ترجمہ: میں تمہاری رنجیدگی کو دور کرنے کے لئے اپنی جان قربان کردوں گی اور چناروں کے سائے میں شاہ توس کا بچھونا بچھاؤں گی۔

جہانگیر اور دوسرے مغل تذکرہ نویسوں کے بیانات اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ قد آور اور تناور چنار کشمیر میں مغلوں سے سینکڑوں سال پہلے موجود تھے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حسن شناس، حسن نواز اور حسن پرست مغلوں نے کشمیر میں چناروں کے باغ لگوائے۔ چنار کے بوٹوں کو دودھ سے سینچا اور اُن کے سائے میں بیٹھ کر زندگی کی لطافتوں سے ہمکنار ہوئے۔ مغل گورنر علی مردان خان (1642ء — 57) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے کشمیر میں کافی تعداد میں چنار کے باغ لگوائے۔

چنار جس کو کشمیر میں "بوُنۍ" یونان میں "دُب" اور انگریزی میں پلین (PLANE) کا نام دیا گیا ہے کو علم نباتات کی زبان میں پلاٹینس اوریئنٹلس (PLANTANUS ORIENTALIS) کہا جاتا ہے جو اس امر کی نشاندہی ہے کہ یہ پیڑ مغرب کو مشرق کی دین ہے۔

چنار یونان اور رومیوں کا سب سے پسندیدہ سایہ دار درخت رہا ہے۔ آج بھی جب ہم فرانس کے شہر مارسیلز پہنچ جاتے ہیں تو سرسبز اور شاداب چنار ہمارا سواگت کرتے ہیں۔ جنوب مغربی یورپ میں چنار یونانیوں کی وساطت سے پہنچا۔

امریکہ میں چنار کی جو قسم اُگتی ہے اس کو پلاٹینس اوکسی ڈنٹل کا نام دیا گیا ہے۔ مگر ماہرینِ نباتات کا خیال ہے کہ چنار کی یہ قسم بھی مشرقی چنار کا ہی پیوندی روپ ہے اور اس کا الگ سے کوئی وجود نہیں۔ امریکہ میں جو چنار اُگتا ہے وہ آب و ہوا اور زمین کی خصوصیت کی وجہ سے تھوڑا سا مختلف ہے مگر ہے چنار ہی۔ وہاں جو چنار اوہیو اور مسس پی کے علاقے میں پایا جاتا ہے وہ قدرے بڑا ہوتا ہے جبکہ کیلی فورنیا اور اری زونا میں یہ پیڑ مشرق کے مقابلے میں چھوٹا ہوتا ہے۔ امریکہ میں اس پیڑ کو سائیکا مور اور بٹن وُڈ کہا جاتا ہے۔ شمالی امریکہ میں اس کا درخت باقی تمام درختوں سے بڑا اور تناور ہوتا ہے۔ وہاں پر اس خاندان کے درختوں کا تنا دس سے چودہ فٹ کے درمیان موٹا دیکھا گیا ہے۔ مگر پچاس سے ستر فٹ کی بلندی تک وہاں یہ پیڑ ٹنڈ منڈ ہوتا ہے۔

یورپ میں چنار کی کئی ایک قسمیں نظر آتی ہیں۔ یونانیوں اور رومیوں کی طرح وہاں اب بھی یہ پیڑ سجاوٹ کے مقصد سے اگایا اور لگایا جاتا ہے۔ یورپ میں چناروں کی نشوونما اور ان کے تحفظ کے لئے خاص کام ہو رہا ہے۔ قسطنطنیہ، روم، وی آنا، برلن، لندن اور پیرس میں چنار کے پیڑ مناظر کو بے حد دلکش بناتے ہیں۔ لندن کا چنار امریکہ اور مشرق کے چنار کو پیوندی طریقے سے ملا کر تیار کیا گیا ہے۔ امریکہ کی سڑکوں کو سایہ دار بنانے کے لئے وہاں چنار کثرت سے لگائے جاتے ہیں۔

صنعتی طور ترقی یافتہ شہروں میں چنار ماحول کی آلودگی کو کم کرنے میں کافی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے ہموار پتوں کو بارش کا پانی آسانی سے دھو لیتا ہے۔ اس کے پتوں کی یہ بھی خاصیت ہے کہ یہ برسوں تک سڑتے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چند سال پہلے تک مکان بناتے وقت لکڑی کے فرش

پر چنار کے پتوں کی ایک موٹی تہہ بچھائی جاتی تھی اور اس تہہ پر مٹی ڈال کر لپائی کی جاتی تھی۔ دور دراز دیہات میں یہ سلسلہ اب بھی قائم ہے۔

چنار کشمیر کے حُسن و جمال کی علامت بھی ہے اور ہمارے تمدنی مزاج کا نقیب بھی۔ آج جب کہ ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لئے عالمی سطح پر سرگرم مہم چل رہی ہے چنار ایک مسیحا کی طرح آلودگی کے اثرات کو جذب کر کے جنت نظیر کشمیر میں آبِ حیات کی بارش کر رہا ہے۔

اس کی چھال خود بخود اُکھڑ جاتی ہے جس کے نتیجے میں پیڑ کے تنے پر کسی قسم کی غلاظت جمنے نہیں پاتی۔ کشمیر میں بہت دنوں سے چنار کو شاہی پیڑوں کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ مگر گذشتہ کئی سالوں سے جس بیدردی اور بے حسی سے چناروں کو کاٹا، اُکھاڑا اور سُکھایا جا رہا ہے اس کی نظیر شاید ہی تاریخ میں مل سکتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے چنار کے پیڑ لگا کر کشمیر کے لاہوتی حُسن کی پرورش کی ہے۔ ہم ہیں کہ چناروں کو کاٹ کر نہ صرف ماحول کا توازن بگاڑ رہے ہیں بلکہ مستقبل کو بھی تاریک بنا رہے ہیں۔

آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چنار کا ذکر شری کنٹھ چیرت میں بھی آیا ہے مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ماہرین ارضیات کو علاقہ ترال میں چنار کا ایک فوسل (Fossil) ملا ہے جو سات لاکھ سال پرانا ہے۔ کشمیر کے دوسرے علاقوں میں اخروٹ، سفیدے، بید، آلوچہ وغیرہ کے ایسے آثار ملے ہیں جن کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب درخت کشمیری الاصل ہیں۔

جی۔ ایم آزاد

ہانگل

کشمیری ہانگل (بارہ سنگا) ایک منفرد جنگلی جانور ہے جو کشمیر سے باہر یا اس کے قرب و جوار میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ہاں یورپ کا لال بارہ سنگا کشمیر کے ہانگل سے ملتا جلتا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصّوں میں پائے جانے والے بارہ سنگوں سے مختلف ہونے کے باعث اس کی افادیت اور اہمیت جانوروں سے متعلق سائنس کے شعبے میں کافی اہم اور ٹھوس ہے۔ کئی سینگوں والے اس مخصوص جانور کو سینگوں ہی کی وجہ سے کشمیری میں "ہانگل"[1] کا نام دیا گیا ہے جو اس کے سائنسی نام CER-VUSELAPHUS کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے اور اسی سے اب اس کا پورا سائنسی نام CERVUSELAPHUS HANGLU ہے۔ جب بھی اس نام کی بھنک ہمارے کان میں پڑتی ہے تو ہماری توجہ کشمیر کے بارہ سنگے کی اور جاتی ہے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اتنا نادر ہونے کے باوجود بھی بارہ سنگوں کی تعداد باقی جنگلی جانوروں کے مقابلے میں گھٹتی جا رہی ہے۔ اور اگر کچھ سال پہلے حکومت

---

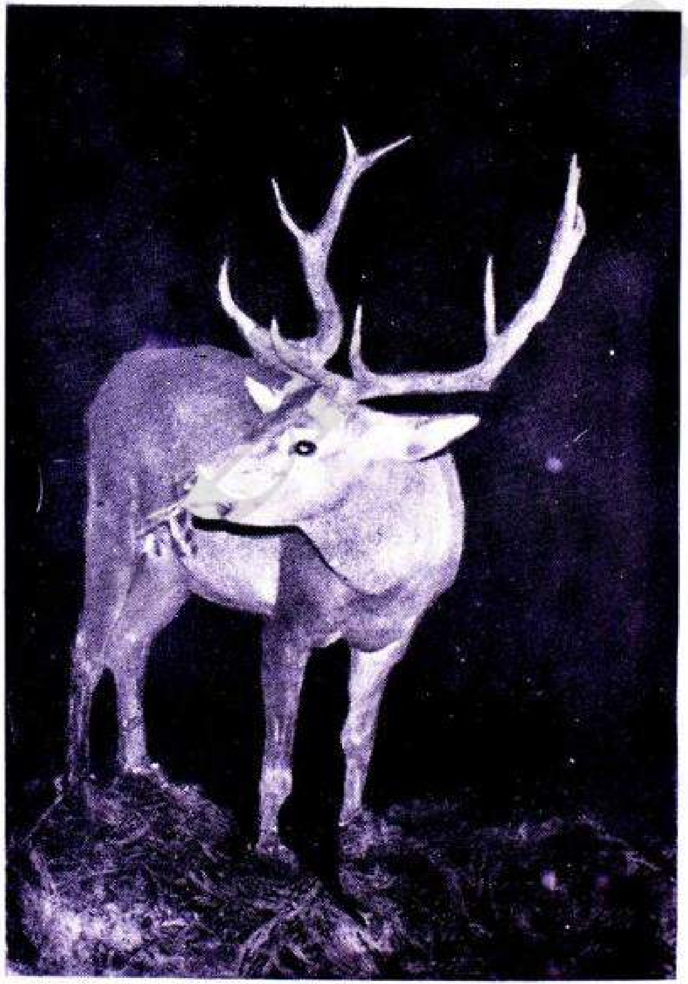
[1] ہشنگل (یعنی سینگوں والا) جو بعد میں ہانگل ہو گیا۔

بارہ سنگا کے تحفظ کیلئے اقدامات نہیں کرتی تو اس وقت دنیا میں یہ جانور کم و بیش ناپید ہو گیا ہوتا۔ کیوں کہ بارہ سنگوں کا اندھا دھند شکار، چوری چھپے حملے اور بارہ سنگوں کی پناہ گاہوں میں تبدیلی نے اس جانور کا وجود ہی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ جنگلوں کی بے تحاشہ کٹائی اور جنگلوں کے اندر تک گاڑیوں کی آمد و رفت نے اس معصوم جانور کو لرزہ براندام کیا تھا۔ ساتھ ہی تحفظ کے فقدان اور غذا کی کمی نے بھی بارہ سنگوں کی آبادی میں غیر معمولی کمی کو ہوا دی تھی۔ حیوانات سے متعلق تحقیق کے مطابق دنیا میں بارہ سنگوں کی ۳۰ قسمیں ہیں اور کشمیر میں جو بارہ سنگا ملتا ہے وہ اور کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اسی لئے دنیا کے لوگ اس نادر روزگار جانور کو عجائبات کشمیر میں شمار کرتے ہیں۔ ماہروں کی رائے ہے کہ کشمیری بارہ سنگے کی شکل و صورت اپنے ارتقائی عمل کی آخری منزل تک پہنچ گئی ہے اور شاید اسی لئے کشمیری ہانگل بارہ سنگوں کے خاندان میں ممتاز مانا جاتا ہے۔ کشمیری بارہ سنگا (CERVUSELAPHUS-HANGLU) خاندانی اعتبار سے جانوروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جس قبیلے کے بچے دودھ پی کر جوان ہوتے ہیں۔ بارہ سنگے کا بچہ ماں کے تھن بالکل اسی طرح چوستا ہے جس طرح گائے کا بچھڑا۔ مادہ بارہ سنگے کو کشمیری میں "مِنہ مُر" کہتے ہیں۔ اس کے سینگ نہیں ہوتے مگر گائے کی طرح اس کے بھی چار تھن ہوتے ہیں۔ مِنہ مُر دو سال کے وقفے کے بعد بچہ دیتی ہے اور ایک وقت ایک ہی بچہ جنتی ہے۔

اپنے قبیلے کے دوسرے جانوروں کے مقابلے میں ہم ہانگل کو دور سے پہچان سکتے ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اس کے سر پر دو نوں اور دو سینگ ہوتے ہیں جو اس کے جنم کے دو سال بعد نکلتے ہیں۔ سینگوں کی لمبائی ایک جیسی ہوتی ہے۔ ایک سال اور گزرنے پر پرانے دو سینگ گر جاتے ہیں اور نئے چار سینگ نکل

آتے ہیں۔ سینگ نکلنے کا یہ عمل چھ سال تک جاری رہتا ہے اور بعد میں رُک جاتا ہے۔ جب بارہ سنگے کی عمر آٹھ سال ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کے بارہ سینگ ہوتے ہیں۔ اس کے بنیادی سینگوں کی لمبائی سوا چار فٹ تک ہوتی ہے۔ بارہ سنگا کے گرے ہوئے سینگ جمع کئے جاتے ہیں جو یونانی دوائیوں کے ساتھ ملائے جاتے ہیں۔ انہیں رگڑ کر تیار کیا ہوا مالیدہ دوائی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن کہیں یہ سینگ گھروں میں آرائش کے طور پر سجائے جاتے ہیں۔ سر پر سینگوں کی پیڑھی سی اٹھائے ہوئے بارہ سنگا دیکھنے میں کافی خوبصورت لگتا ہے۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ ۱۵ سال ہوتی ہے اور وزن لگ بھگ ۴۵۰ پونڈ (۲۰۵ کلو) تک ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی لگ بھگ چھ فٹ ہوتی ہے۔ اس کا رنگ سیاہی لئے مٹیالا سا ہوتا ہے۔ اس کی کھال پر کافی گھنے بال اُگتے ہیں۔ چہرہ بالکل گائے کی طرح لمبا ہوتا ہے۔ کان بڑے اور ایستادہ ہوتے ہیں۔ جب بھی کسی انسان یا چیز کی چھایا اس کے جسم پر پڑتی ہے تو اس وقت اس کی حس آگہی اس کی معصومیت کا احساس دلاتی ہے۔ چھوٹے بچوں کی کھال پر چیتے کی طرح چھوٹے چھوٹے دھبے سے ہوتے ہیں جو چمکیلے نہیں ہوتے۔

چند سال پہلے ہانگل کشمیر کے اردگرد کے جنگلوں میں قلانچیں بھرتے ہوئے پایا جاتا تھا مگر اب حالات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ایک وقت جو کوئی چاہتا اس کا شکار کرتا یا دوسرے جنگلی جانور اسے مار ڈالتے۔ پھر حکومت نے پوری طرح محسوس کیا کہ کشمیر کو یہ قدرت کی طرف سے دیا ہوا ایک انمول تحفہ ہے' اور اس کا شکار کرنے پر پوری طرح پابندی عائد کی گئی اور جنوری ۱۹۷۹ء میں J&K WILD LIFE ACT کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ایکٹ کے مطابق جس آدمی کو ناجائز طریقے پر بارہ سنگے کا شکار کرتے پایا جائے اُسے دو سال قید با مشقت



ہانگل

اور سات ہزار روپے کا نقد جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ سب اقدامات بارہ سنگوں کی نسل کو بڑھاوا دینے اور انہیں ہر قسم کا تحفظ دینے کے لئے اٹھائے گئے ہیں۔

داچھی گام کو ایک محفوظ جنگلی پارک قرار دیا گیا جہاں بارہ سنگوں کی تعداد بڑھانے کے لئے خاص اقدام کئے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں کشمیر میں بارہ سنگوں کی تعداد ۳۰۰۰ تھی اور ۱۹۷۰ء میں یہ تعداد گھٹ کر ۱۴۰ سے ۱۷۰ کے درمیان رہ گئی تھی۔ داچھی گام کے علاوہ بارہ سنگا کشمیر میں سندھ وادی، ترال شکارگاہ، دور، لیدر وادی (پہلگام)، بانڈی پورہ، و سوکشتواڑ، دراس اور لولاب کے جنگلی علاقوں میں موجود ہیں۔ ایک سروے کے مطابق اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان جگہوں پر اس وقت تقریباً ۶۰ ہانگل موجود ہوں گے۔ ریاستی حکومت اور جنگلی جانوروں سے متعلق محکمے نے جو اقدام بارہ سنگے کی نسل کو بڑھاوا دینے کے سلسلے میں اٹھائے ہیں ان کے تحت ۱۹۷۰ء میں IVNC اور WWF کے اشتراک سے یہ پروجیکٹ ہاتھ میں لیا گیا۔ داچھی گام پارک، جسے کچھ عرصہ پہلے قومی پارک کا درجہ دیا گیا، اب بارہ سنگے کی مستقل قرارگاہ ہے۔ اگرچہ وہاں اور بھی جنگلی جانوروں کی نسل کو تحفظ دیا جاتا ہے مگر بارہ سنگے کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اس کی غذا جنگلی میوے اور ایک قسم کا پھل "ہانہ ڈون"[1] ہے جو یہ زیادہ پسند کرتا ہے۔ گرما میں یہ دونوں چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔ مگر سرما کے لئے اس کی خوراک کا انتظام متعلقہ محکمہ خود کرتا ہے۔ سرما میں بید کے پتے، آلو، شلغم اور شلغم کے سبز پتے اور ایک قسم کا نمک، جو اس کی صحت کیلئے موزون ہے، اسے کھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے مہاراجہ کشمیر بارہ سنگے کا شکار کرنے کے علاوہ اس کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔ بارہ سنگوں کے

[1] سرجارج گریرسن نے اسے "ہانک ڈون" یعنی Aesculus Indica یا Pavia

لئے شلغم کی کاشت کی جاتی تھی۔ داچھی گام کے موجودہ پارک کی جگہ دس چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ مہاراجہ نے وہاں کے لوگوں کو دوسری جگہ منتقل کرکے آباد کیا اور اس خوبصورت جگہ کو جنگلی جانوروں، خاص کر بارہ سنگے کے لئے مخصوص رکھا۔ جب سے یہ علاقہ حکومت نے اپنی تحویل میں لیا ہے تب سے بارہ سنگوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں ہر سال بارہ سنگوں کی گنتی ہوتی رہتی ہے۔ مندرجہ ذیل چارٹ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ بارہ سنگوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ہے:-

سال	تعداد
۱۹۷۵ء	۲۰۰
۱۹۷۷ء	۲۵۰
۱۹۷۸ء	۳۲۰
۱۹۸۱ء	۳۴۷
۱۹۸۲ء	۴۳۰
۱۹۸۳ء	۴۸۲
۱۹۸۴ء	۵۵۶

بارہ سنگا بہت ہی صفائی پسند جانور ہے۔ انسان کی طرح بارہ سنگا بھی صاف ستھری جگہ رہنا پسند کرتا ہے۔ مکھیاں تو اسے بالکل برداشت نہیں ہوتیں اور جس جگہ مکھی یا اور کوئی گندگی ہو یہ کبھی اس جگہ کا رخ نہیں کرتا۔ بارہ سنگا پیشاب بہت احتیاط سے بکھیرتا ہے۔ اسے معتدل آب و ہوا راس آتی ہے۔ کشمیر کا موسم اس کے لئے بہت ہی موزون ہے۔ کشمیر میں اس جانور کے پنپنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہاں کی آب و ہوا معتدل ہے اور یہاں جنگلوں کا ماحول کثافت

سے پاک ہے۔ کشمیر میں بارہ سنگے کی تاریخ کتنی پرانی ہے، اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ کشمیر کیسے آیا یا کشمیر میں کیسے پیدا ہوا، اس کے بارے میں بھی کچھ کہنا ابھی ناممکن ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بارہ سنگا کشمیر کے قدیم جانوروں میں سے ایک ہے۔ دنیا میں جتنے بھی نر بارہ سنگے ہیں انہیں انگریزی میں STAG کہا جاتا ہے۔ اور اردو میں بارہ سنگا۔ یعنی بارہ سینگ والا جانور۔

کشمیری ڈکشنری میں "ہانگل" لفظ کا ماخذ دیا گیا ہے اور معنی میں متعدد سینگ لئے ہوئے ایک جنگلی جانور۔ اس کے سینگوں کے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ شمشیر یا چاقو کا دستہ بنانے کے کام آتے ہیں۔ یا اسے رگڑ کر یا پیس کر دوا کے طور بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کشمیریوں کا یہ توہم بھی بارہ سنگے سے منسوب ہے کہ جہاں بارہ سنگے کا سینگ رکھا جائے وہاں تک آفات کی رسائی نہیں ہوتی۔ بارہ سنگے کی کھال کو سجاوٹ کے لئے دیواروں پر چسپاں کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال "جانماز" اور "آسن" کے طور پر بھی ہوتا ہے۔ کشمیری ادب اور خاص کر لوک ادب میں بارہ سنگے کا ذکر کافی نفاست کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کچھ محاوروں اور ضرب الامثال میں بھی بارہ سنگے کا نام علامتی انداز میں کیا گیا ہے[1]

○ — (کشمیری سے ترجمہ؛
مترجم: وجیہ ساقی)

---

[1] مثلاً "ہانگل سندی ہتھ وچھن" ۔ "ہانگلو کرو شپہ ستی داو"، لفک گوم تسلا گاٹہ موہاو" وغیرہ
(ادارہ)

بشر بشیر

قالین بافی و نمدہ سازی

کشمیر کی دستکاریوں میں قالین بافی اس لحاظ سے کافی اہمیت کی حامل رہی ہے کہ اس سے یہاں کے لوگوں کی معاشی زندگی سنوارنے میں کافی مدد ملی ہے اور اس وقت بھی اچھی خاصی تعداد میں کشمیری اس صنعت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ وابستہ ہیں۔ چنانچہ اخبار "ٹائمز آف انڈیا" مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۹ء میں کشمیری قالین بافوں کی ایسوسی ایشن کے صدر ایم۔ وائی۔ شیخ کے بیان کے مطابق اُس وقت وادی میں قالین بُننے کے لوموں کی تعداد دس ہزار تھی جب کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اُس وقت کشمیر میں تیس ہزار قالین بُننے کے لوم قائم تھے۔ ہینڈی کرافٹس محکمہ کے ریکارڈ کے مطابق سال ۷۹-۱۹۷۸ء کے دوران ۱۰ء۱۲ کروڑ روپیہ کی مالیت کے قالین برآمد کئے گئے۔

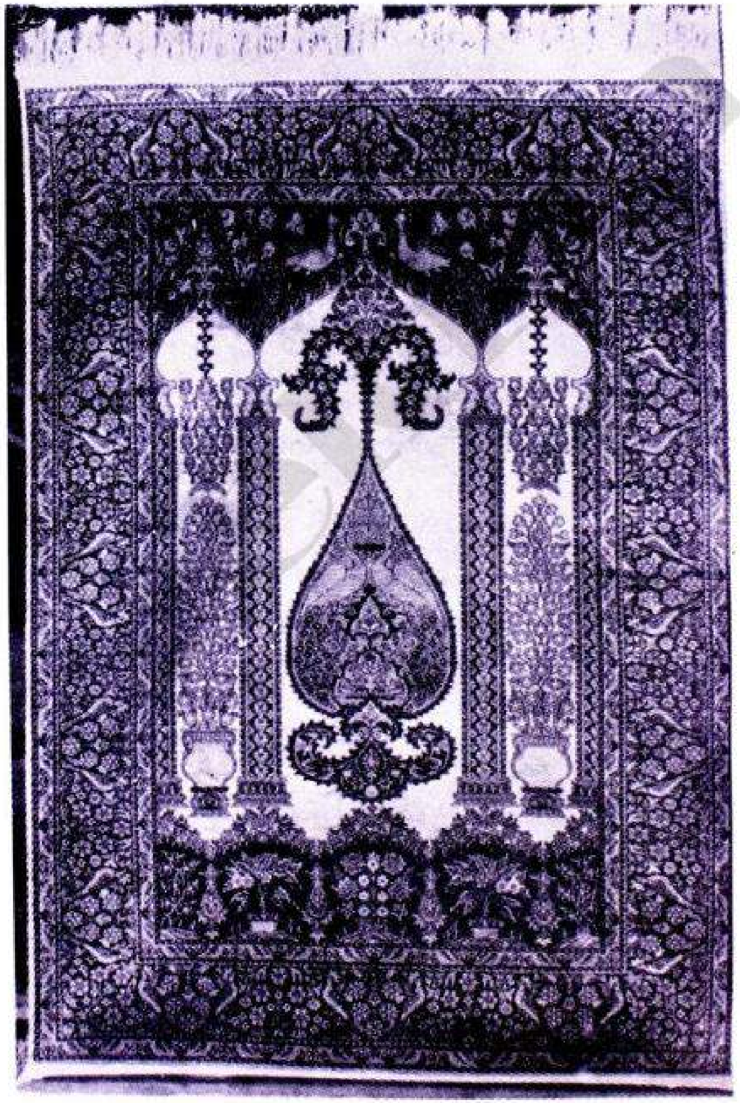
قالین اور نمدہ دونوں ہی بنیادی طور آرائشی اشیاء ہیں۔ لہٰذا فن کے نمونے بھی ہیں چنانچہ مشرق میں اس دستکاری نے وہی فنی اظہار اور اہمیت حاصل کی جو مغرب میں مصوری کے فن کو ہے۔ قبل اس کے کہ ہم کشمیر میں قالین بافی اور نمدہ سازی کے متعلق کچھ کہیں، مناسب یہی ہوگا کہ عالمی پس منظر میں اس کے متعلق

کچھ باتیں ہوجائیں۔

اگرچہ قالینوں کے بے شمار ڈیزائن آج بھی دستیاب ہیں تاہم عام طور پر قالین اور نمدہ کے ڈیزائنوں کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ ایک حاشیہ یا سرحد اور دوسرا متن یا اندرونی حصّہ۔ گویا حاشیہ متن کے حصّے کا ایک قسم کا فریم ہے۔ عام طور حاشیہ کا حصّہ سادہ ہوتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اس میں ایک ہی رنگ کا تار و پود استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے حاشیہ سے متضاد ہونے کی بنا پر متن کا حصّہ نمایاں طور پر اُبھر کر اس کے حُسن و زیبائش میں اضافہ کرتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی تک قالین اور نمدوں کے لئے سبزیوں اور کیڑے مکوڑوں سے حاصل شدہ رنگ استعمال کئے جاتے تھے یا اس مقصد کے لئے ان رنگوں کو استعمال کیا جاتا تھا جو ان ہی رنگوں کی آمیزش سے تیار کئے جاتے تھے۔ یورپ میں جب رنگ بنانے کے نئے تجربات کئے گئے تو اس کے بعد ہی یعنی ۱۸۶۰ء کے بعد مشرق میں نت نئے رنگوں کے ڈیزائن قالینوں اور نمدوں کی زیبائش میں اضافہ کرتے رہے۔ اس طرح سے اس قسم کی مصنوعات میں گہرے تیز رنگوں کا استعمال ہونے لگا۔

قالینوں اور نمدوں کا خام مواد اُون ہے۔ اگرچہ کئی صورتوں میں سوت کو بھی اس صنعت میں کام میں لایا گیا ہے اور بعض قالینوں میں ریشم کے تار بھی اُون کے بدلے کام میں لائے گئے۔ چنانچہ سولہویں اور سترہویں صدی میں ایران میں ریشم کے قالین بنائے جاتے تھے جس کا رواج اب بھی کشمیر میں ہے۔ یہاں پر یہ کہنا ضروری ہے کہ اکثر قالینوں میں سوت کے تار کا استعمال ہوتا ہے جبکہ پود ریشم، اون یا سوت کی ہوا کرتی ہے۔ اس بات کا ذکر کرنا بھی نامناسب نہیں کہ قالین بافی کی اصطلاح



معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود —— کشمیری قالین کا ایک شاندار نمونہ

میں پود اُس دھاگے کو کہتے ہیں جو قالین کی بنیادی تہہ بُننے میں کام آتی ہے یا جس سے کہ باہر کے نمایاں اُبھرے ریشے بُنائی کے دوران بند کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ دھاگا بھی سوت کا ہی ہوتا ہے۔ بہت سے قالینوں میں سونے اور چاندی کے تار بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اُنیسویں صدی میں جُوٹ بھی مشینی قالینوں میں استعمال کیا گیا۔ اس وقت عالمی سطح پر جس نوع کے قالین دنیا کے مختلف ممالک میں پائے جاتے ہیں انہیں چھ بڑے گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ترکی، کاکاسی، ایرانی، وسط ایشیائی، ہندوستانی اور چینی۔ ان بڑے گروپوں میں کچھ چھوٹے چھوٹے گروپ بھی ہیں جن کی اپنی مخصوص حیثیت اور انفرادیت ہے۔ اگرچہ قالینوں کا رواج بہت پہلے سے رہا ہے تاہم چند تاریخی دستاویزات کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں سائرس کے دور میں قالینوں کی بُنائی اور استعمال ہوتا تھا۔ بہت کم عرصہ ہوا کہ ۱۹۴۹ء میں ایک روسی آرکیالوجسٹ روڈنکی (RODENKEI) نے منگولیا کی سرحدوں کے نزدیک سائبیریا کے التائی (ALTAI) پہاڑوں میں پزریک (PAZYRYK) نامی جگہ پر کچھ قالین کے ٹکڑوں کو دریافت کیا جن کے متعلق اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ دو ہزار چار سو سال پرانے ہوں گے اور برف میں رہنے کی وجہ سے آج تک موجود رہے ہیں۔ اس قیاس آرائی سے قطع نظر یہ بات واضح ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں کچھ قالین بنائے گئے ہیں جن میں ایرانی شہنشاہ خسرو کے دور کا ایک بڑا قالین بھی ہے جس میں سونے، چاندی اور دوسرے قیمتی پتھروں کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ اس میں ایک ایسے باغ کا نقشہ اُبھارا گیا ہے جو بادشاہ کو جاڑے میں بھی بہار کا احساس دلا سکتا تھا۔

ایرانی قالین اندرونی نقش ونگاری، ترتیب اور ڈیزائنوں کے لئے مشہور

ہیں۔ میخانہ اور میخانہ کے مختلف رنگ اور آداب سولھویں صدی کے نمدوں اور قالینوں کی نقش ونگاری میں اظہار پا چکے ہیں۔ یہ ڈیزائن ابتدائی طور چھٹی صدی قبل مسیح سے پہلے چاؤ دور حکومت میں چین میں شروع کئے گئے اور ہان خاندان کے دورِ حکومت (۲۰۲ ق۔م ــــ ۲۲۰ ق۔م) میں انہیں عروج حاصل ہوا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں اس قسم کی ڈیزائن کاری میں اور بھی پیش رفت ہوئی جب شاہ عباس کے وقت اس فن کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ چنانچہ ترکی قالینوں کی بناوٹ بہت حد تک ایرانی نقش ونگاری سے متاثر ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن رنگوں کی سادگی میں ترکی (خاص طور اُساک اور مغربی اناتولیہ) کے نمدے اور قالین بہت مشہور اور خوبصورت ہیں۔ برصغیر، خاص کر ہندوستان میں جو نقش ونگاری قالینوں اور نمدوں پر ملتی ہے اس میں چاند اور سورج کی مختلف شکلیں اور رنگ بھی نظر آتے ہیں۔

قدرتی مناظر خاص طور باغ و بہار، سرو، پھلواریاں وغیرہ تقریباً ہر جگہ ایسی آرائشی اشیأ پر نظر آتی ہیں۔ بید اور یاسمن کے پودوں کی تصاویر شاہ عباس کے دور کے نمدوں اور قالینوں پر ملتی ہیں لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گلاب، جو کہ پھولوں کا بادشاہ تصوّر کیا جاتا ہے، تقریباً انیسویں (۱۹) صدی تک قالین اور نمدوں کی ڈیزائن کاری میں مفقود تھا۔ یہ صحیح ہے کہ سولھویں صدی میں اس پھول کو یورپ میں قالینوں اور نمدوں پر اُبھارا گیا لیکن انیسویں صدی کے آخر میں یہ ایرانی نقش ونگاری پر حاوی ہو گیا۔ باغ وشکار کے مختلف پہلو جن میں ایک طرف بلبل، مور، شیر، ریچھ، ہرن اور مچھلی کی عکاسی ملتی ہے، دوسری طرف شکاری اور تیر کمان وغیرہ اور اس قسم کی صنعتی اشیأ ظاہر کی گئی ہیں۔ اسی طرح موسیقی کے مختلف آلات اور موسیقار، ساقی، پیمانہ و مے خوار وغیرہ کی بھی قالینوں

اور نمدوں پر عکاسی کی گئی ہے۔ عام طور سے ایسے نقشے علامتی معنی رکھتے ہیں۔ چنانچہ قالینوں میں استعمال کئے گئے مختلف رنگ بھی بجائے خود علامتی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ سب سے بہترین قالین کا نمونہ اردابیل (۱۵۳۹-۴۰ء) مانا جاتا ہے جو اس وقت وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم میں موجود ہے۔ اس پر جو چار کنول اور ان کے ارد گرد پانی کا تالاب اور کنارے کی عکاسی ماہرین کے مطابق سورج اور بارش کی علامات ہیں۔ اس قالین میں اون اور ریشم کیا گیا ہے۔ ۳۴ فٹ لمبے اور ۱۷½ فٹ چوڑے اس قالین میں ۳۸۰ ریشے فی مربع انچ کے حساب سے لگے ہیں جو کہ کل ملا کر تین کروڑ پچیس لاکھ اٹھاون ریشے بنتے ہیں۔ یہ قالین اردابیل نام کی مسجد کے لئے مقصودی کاشانی نے بنایا تھا۔ یہ مسجد ایران کے آذربائیجان میں واقع ہے۔ وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم کے لئے اسے دو ہزار پونڈ کے عوض خریدا گیا ہے۔ دنیا کے چند مشہور قالینوں میں سے چند ایک یہ ہیں۔

ایران کا وہ قالین جس کا نصف حصہ پولینڈ کے کراکاو گرجا گھر (Krakow Cathedral, Poland) اور نصف مسیڈس آرٹس ڈیکوریٹیفس Musaedes Arts (Decoratifs) میں موجود ہے یا انیسویں صدی کا الہالت قالین جو اپنے مالک کے نام پر مشہور ہے جو کہ الہالت کا شہزادہ تھا اور اب نیویارک کے میٹروپالیٹن میوزیم میں ہے۔

جیسا کہ پہلے ہی کہا گیا کہ نمدہ اور قالین دونوں آرائشی اشیاء ہیں، یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر قالین مساجد اور شاہی محلوں کے لئے بنائے گئے ہیں چنانچہ کاشان میں شاہی محل کے لئے شاندار قالین بُنے گئے ہیں۔ ۱۸۷۸ء میں پیرس میں ان صنعتی اشیاء کی ایک نمائش ہوئی جس میں چند ایسے قالینوں کو

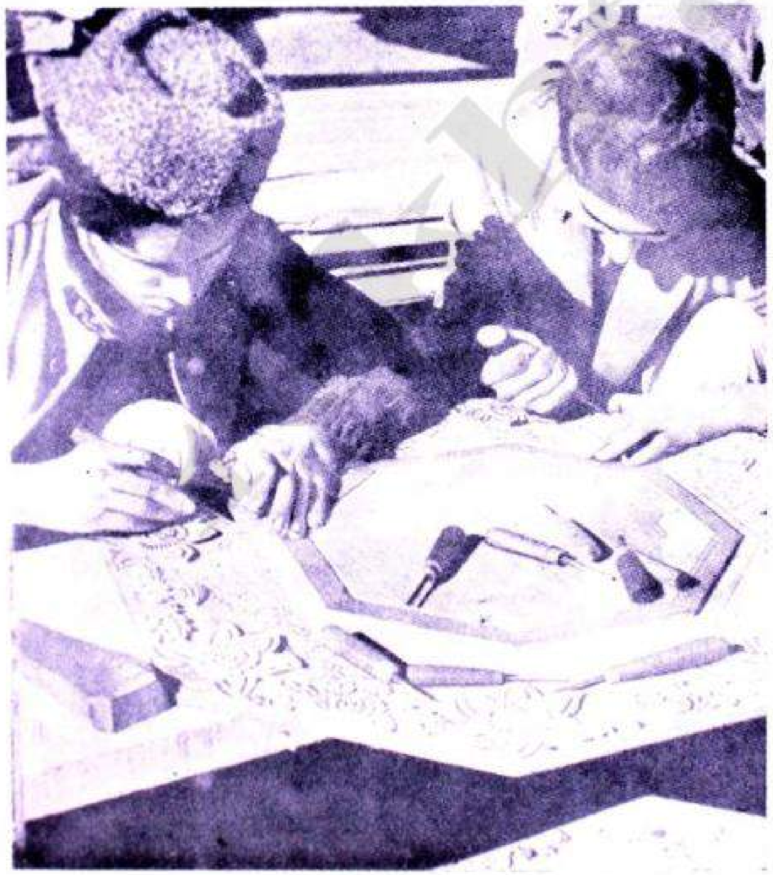
بھی رکھا گیا تھا جن میں سونے اور چاندی کے تاروں کا بھی استعمال کیا گیا تھا اور جن کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ یہ پولینڈ میں تیار کئے گئے ہیں کیونکہ اٹھارویں صدی میں یہ پولینڈ سے ہی فرانس برآمد کئے گئے تھے اور اُس وقت تک ایرانی قالینوں کے اس طرح کے نمونے دریافت نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں جب ایرانی قالینوں کے ایسے نمونے برآمد ہوئے تو ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ ان قالینوں کا اصل وطن کاشان یا اصفہان ہے۔ ہرات کے قالین بھی کافی مشہور تھے۔ ہندوستان میں ان کی زبردست مانگ تھی کیونکہ یہاں کے شہزادے انہیں کافی پسند کرتے تھے۔ مختلف خطوں میں تیار کئے گئے قالینوں کے ڈیزائنوں کی ایک دوسرے پر اثراندازی یا یکسانیت کی بناء پر ہم مشکل سے ہی کسی خاص خطے یا ملک کے قالینوں اور نمدوں کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے ہیں۔ اس بات کی طرف گائیڈ ٹو وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم لندن (Guide to Victoria and Albert Museum London) میں بھی واضح اشارہ ملتا ہے۔ سپین، انگلستان اور فرانس بھی قالین بافی کے اہم مراکز رہے ہیں۔ ۱۷۰۰ عیسوی کے ساتھ ساتھ یورپ میں مشینوں کے ذریعے قالینوں کی بنائی شروع ہوئی۔

جس طرح ایرانی قالین اندرونی نقش و نگاری، ترتیب اور ڈیزائنوں کے لئے مشہور ہیں اسی طرح ترکی قالین خاص کر اُساک اور مغربی اناتولیہ کے قالین اپنے رنگوں، خوبصورتی، سادگی اور کلاسی رنگوں کے ملاپ و ترتیب اور اون کے لئے مشہور ہیں۔

ایشیا کے باقی ملکوں کی نسبت ہندوستان میں قالین اور نمدوں کی اہمیت قدرے کم ہے شاید اس لئے کہ یہ یہاں کے موسمی حالات سے مطابقت نہیں



ایک معمّر قالین باف محوِ کار



اخروٹ کی لکڑی پر نقاشی

رکھتے۔ لیکن مغل بادشاہوں کی جمال پسندی کی وجہ سے اس صنعت کو یہاں کافی عروج حاصل ہوا۔ چنانچہ شاہ جہاں نے اپنے محل کے لئے شاندار قالین بنوائے تھے جن کے لئے کشمیر سے اُون لایا گیا تھا۔ اگرچہ ہندوستانی قالینوں پر مشرقی ایرانی قالین بافی کی صنعت کا نمایاں اثر ملتا ہے تاہم اس کی اپنی منفرد خاصیتیں بھی ہیں۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں لاہور، آگرہ، مرزاپور، امرتسر، مرزاپور، مرادآباد، بیکانیر۔ فتح پوری، مسولی پٹانم اور وارنگل قالین بُننے کے اہم مرکز رہے ہیں۔ ایرانی اثرات اور منفرد علاقائی خاصیتوں کے میل سے جو ڈیزائن قالینوں پر ترتیب پائے انہیں ہند ایرانی بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمل دیوی چٹوپادھیائے نے ہندوستانی قالینوں سے متعلق اپنی مشہور کتاب میں ہند اصفہانی، ہند فراغانی، ہند کرمانی، ہند تبریزی وغیرہ ناموں سے مختلف قسموں کے ڈیزائنوں کے قالینوں کا ذکر کیا ہے۔

کشمیر میں قالین بافی اور نمدہ سازی کا آغاز سلطان زین العابدین بڈشاہ کے دورِ حکومت (۱۴۲۰ – ۱۴۷۰ء) سے ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۳۹۷ء میں تیمور ایران اور ترکستان فتح کرنے کے بعد ہندوستان کی طرف بڑھا۔ اُس وقت کشمیر کا حکمران سلطان سکندر تھا، جس نے اپنی طرف سے ایک وفد امن کا پیغام لے اس کی راہ میں بھیج دیا۔ تیمور اس فراخدلی پر کافی خوش ہوا اور سکندر کے نام تحفہ بھیجدیا۔ اس سے سلطان سکندر کو کافی خوشی ہوئی لہٰذا تیمور کی ہندوستان سے واپسی کے دوران اُس سے ملنے کے لئے گیا لیکن تیمور اپنی فوج سمیت پہلے ہی سے وہ پڑاؤ کوچ کر گیا تھا۔ لہٰذا سلطان سکندر کو واپس آنا پڑا اور یہاں سے اپنے بیٹے شاہی خان (جو بعد میں زین العابدین بڈشاہ کے نام سے مشہور ہوا) کو سمرقند بھیجا۔ وہاں اس کی کافی قدر ہوئی یہاں تک کہ وہ کئی سال یعنی ۱۴۰۵ء تک

بادشاہ سے اپنے وطن کشمیر واپس جانے کی اجازت نہ مانگ سکا۔ اس دوران سمرقند فن اور تجارت کا کافی اہم مرکز تھا۔ شاہی خان خود بھی فن کا کافی دلدادہ تھا چنانچہ ۱۴۲۰ء میں جب وہ تخت نشین ہوا تو اُس نے سمرقند سے کافی کاریگر کشمیر بلوائے جن میں زین گر، بندوق ساز، لوہار، موسیقار، سنگتراش، جلدساز، پیپر ماشی کے ماہر، کاغذ ساز اور قالین باف بھی شامل تھے۔ اس طرح سے کشمیر میں قالین بافی کا آغاز بڈشاہ کے دور سے ہوا۔ اگرچہ بڈشاہ کے بعد بہت سے کشمیری اس پیشہ سے وابستہ رہے لیکن مختلف بادشاہوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے یہ صنعت بہت وقت انحطاط پذیر ہوئی۔

۱۶۱۴ء میں کشمیر میں اس صنعت کو فروغ دینے کی از سرِ نو کوشش شروع ہوئی۔ یہ قابلِ تعریف کوشش آخون رہنما نامی ایک شخص نے کی۔ اس دوران احمد بیگ خان کشمیر کا گورنر تھا جسے مغل بادشاہ جہانگیر نے اس عہدے پر فائز کیا تھا۔ آخون رہنما حج بیت اللہ سے واپسی پر ایران کے راستے واپس کشمیر آیا اور ایران سے اپنے ساتھ چند قالین بُننے والوں کو یہاں لے آیا جنہوں نے یہاں کے چند افراد کو اس ہُنر کی تربیت دی۔ آخون رہنما کو وفات کے بعد سرینگر شہر کے گوجوارہ محلے میں دفن کیا گیا۔

کشمیر میں قالین بافی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں اپنے عروج کو پہنچی۔ کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ کو کشمیر آنے کا زبردست شوق تھا جو کہ عمر بھر پورا نہ ہو سکا۔ موسم بہار میں بادام کے پھولوں کا نظارہ کرنے کا اُس نے اشتیاق ظاہر کیا تھا چنانچہ اس کے گورنر کرنل میاں سنگھ (۱۸۳۴ - ۴۱ء) نے اُسے سبز رنگ کا ایک قالین تحفتہً بھیجا۔ اس قالین پر گلابی رنگ کے بیل بُوٹے کھِل کھلاتے، برجستہ اور شگفتہ بادام کی کیاری جیسا نظارہ پیدا کر دیتے تھے۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور میں یہ قالین دیکھا تو وہ انتہائی خوش ہوا۔ حتیٰ کہ اُس نے اس قالین کو

اپنے اوپر لپیٹا اور اس کے سمیت کروٹیں لیتا رہا۔ اس قالین کے تیار کرنے والوں فضل خان، جبار خان اور کمال جو کو انعام کے طور سونے کے ڈھیلے عطا کئے گئے۔

آرائشی شئے ہونے کے ساتھ ساتھ قالین کئی اعتبار سے ایک کارآمد چیز ہے۔ یہ حرارت حاصل کرنے کا ایک اچھا وسیلہ ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ذاتی تخیل اور فنکارانہ صلاحیتوں کے اظہار کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ قالین بافی یہاں کی اقتصادی اور معاشی زندگی کی ترقی کا ایک عمدہ ذریعہ رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت دیر تک ہمارے کاریگر اسے ایک معاشی وسیلہ کے طور اپنانے سے تب تک گریز کرتے رہے جب تک کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انہیں اس کی خاطر مجبور نہ کیا۔ اس کی شاید یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک کشمیری شالبافی کو ہی سب سے زیادہ منافع بخش دستکاری سمجھتے تھے اور اس میں بنیادی کاریگر کو کوئی انوسٹمنٹ (Investment) کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہندوستانی قالین کی عالمی مارکیٹ میں زبردست مانگ تھی جس کے پیشِ نظر مہاراجہ کو اسے کشمیر میں رائج کرنے کی سوجھی۔ اُدھر جب شالبافی کے کاروبار میں قدرے کمی ہونے لگی تو لوگ قالین بافی کی طرف راغب ہوئے۔

کشمیری قالین کی ایک اہم خاصیت "تعلیم" ہے۔ چنانچہ ایک عام کاریگر کو تب تک اُس نقشہ کے متعلق کوئی بھی علم نہیں ہوتا ہے جب تک کہ وہ محض مختلف رنگوں کے دھاگے جوڑ کر قالین پر اُس کی تکمیل کرتا ہے۔ قالین کے تُوم پر سُوت کے تار اوپر سے نیچے متوازی طور چڑھائے جاتے ہیں۔ جن میں کاریگر مختلف رنگوں کے دھاگے جوڑتا جاتا ہے۔ مختلف رنگوں کے دھاگوں کی ترتیب کے حساب و کتاب کا نام "تعلیم" ہے۔ اور اُس کے لکھنے کا ڈھنگ بالکل منفرد، جداگانہ یا یوں کہیے محض تکنیکی ہوتا ہے۔ ابتدائی طور قالین بُننے والے ڈیزائن کو سامنے رکھ کر ہی مختلف رنگوں کے دھاگوں کو استعمال میں لاتے تھے لیکن مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت

میں ہی قالین بافی میں "تعلیم" کا طریقہ شروع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں ایڈورڈ ہفتم شہزادہ ویلز کو جموں آنا تھا۔ مہاراجہ نے امر جو گنگو کو حکم کیا کہ اس کے لئے عجائب گھر کے ہال کے لئے ایک قالین تیار کیا جائے۔ اتنے بڑے قالین کو بہت ہی کم وقت میں تیار کرنا ممکن نہ تھا کیوں کہ اُس وقت کشمیر میں قالین بنانے والوں کی ایک مختصر سی تعداد تھی۔ لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ چند نئے لوگ اس کام میں شامل کئے جائیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اس مختصر وقت میں انہیں تربیت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس مشکل کا حل علی میر نام کے ایک اچھے کاریگر نے ڈھونڈ نکالا اور اُسی نے ایسی تعلیم ایجاد کی جس سے کہ اس کام سے بہت ہی کم واقفیت رکھنے والے بھی کام پر لگائے گئے اور اپنی کم صلاحیتوں کے باوجود بھی وہ لوگ اس کام کو تعلیم کی مدد سے اُس طور نبھا سکے۔ بعد میں یہی تعلیم کشمیری قالین کی خوبصورتی اور غلطیوں کے کم امکانات کی وجہ بنی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی کشمیری قالین اور نمدوں کی تکنیک میں جدت لانے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۱ء میں لندن میں قالینوں کی ایک نمائش میں ایک کشمیری ریشمی قالین بھی رکھا گیا جس میں فی مربع انچ میں سات سو کے قریب ریشے بھرے گئے تھے۔ اس کے بعد یورپ میں کشمیری قالینوں کی زبردست مانگ بڑھی۔ برطانوی اور فرانسیسی فرموں نے اس مانگ کو بڑھانے میں کافی اہم رول ادا کیا۔ ۱۸۷۶ عیسوی میں ایک یورپین مسٹر جاب مین کشمیر میں قالین بنوانے اور انہیں یورپ برآمد کروانے کے لئے آیا۔ سینٹ ورکشاپ کا ایک افسر میاں لال دین حکومت کی طرف سے اس کی مدد کرنے کی خاطر مقرر کیا گیا۔ اس نے کچھ نئے ڈیزائن تیار کئے مگر ان کی زیادہ مانگ نہ رہی لہٰذا وہ واپس یورپ چل دیا۔ اس کے بعد ایم بگکس (M. Bigex) نامی ایک فرانسیسی وہاں کی ایک کمپنی بون مارشی (Bon-Marche)

کے لئے یہاں قالین بنوانے کی خاطر وارد ہوا۔ کمپنی کی طرف اس کے ساتھ ایک ایجنٹ ایم اگارڈ (M. Agard) یہاں بھیج دیا گیا تھا جو کہ ڈیزائن وغیرہ ترتیب دینے میں ماہر تھا۔ البتہ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈیزائن کس طرح تشکیل پاتا ہے۔ لہذا مختلف ڈیزائنوں کے قالین بُنتے رہے۔ مگر وہ ان ڈیزائنوں سے مطمئن نہ ہوا نتیجہ یہ ہوا مسٹر بگکس کو خسارہ اٹھانا پڑا اور اس نے یہ کاروبار ترک کیا۔ اس کے بعد یہ کام ایچ ڈاورن (H. Dauvergne) نامی ایک شخص نے اپنے ہاتھوں میں لیا جو کہ یہاں سے شال برآمد کرتا تھا۔ شال بافی کے کام میں مہارت ہونے کی وجہ سے اُس نے ایسے ڈیزائن قالینوں کے لئے ترتیب دیے جن کی کشمیر سے باہر کافی مقبولیت ہوئی اور اُسے کافی فائدہ ہوا۔ بعدازاں میسرز ایچ مچیل اینڈ کمپنی (Messers H. Mitchel & Co) نے اس کی فیکٹری خرید لی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ میسرز سی ہاڈو اینڈ کمپنی نام کی ایک اور کمپنی یہاں قائم کی گئی۔ ان کمپنیوں نے عالمی مارکیٹ میں کشمیری قالینوں کی مانگ بڑھانے میں کافی اضافہ کیا۔ کینیڈا، فرانس، برطانیہ وغیرہ جیسے ملکوں میں کشمیری قالین کو بہت ہی پسند کیا گیا۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ان دو کمپنیوں میں ۲۲۰۳ قالین بُننے والے کاریگر تھے۔ یہ کمپنیاں کافی مشہور ہوئیں۔ اور مختلف موقعوں پر انہیں انعامات سے بھی نوازا گیا۔ ہاڈو اینڈ کمپنی کی طرف سے تیار کئے گئے قالینوں کی وجہ سے کشمیری قالین عالمی سطح پر کافی مقبول ہوئے۔ ۱۸۹۰ء میں اس کمپنی نے شکاگو کے عالمی میلے میں کشمیری قالینوں کی نمائش منعقد کی۔ اس کمپنی نے ۱۹۰۲ء میں اردابیل مسجد کے قالین (جس کا ذکر پہلے ہی ہوچکا ہے) کی نقل تیار کی جو لارڈ کرزن نے ایک سو ڈالر کے عوض خریدا۔ ان وجوہات کی بنا پر قالین بافی نے یہاں کافی ترقی کی اور عروج پایا۔

ابتدائی طور کشمیر میں قالینوں اور نمدوں پر قدرتی مناظر کو اُبھارا جاتا تھا مگر ایرانی اثرات اور یہاں کے فن کاروں کے تخیل کی وجہ سے کشمیر میں مختلف اقسام کے قالین اور نمدے تیار کئے گئے۔ بر جستہ کشمیر کے قالینوں میں ایک خاص اور نرالی قسم ہے جو خوبصورتی کے اعتبار سے کافی مشہور ہے وسط ایشیائی ڈیزائنوں میں بخارا کے ڈیزائن یہاں کافی پسند کئے گئے ہیں اور ان ڈیزائنوں کے قالین بھی یہاں تیار کئے گئے ہیں۔ شوپیاں اور گریز کا اُون معیار کے اعتبار سے کافی اچھا تصور کیا جاتا ہے۔ یہی ایک وجہ ہے کہ قالین اور نمدوں کے شائقین یہاں کی ان مصنوعات کو پسند کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب یورپ میں مشینی قالین عام ہوئے تو یہاں کی اس صنعت کو بہت دھچکا لگا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس صنعت کی طرف کافی توجہ دی گئی اور پہلے پانچ سالہ منصوبے میں ہی سرینگر میں آرٹس ایمپوریم قائم کیا گیا جس کی وجہ سے اس صنعت سے وابستہ کاریگروں کو بھی فائدہ ہوا۔ درمیانہ داروں کی بالادستی کا خاتمہ بھی ایسے کاری گروں کیلئے نفع بخش ثابت ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک قالین بافی زیادہ تر سرینگر شہر تک ہی محدود تھی اور لوگ انفرادی سطح پر ہی اس کی تربیت پاتے تھے۔ ایک سروے کے مطابق ۱۹۷۳ء میں قالین تیار کرنے والوں کی علاقہ وار فہرست اس طرح ہے:۔

علاقہ	مرد	عورت	کل
سرینگر شہر	۲۸۵۴	۷۷	۲۹۳۱
کل سرینگر تحصیل	۳۱۲۱	۹۲	۳۲۱۳
بڈگام	۱۸۶	۱	۱۸۷
بیروہ	۵	-	۵
گاندربل	۸	-	۸

اسلام آباد	۱۱	۶	۱۷
بارہ مولہ	۱۳	-	۱۳
کل ،	۳۳۴۴	۹۹	۳۴۴۳

۷۶ - ۱۹۷۵ء میں حکومت کی طرف سے قالین تیار کرنے کی تربیت سے متعلق ایک پروگرام شروع کیا گیا جس کے نتیجہ میں ۱۹۸۲ء تک ۴۸ ہزار افراد کو اس قسم کی تربیت دی گئی۔ تربیت یافتہ افراد کو حکومت اپنے لوم قائم کرنے کے لیے مالی امداد اور دوسری ترغیبات بھی دے رہی ہے۔

بڑے سائز کے قالینوں کے ساتھ ساتھ عام طور پر مندرجہ ذیل سائزوں میں بھی قالین بنے جاتے ہیں :-

۳'×۲' ، ۴'×۲½' ، ۵'×۳' ، ۴'×۶' ، ۹'×۶' ، ۱۲'×۹'

نمدہ سازی۔ نمدہ سازی سے متعلق بھی حکومت کی طرف سے کئی تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ کشمیری نمدہ اون اور اس پر بیل بوٹوں کی خوبصورتی کے لئے مشہور ہے۔ ہندوستان میں سری نگر، امرتسر، جودھ پور اور جے پور نمدہ سازی کے لئے مشہور ہیں۔ اگرچہ نمدہ سازی قالین بافی کے کام سے بالکل مختلف ہے مگر نقش کاری اور استعمال کے لحاظ سے بہت حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ اس لئے اکثر ان کا ذکر ساتھ ساتھ آتا ہے۔

نمدہ بنانے کے لئے اون کو عام طور پر کسی کپڑے یا چٹائی پر پھیلا دیا جاتا ہے اور اس صابن و دیگر گوند وغیرہ ملایا جاتا ہے تاکہ اون کے ریشے ایک دوسرے سے جڑ جائیں۔ کپڑے یا چٹائی کو بعد میں گولائی میں تہہ کیا جاتا ہے اور اسے پیروں سے آہستہ آہستہ اس وقت تک دبایا جاتا ہے جب تک کہ یہ اس دباؤ کی وجہ سے ایک اونی تختہ یا چٹائی کی صورت اختیار نہ کر لے پھر اس پر رنگین اونی دھاگوں

سے مختلف نقش ابھارے جاتے ہیں۔

کشمیر میں مختلف سائزوں کے نمدے تیار کئے جاتے ہیں۔ کچھ نمدے گول شکل میں بھی ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور نمدے ان سائزوں کے تیار کئے جاتے ہیں :-

۳'×۲' ، ۴'×۳' ، ۶'×۴' ، ۹'×۶' ، ۱۲'×۹'

گذشتہ چند برسوں سے حکومت نے کچھ ایسی سوسائٹیاں بھی قائم کی ہیں جو کاریگروں سے براہ راست مال خریدتی ہیں۔ اس طرح سے درمیانہ داروں کی اجارہ داری سے انہیں نجات ملی ہے اور کافی منافع بھی ہوا ہے۔ گویا ایسے اقدامات سے یہاں کے لوگ اس کام کی طرف زیادہ سے زیادہ حد تک مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کا ایک منفی اثر یہ بھی ہوا کہ دیہی علاقوں میں بچوں کو سکولوں کی بجائے اب ایسے ہی مراکز میں بھیجا جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایسے بچے تعلیم سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس صنعت کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ ایسے اقدام کئے جائیں جن سے یہاں کے آئندہ شہریوں کو ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو مفلوج ہونے سے بھی بچایا جا سکے۔ ہ

ن: "جالکہ دزی اور سوزن کاری" کے عنوان سے جو مضمون شامل اشاعت کیا گیا ہے اس میں بھی نمدے کی بناوٹ کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔ (ادارہ)

کانگڑ

کشمیر اور کانگڑی ایک دوسرے کی پہچان ہیں ۔ جہاں بھی کانگڑی کے قدم پڑے وہاں کشمیر کا چرچا ہوا ' اور جس نے کانگڑی دیکھی اُسے کشمیر یاد آیا ۔ جاڑا ہو یا گرما' بہار ہو یا خزاں ۔ ہر کشمیری گھرانے میں کانگڑی موجود رہتی ہے ۔ جس طرح کانگڑی پل بھر میں گرم اور پل بھر میں سرد ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح کشمیریوں کے مزاج بگڑنے اور سنبھلنے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگتا ۔ ذرا سی ٹھنڈ' قہر کا جاڑا ۔ ایک فاقہ' مدتوں کا کال ۔ اسی لئے کانگڑی کشمیریوں کے مزاج کو اس قدر بھا گئی ہے کہ جھلسا دینے والی گرمی میں بھی اسے کوئی دُھتکارتا نہیں ۔ ادھر برسات کا زور بڑھا' اُدھر کانگڑی کا چلن ہوا ۔ بہار کی پھوار نے کچھ دن تھمنے کا نام نہ لیا کہ کانگڑی کشمیریوں کے گلے کا ہار بن گئی ۔ کیا مجال کہ سونے کا فرش بچھا ہو اور کانگڑی کو اس پر جگہ نہ ملے ۔ چنانچہ کشمیریوں نے بھی کانگڑی کو کچھ کم پیار نہیں دیا ہے ؎

میں وارے جاؤں لاڈلی کانگڑی رے
چرار کی گھنگھرو والی کانگڑی رے

اسلام آباد کی سانولی کانگڑی رے
میں وارے جاؤں لاڈلی کانگڑی رے

ایک اور لوک گیت میں کانگڑی کے سال بھر کا سفر دُہرایا گیا ہے ۔

بیساکھ کے آتے ہی کانگڑی اپنے رُتبے سے گر گئی
جیٹھ کے آتے ہی اس کا کوئی نام لیوا بھی نہیں رہا
آشاڑھ میں کانگڑی منظر سے ہی غائب ہو گئی
ساون کا جوبن کانگڑی کے بڑھاپے کا زمانہ ہے
بھادوں میں بھی کانگڑی کے متوالے جاگے نہیں
اسوج کے آتے ہی کانگڑی کی آمد آمد ہوتی ہے
کتک کے مہینے میں کانگڑی دہکتے انگاروں سے بھر گئی
مگھر کے مہینے میں ہر طرف بس کانگڑی کی تلاش جاری ہے
پوہ کے دوران بھوسہ تک کانگڑی میں کوئلے کی جگہ لیتا ہے
پھاگن کے مہینے میں کانگڑی کا خمار اترنے لگا
اور چیت میں کانگڑی پانی سے بھر جاتی ہے

"کانگڑی" کے عنوان سے چودھری خوشی محمد ناظر نے ایک مشہور نظم کہی ہے جسے یہاں پر نقل کرنا بے جا یا نامناسب نہ ہوگا:

اے مری آرام جان اے میری دلبر کانگڑی
مہر گستر کانگڑی اے رُوح پرور کانگڑی

وادیٔ کشمیر ہے وادیٔ ایمن کو رشک
دیکھ کر جلوہ ترا اے طور منظر کانگڑی

عاشق دل سوختہ کا ہے مزاد گنبدی

یا کسی سیمیں بدن کا جملہ زر کانگڑی

تن بدن میں اُنکے فوراً رشک سے لگ جائے آگ
قاف کی پریاں جو دیکھیں تیرے شہپر کانگڑی

اس سے تو رخشندہ تر ہے اس سے تو تابندہ تر
جامِ جم سے کانگڑی تاجِ سکندر کانگڑی

ناف میں تیری نہاں ہے نافۂ آہوئے چین
ہے رگ و ریشے میں تیرے عود و عنبر کانگڑی

اس کی گرمی سے فلک پر ہے دماغِ اہلِ بزم
گاہ ساقی کانگڑی ہے گاہ ساغر کانگڑی

خویش و بیگانہ سے اس کا رشتہ پیوند ہے
شو سے بانو کانگڑی بانو سے شوہر کانگڑی

برف و باراں میں فزوں ہوتی ہے اسکی آب و تاب
برف کے دریا میں ہے ہر سو شناور کانگڑی

ابر کے سائے میں چلتا ہے درخشاں آفتاب
یا پھرن کے پھیر میں کرتی ہے چکر کانگڑی

گنبدِ بوسیدہ میں ہے مرقدِ نورِ جہاں
یا اندھیری کوٹھری میں تاجِ اختر کانگڑی

چھوڑ کر تجھ کو بخاری کا جو دم بھرنے لگے
پڑ گئے گویا سمجھ پر اُس کے پتھر کانگڑی

پوستیں میں کانگڑی ہے آستیں میں کانگڑی
کانگڑی زیرِ پھرن ہے زیرِ چادر کانگڑی

رشک سے جل بھن مریں منقل بخاری اور سٹو
یہ تو ہیں استادہ بر در تو ہے بودبر کانگڑی

داغ دیتی ہے دلوں پر اپنے دلداروں کے یہ
لیٹ جاتی ہے جو بستر پر مچل کر کانگڑی

شکرِ احساں سے ترے غافل تھے اہلِ کاشمر
اس لئے حاضر ہوا تیرا ثنا گر کانگڑی

ہم کشمیریوں کو کانگڑی اتنی محبوب ہے جتنی مجنوں کو لیلیٰ تھی۔ یہ نہ ہو تو پوس (پوہ) کی یخ بستہ اور لمبی راتیں کس طرح بتائیں۔ البتہ جاڑے میں لڑنا جھگڑنا بھی ایک مصیبت ہے۔ ہر غصہ ور (غصیلا) آدمی اپنے مخالف کو یہ کہہ کر خوف زدہ کر دیتا ہے کہ "الٹ دوں کانگڑی اور جل جائے چمڑی ......" بعض اوقات جب طرفین میں کانگڑی چل جاتی ہے تو ایک چہرے کے کئی چہرے بنتے ہیں۔ بات پھر بھی معمولی تھی لیکن جب آدمی گھر پہنچتا ہے تو بے بسی اس کا دامن تھام لیتی ہے کیوں کہ کوئی بھی فرد اپنی کانگڑی دوسرے کو دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے تو بہت سارے یورپیوں نے کہا ہے کہ کانگڑی کشمیریوں کے گلے میں رسی سے بندھی رہتی ہے۔

کشمیری جہاں بھی گیا وہاں کانگڑی نے قدم رکھ لئے یہاں تک کہ راجستھان میں بھی سرما کے دوران کانگڑی محوِ رقص نظر آتی ہے۔ یہ وہی راجستھان ہے جہاں گرما کی تپتی دھوپ سے آدمی کے تلوے اور سر جھلس جاتے ہیں۔

کانگڑی نے انیسویں صدی میں امرتسر اور لاہور تک اپنی حد بڑھادی تھی۔ دورِ حاضر میں یہ کس کس پرائے گھر میں دن گذار رہی ہے، نہ گنوانے کی فرصت ہے اور نہ دہرانے کی ضرورت۔ کانگڑی کشمیر سے باہر اردگرد کے علاقوں میں ٹنی (بنائی)

جاتی ہے۔ لیکن کشمیری کانگڑی کی نزاکت، باریکی اور ہمارے شاخسازوں کی دستکاری اور فن کاری پاس پڑوس کے علاقوں کے کاری گروں میں کہاں۔ چنانچہ یہاں جو قسم قسم کی کانگڑیاں بُنی جاتی ہیں ان کی نزاکت ہی الگ ہے۔ گھنگھرو والی کانگڑی، بانڈی پوری کانگڑی، اسلام آبادی کانگڑی، چرار کی کانگڑی وغیرہ۔ اگرچہ ان اقسام کے نام یکساں ہیں لیکن ان کی شکل الگ الگ ہے، بناوٹ جدا جدا ہے اور اسی طور قیمت بھی۔ سجی سجائی چرار کی کانگڑی جیسے سرو قد دُلہن۔ حسین، دیدہ زیب، گول گول، دل میں گھر کرنے والی۔ سچ یہ کہ آگ ذرا سی زیادہ کیا ڈال دی کہ اس کی ساری شان ختم۔ شاخوں سے بُنے گول کڑے تار تار۔ اس قسم کی کانگڑی تاپنے سے زیادہ سجاوٹ کے کام آتی ہے۔ بنی[۱] کی مضبوط اور باریک شاخوں سے بُنی کانگڑی میں تھوڑی سی آگ ڈالنے پر وہ دن بھر فرمانبردار رہتی ہے۔ زینہ گیری کانگڑی پائیداری کے سبب بہت مقبول ہے جو توت کے انگاروں کی تپش بھی سہہ لیتی ہے۔ اگر اسے سنبھال کر رکھا جائے تو کئی برس چلے گی۔

کانگڑی کی پائیداری، تیلیوں (شاخچوں) اور بُنائی پر منحصر ہے جیسی تیلیاں ہوں کانگڑی بھی ویسی ہی ہوگی۔ لیکن کھوپری بہت مضبوط ہونی چاہیئے۔ باریک شاخچوں سے تیار کی گئی کانگڑی خوب گرمی دیتی ہے۔ موٹی تیلیوں (شاخچوں) والی کانگڑی اگرچہ خاصی گرمی پہنچاتی ہے لیکن اس کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ کیوں کہ موٹی شاخیں بہت جلد سخت ہو جاتی ہیں اور گر پڑتی ہیں۔ 'پاٹش'[۲] شاخچوں سے بُنی کانگڑی بے حد مضبوط ہوتی ہے۔ پاٹش شاخچے ذرا موٹے اور بے ڈھنگے ہوتے ہیں جس وجہ سے کانگڑی کو سجانے سنوارنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ البتہ باریک شاخچوں سے بُنی کانگڑی کی کھوپری اگر پاٹش شاخچوں سے تیار کی جائے تو زیادہ

۱، ۲ : جنگلی تیلیوں کی قسمیں۔

وقت چلتی ہے۔ کلم، بید اور سفیدے کے درختوں کی شاخچیں بھی کانگڑی بنانے کے کام آتی ہیں لیکن ان شاخچوں سے بُنی گئی کانگڑی دوسری کانگڑیوں سے مقابلتاً استر یعنی کم معیار کی ہوتی ہیں۔ 'استر' کی بات چھڑی تو یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ استر کسے کہتے ہیں۔ استر موٹی موٹی تیلیوں کی بغیر تلی کی کانگڑی کو بھی کہتے ہیں۔ دوم یہ کہ باریک یا ڈور دار کانگڑی بُننے سے قبل شاخساز طباق (ججم) کے گرد بے ڈھنگی تیلیوں سے خول چڑھاتا ہے اور پھر اس پر باریک شاخچے (تیلیاں) جوڑتا ہے۔ شاخساز اس بے ڈھنگے خول کو بھی استر کہتے ہیں اور پھر اسی خول پر کانگڑی کی ڈور چڑھائی جاتی ہے اور نقوش ڈالے جاتے ہیں۔

کانگڑی بُننے میں بنیادی طور دو چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ ججم (طباق) اور شاخچے۔ چرار کی کانگڑی طباق، ججم نکال کر مٹی کا کیہ نما پیالہ ہوتا ہے اور طباق کے حجم کے مقابل شاخچوں سے بنے کڑے میں ڈوری بُنی جاتی ہے جس میں تراشے ڈالے جاتے ہیں۔ کانگڑی کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس کے ججمے میں حجم نہیں ہوتا ہے۔ اس کا طباق چھوٹے کیہ نما گڑھے کا سا ہوتا ہے جس پر ڈوری ڈالنے کی گنجائش نہیں۔ کانگڑی کے باہری خول کھوپری یا کڑے (جو شاخچوں سے بُنا گیا ہوتا ہے) میں بھی الگ الگ حصے ہوتے ہیں۔ تلا، ججم اور کھوپری۔ عام کانگڑیوں کا تلا گھاس کے پولے جیسا بُنا ہوتا ہے جبکہ باریک تراشے (جالی دار یا شیشے دار کانگڑیوں کا تلا قدرے اونچا اور جالی دار ہوتا ہے۔ زینہ گیری کانگڑی کا تلا بھی موٹا جالی دار ہوتا ہے۔ مگر یہ چراری کانگڑی کے تلے کی نسبت وسیع ہوتا ہے۔ باریک (نازک) کانگڑیوں کا حجم بُننے میں مختلف قسموں کے شاخچے کام میں لائے جاتے ہیں۔ گھنگھرو والی اور جالی دار کانگڑی کے سوا جو کانگڑیاں باریک شاخچوں سے تیار کی جاتی ہیں ان کے حجم پر حاشیہ نما ڈوری بُنی ہوتی ہے

اوپری تانے بانے (کھوپری) کے دو[2] حصّے ہوتے ہیں جنہیں "درے"[1] اور "پھیرے" کہا جاتا ہے۔ کانگڑی کے ڈھانے کے دو طرفہ اور کانگڑی کو ادھر اُدھر لے جاتے وقت "درے" ہی تھامے جاتے ہیں۔ "پھیرے" ان قدرے موٹے شاخچوں کو کہتے ہیں جو کانگڑی کے حجم میں بند کئے جاتے ہیں۔ جن کانگڑیوں کی کھوپری ٹیڑھی ہو ان کے "پھیرے" صرف جمجھے کے دامن تک چڑھائے جاتے ہیں لیکن جن کانگڑیوں کے خول مضبوط ہوں اُن کے "پھیرے" تلے سے بندھے ہوتے ہیں۔ جن کانگڑیوں کے "پھیرے" بیس سے چالیس تک ہوں وہ مضبوط ہوتی ہیں۔ "ڈالن"[1] باندھنے کے لئے شاخچوں سے بنا ہُوا کڑا پھیروں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے اور "پھیرے" دروں کے پُشت کی جانب گھیرا ڈالے ہوتے ہیں تاکہ کھوپری کو تھامے رہیں۔ رنگین کانگڑی تیار کرنے کے لئے شاخچے الگ الگ طور پر رنگے جاتے ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ تین یا چار رنگوں کا استعمال ہوتا ہے۔ شاخچوں کو رنگ دینے کا کام شاخساز خود ہی انجام دیتا ہے۔

کانگڑی تیار کرنے کے لئے شاخساز کو انڈی[2]، ستاری اور کھرچی درکار ہوتی ہے۔ انڈی سے شاخچے بنا کر انہیں حسبِ ضرورت موٹا اور باریک بنانے کے علاوہ ان کی تراش خراش کی جاتی ہے۔ ستاری پھیروں اور دروں کو بند کرنے کے کام آتی ہے اور کھرچی سے شاخچوں کو کھرچا جاتا ہے۔ اب رہا خام مواد یعنی شاخچے اور جمجھے (طباق)۔ شاخچے جنگلوں اور کنڈی علاقوں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ جہاں لیتی[3]، یاش[4] اور کڑشی[5] کے جھنڈ کے جھنڈ ہوتے ہیں جبکہ دوسری

[1] لکڑی کا ایک سطحِ چمچہ جو طباق میں پڑی آگ یا راکھ کو اِدھر اُدھر سرکانے یا انگاروں پر راکھ ڈالنے کے کام آتا ہے۔ [2] اُسترا نما ایک ہتھیار

[3-5] رشہ ؛ جنگلی تیلیوں کی قسمیں۔

قسمیں باتین علاقوں میں بھی مل جاتی ہیں۔ طباق کی ضرورت پُورا کرنے کے لئے شاخساز کمہار کا محتاج ہے۔ بعض ماہر کمہار کھوپری سمیت پوری کی پوری کانگڑی مٹی سے تیار کرتے ہیں اور پختہ بناتے ہیں۔ ایسی کانگڑیوں پر شاخوں کے خول چڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ اس قسم کی کانگڑیاں اکثر اوقات تاپنے کے کام نہیں آتی ہیں۔ شاید ہی کوئی فرد اس قسم کی کانگڑی تاپتا ہو کیونکہ اسے تاپنے سے نہ تو ٹانگیں یا ران اور نہ ہی پیٹ محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ ہی پوشاک کیوں کہ ہر چیز کے جلنے کا خطرہ اور اندیشہ ہر پل لاحق رہتا ہے۔

کانگڑی کیسے وجود میں آئی اور کب ہماری محبوبہ بنی؟ اس بارے میں جس کا جو جی چاہا اس نے کہہ ڈالا اور کہنے والے یہ بھی کہہ گئے کہ اکبر بادشاہ کے ہمراہ جو اطالوی یہاں وارد ہوئے وہی کانگڑی کو بھی اپنے ساتھ لے آئے اور بادشاہ نے اسے کشمیریوں کی گود میں ڈال دیا۔ تاکہ وہ آلسی بن جائیں۔ نادانوں نے بات رٹ لی اور اسے دُہراتے رہے۔ صرف اس لئے کہ ہمیں ہر پرائی شے سونا نظر آتی ہے خواہ وہ پیتل ہی کیوں نہ ہو۔ ہم ہیں کہ ہر ایرا غیرا النقمان لگتا ہے چاہے اُسے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہ ہو۔ حالانکہ اٹلی کا طباق (جمجھ) نہ نام سے اور نہ ہی صورت سے کانگڑی سے میل کھاتا ہے۔ اٹلی کا طباق شکل سے بن تلے کا ڈھکن دار تھال لگتا ہے۔ ادھر اُدھر لے جانے کے لئے اٹلی کا جو طباق تھاما جاتا ہے وہ گول بے ڈھنگا، کھلا ہوا تلے دار بالٹی جیسا لگتا ہے جس پر ڈالن جیسا چمچہ آویزاں رہتا ہے۔ اسے رومن دور سے ہی ترلا[1] کہتے ہیں جس کی "کانگڑی" سے کسی بھی صورت میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔

اس پر بھی ہمیں کانگڑی کو اٹلی کی دین تسلیم کرنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

[1] اسے "معلق" کہا جاتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کشمیر میں کانگڑی کا چلن بہت پہلے سے رہا ہے۔ منک پنڈت نے شری کنٹھ چیرتر میں لکھا ہے:

"جوں ہی وہاں جاڑے کا آغاز ہوتا ہے۔ کانگڑی (ہسن تکا) غصیلی آنکھوں کی لالی سے چھلکتی ہوئی آگ کی طرح دہکنے لگتی ہے۔ یہی طرزِ عمل کام دیو نے شو کی سمادھی توڑنے کے لئے اپنا لیا (جس شو نے کام دیو کو تیسری آنکھ کے شعلوں سے راکھ کر دیا ــــــ"

کلہن لکھتا ہے:

"انسان کی کوشش کانگڑی میں سلگتے انگاروں سے میل کھاتی ہے۔ جو بعض وقت اپنے بجھے بجھے احساس کی آڑ میں خاکستر کر ڈالتے ہیں اور کبھی کبھار لاکھ جلانے پر بھی نہیں دہکتے یہاں تک کہ پھونک مار مار کر گلا سوکھ جاتا ہے اور گال پھول جاتے ہیں"۔

سینٹ پیٹرس برگ ڈکشنری کے مطابق "ہسن تکا" کا لفظ کلہن نے بھی اُس وقت استعمال کیا ہے جب اس نے وکرمادتیہ کی خواب گاہ سے متعلق لکھا ہے کہ یہ دہکتی ہوئی کانگڑی کی طرح کڑکتا تھا۔ کلہن نے ایک اور جگہ بھی اسی طرح کا ذکر چھیڑا ہے جس کا میں نے پہلے ہی حوالہ دیا ہے۔ سنسکرت والوں نے کانگڑی کو کون سا نام دیا مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن "ہسن تکا" لفظ سے کانگڑی نہیں بن سکتا یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ کانگڑی لفظ کی بنیاد "ہسن تکا" نہیں ہے۔

کانگڑی کا ذکر کرتے ہوئے آر۔ ایس پنڈت لکھتے ہیں "کلکش اگنی" لفظ کے معنی بغل کی تپش بھی ہیں۔ اور یہی کلکش اگنی کشمیری کانگڑی ہے جس میں جاڑے کے دوران آگ ڈال کر وہ (کشمیری) اسے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اس کے معنی جنگل کی آگ بھی ہو سکتے ہیں اور شعلے اور تپش بھی۔ رگھوونش میں یہ لفظ شعلوں اور تپش کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن کلکش اگنی کا لفظ کانگڑی کی بنیاد قرار دینا بے معنی سا لگتا ہے۔ کانگڑی کو اٹلی کی دین جتلانے سے ہنٹن نولز بھی انکاری ہے اور سر والٹر لارنس بھی۔ جس نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے، تواریخی حوالوں کو مدِ نظر رکھ کر اس کا دعویٰ ہرگز درست اور قابلِ قبول نہیں ہے۔

کانگڑی کے سرچشمے کو کھنگالنے کی جانب ہنٹن نولز نے بھی توجہ دی ہے اور وہ لکھتا ہے کہ "کانگڑی" لفظ کی اصل/بنیاد کا اتہ پتہ لگانے کے بارے میں دو اندازے ہیں:

(۱) یہ کہ کانگڑی دو لفظوں "کانی" (شاخچہ) اور "گر" (بنانے والا) کا مرکب ہے۔ "کانی گر" کے معنی کانگڑی بنانے والے یا شاخساز کے ہیں اور اس کے معنی خول کی بُنائی بھی ہو سکتے ہیں۔ کشمیر میں بیشتر چیزوں کے ساتھ ان کے بنانے والے کا نام بھی جُڑ جاتا ہے۔ کانگڑی شاخوں کی بُنائی اور ڈھانچے کے سوا اور کچھ نہیں اور کانی گر کا اختصار کانگڑی بھی ہو سکتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح رنگائی کرنے والا "رنگر" رنگ بنانے والا رنگ گر یا رنگر کہلاتا ہے۔

البتہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کانی (شاخچہ) گر لفظ کسی وقت کشمیر میں مروج رہا ہے تو جواب نفی میں ہے۔ کیوں کہ کشمیری میں پہلے ہی اس مقصد سے "کانٛل" (شاخساز) لفظ موجود ہے۔ لہٰذا اس قسم کا لفظ گھڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ دوم یہ کہ لفظوں کے اختصار سے نولز نے جو قاعدہ مقرر کیا ہے اس کی کوئی ساکھ نہیں۔ چنانچہ سنگر، ترنگر، ننگر، لنگر وغیرہ لفظ بھی اس قاعدے کی رُو سے کسی قسم کی نشاندہی نہیں کر پاتے۔

(ب) دوسری اور شاید بہتر تجویز یہی ہے کہ یہ لفظ براہِ راست سنسکرت سے آیا ہے۔ حرف ماقبل کے طور "ک" چھوٹا یا خراب ہوجانے وغیرہ کے معنی دیتا ہے اور انگارہ، جس کے معنی فقط دہکتے ہوئے کوئلے یا خالص کوئلے ہیں۔ لہٰذا "ک" + انگارہ یا انگاری کے معنی سُلگتے ہوئے کوئلے یا چھوٹا حجمہ ہیں۔ اس سے کانگڑی کی آواز آسان طور ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر نولز کے اندازے زیرِ نظر رکھنے کے باوجود میرا خیال یہ ہے کہ کانگڑی اصل میں کنگ لفظ کی تصغیر ہے۔ کشمیر کے مکین مٹی کے اُس تلے دار اور تھمدار طباق کو کنگ کہتے ہیں جس کی شکل یورپی طرز کی ایک تراشے ہوئے سیب پھل سے کسی حد تک مشابہت رکھتی ہے۔ کنگ کبھی کبھی تاپنے کے کام آتا ہے اور اکثر اس میں انگارے رکھے جاتے ہیں۔ اسی کا دوسرا نام مَنَن (آتش دان) بھی ہے۔ اس کے علاوہ بھڑکتی آگ کو بھی کنگ کہا جاتا ہے۔ اگلے زمانے میں اس قسم کے آتش دانوں کا لیہہ میں خوب چلن تھا جبکہ لداخ کے دور دراز دیہات اور اس سے آگے کے علاقوں میں اب بھی کنگ کا رواج ہے۔

کنگ اصل میں تبتی زبان کا لفظ ہے۔ گرمی کے لئے طباق کے علاوہ اس بخاری کو بھی کنگ کہتے ہیں جو دو کمروں کے درمیان کھڑی دیوار میں لگی رہتی ہے جس میں دھوئیں کے اخراج کے لئے نچلی جانب کمروں کے باہر جگہ ہوتی ہے۔ ایک کنگ جلانے سے دو کمرے گرم ہوجاتے ہیں۔ چینی سرحد پر آباد دیہات میں باورچی خانوں کے اندر بیچوں بیچ ایک تخت نما چوکی ہوتی ہے۔ جسے کنگ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ تخت (پنڈال) پکانے کے علاوہ حمام کا کام بھی دیتا ہے اور کنبے کے فرد باری باری اس تخت پر بیٹھ کر یا اس کے نزدیک رہ کر خود کو گرمی پہنچاتے ہیں۔

کنگ کو کانگڑی کی ابتدائی شکل تسلیم کرلینا عمل اور اندازے کے قریب اور قابلِ قبول لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ابتدائی دور میں کانگڑی سادی کی ساری مٹی کی ہوا کرتی ہو۔ یہ باور کرلینا بھی کوئی مشکل امر نہیں کیوں کہ دورِ حاضر میں بھی اس قسم کی کانگڑی ڈھالی جاتی ہے۔ البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ کانگڑی پر شاخچوں کا خول بُننا اور کھوپری چڑھانا صرف کشمیریوں کی کارسازی ہے اور یہی عمل کنگ کا دوسرا روپ یعنی کانگڑی ہے۔

● کشمیری سے ترجمہ، مترجم: محمد یوسف مسکین

عبد الاحد

شالبافی

اپنی دستکاریوں کی بدولت کشمیر دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں کی دستکاریاں جگہ جگہ کشمیری دستکاروں کی عزت اور وقار کو بڑھا دیتی ہیں اور کشمیری عوام کی اقتصادی زندگی کو خوشحال، اور مستحکم بنانے میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ ان دستکاریوں میں کشمیری شال کا ایک اہم مقام ہے۔

کشمیر کو اقتصادی طور خوشحال بنانے اور یہاں کی شہرت دُور دُور تک پہنچانے میں کشمیری شالوں نے جو رول ادا کیا ہے اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ پچھلے زمانے میں بے شمار کشمیری شالبافی میں مصروف رہتے تھے اور اسی سے اپنی ضروریات وغیرہ پوری کرتے تھے۔ جارج فورسٹر کی ایک روایت کے مطابق ایک زمانے میں سری نگر شہر کی لگ بھگ تمام عورتیں شالوں کی بُنائی کے لئے پشمینہ اون کاتنے میں مگن رہتی تھیں۔

یورپی عوام نپولین (NAPOLEON) کے زمانے تک (یعنی ۱۷۹۶ء تک) کشمیر اور کشمیریوں کے متعلق زیادہ جانکاری نہیں رکھتے تھے لیکن جوں ہی کشمیری

شال نپولین کی بیوی جوسیفین (Josephine) کے ہاتھ لگا کشمیر کے حُسن اور کاریگری کا چرچا یورپ کے طول و عرض میں ہونے لگا۔ یہی صورت اُس وقت بھی پیدا ہوئی جب زین العابدین بڈشاہ نے یہ پہلی مرتبہ وسطی ایشیا بھیجا۔ وہاں بھی اس کو پورے اشتیاق کے ساتھ شاہی لباس میں شامل کر لیا گیا۔ شالبافی کب کشمیر میں وجود میں آئی اور یہ کیسے پروان چڑھی۔ یہ ایسے اہم سوالات ہیں جن کا جواب مورخ بھی ٹھیک طرح سے نہیں دے پاتے ہیں۔ آج تک مُورخ یہی لکھتے آئے ہیں کہ شالبافی کا اصل وطن اور ماخذ وسطی ایشیا تھا جہاں سے سلطان زین العابدین بڈشاہ اس کے ماہرین و کاریگروں کو کشمیر لے آیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ جب تیمور نے شمالی ہندوستان کی بیشتر سلطنتوں پر اپنا قبضہ جما لیا تو کشمیر کا سلطان سکندر کانپ اٹھا اور گھبرا گیا۔ اُس نے اپنے بیٹے شہزادہ شاہی خان کو بے شمار تحائف کے ساتھ تیمور کے دربار میں بھیج دیا۔ مُورخ لکھتے ہیں کہ جوں ہی شاہی خان (بڈشاہ) سمرقند پہنچا تو تیمور نے اسے اُسی دم قید خانے میں ڈالنے کا حکم دے دیا۔ قید سے رہائی پانے کے بعد اس کو مورخین کے مطابق سمرقند اور وسطی ایشیا میں کاریگری کے مختلف نمونوں اور ہُنروں وغیرہ سے واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ شاہی خان سمرقند کی شالبافی دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ بادشاہ بننے کے بعد اُس نے یہ فن کشمیر پہنچانے کا پُورا انتظام کیا۔ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ کشمیر میں شالبافی میرزا حیدر کے زمانے میں وجود میں آئی۔ کئی یہ بھی کہتے ہیں کہ اس فن کے بانی حضرت شاہ ہمدانؒ تھے۔ جب ان ساری باتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ تاریخی نہیں لگتیں بلکہ فرضی قصے معلوم ہوتے ہیں۔

سائنسی بنیادوں پر تحقیقات نے اب یہ بات پوری طرح واضح کر دی ہے کہ شاہی خان (بڈشاہ) کو سمرقند نہیں بھیجا گیا تھا اور نہ اس کو وسطی ایشیا

کے فنون سے واقفیت حاصل کرنے کا ہی ذاتی طور کوئی موقعہ ملا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر شالبافی کا انتظام سلطان زین العابدین نے کیا ہوتا تو پھر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ یہ فن اسی کے دورِ حکومت میں پنپتا اور پروان چڑھتا اور کشمیر کی بیرونی تجارت کا ایک اہم جزو بھی بن جاتا۔ زین العابدین نے لگ بھگ پچاس برس تک حکومت کی۔ یہ عرصہ ایک نئے فن کے پھلنے پھولنے، پروان چڑھنے اور پھر وُسعت حاصل کرنے کے لئے بہت ہی قلیل ہے۔ خاص کر اس زمانے میں جبکہ ابھی ٹیکسٹائل انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی وجود میں ہی نہیں آئی تھی اور جاگیرداری نظام کے سبب کمیونیکیشن وغیرہ کا نظام ناقص اور ناپائیدار تھا۔

سلطان زین العابدین یا میرزا حیدر یا حضرت شاہ ہمدانؒ کو کشمیر میں شالبافی کا موجد قرار دینا تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ اصل میں یہ باتیں فارسی میں لکھنے والے وقائع نگاروں نے تحریر کی ہیں۔ ان وقائع نگاروں کا اصل مقصد سلطان زین العابدین یا حضرت شاہ ہمدانؒ کی تعریفوں میں مبالغہ آرائی کرنا تھی۔ اور ان کو کشمیر کے وسطی دور (Medieval age) کی تعمیر کا کریڈٹ دینا تھا۔ شالبافی کا ہنر کشمیر میں زمانۂ قدیم سے ہی موجود تھا اور یہ اُس وقت ترقی کی منزلیں طے کر چکا تھا جب یہاں ہاروں کی تہذیب عروج پر تھی۔ ان باتوں کی تصدیق اُن ٹائیلوں سے ہوتی ہے جو ہاروں سے دستیاب ہو چکی ہیں۔ ان ٹائلوں پر عورتوں کی تصاویر موجود ہیں جن میں یہ خواتین ایسی جھر جھری (Transparent) پوشاک زیب تن کئے دکھائی گئی ہیں جس میں سے ان کے تن صاف دکھائی دیتے ہیں بعض عورتوں کو شال کے اسکارف اوڑھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ہاروں کے ان ٹائلوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کشمیر میں زمانۂ قدیم سے ہی جھر جھرے (Transparent) کپڑے بُننے کا رواج تھا۔ آرکیولاجی کے علاوہ قلمی اور تاریخی

ماخذ بھی ہماری اس دلیل کو تقویت بخشتے ہیں۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ، جو ساتویں صدی عیسوی میں کشمیر آیا تھا، نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اس زمانے میں کشمیر میں پتلے اور ملائم اُون کے کپڑے بُنے جا رہے تھے۔ وہ لکھتا ہے:

> "The clothing materials of the people of Kashmir were named as Kiao-she-ye (Kaushaya) and muslin (Tieh) and Calico (P.U), Kausheya being silk from a wild silk worm; Chra (or Chu-mo) Kohauma a kind of lenin; han (or Kan). Po-lo, a texture of fine wool of wild animal. This wool being soft and fine was easily spun and woven into a prized material for clothing."

ہندو مذہبی کتابوں کے مطابق کشمیر میں شال ایپک دور (Epic-age) میں بُنا جاتا تھا اور یہ اتنا مقبول تھا کہ یہ سیتا کو جہیز میں دی جانے والی پوشاک میں دیا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوروؤں نے پانڈوؤں کو تقریباً ایک ہزار شال دئے۔

کشمیر کے موسم اور یہاں کے پانی کی خصوصیات پشمینہ شال بُننے کے موافق تھیں۔ برنیئر، جو ۱۷ویں صدی عیسوی میں اورنگ زیب کے ہمراہ کشمیر آیا، کشمیر کے پانی اور موسموں کے بغور مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ کشمیر کے شال کی لاثانی خوبصورتی محض ڈل جھیل کے پانی کی بدولت ہے جو دنیا میں کسی اور جگہ دستیاب نہیں ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بہت ساری یوروپی اقوام نے ایسے شال بنانے کی کوششیں کیں لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے کیوں کہ ان کے

ملک میں ایسی آب و ہوا موجود نہیں تھی جو کشمیر میں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ کشمیر کے بغیر پشمینہ اُون کسی اور جگہ نہیں بھیجی جاتی تھی۔ چھان تھان (Chanthan) اور روڈھک (Rodhakh) کے گڈریئے یہ اُون صرف کشمیر ہی بھیجتے تھے۔ توہم پرستی کی وجہ سے انہیں یقین تھا کہ اگر وہ پشمینہ اُون کشمیر کے بغیر کسی اور جگہ بھیجیں گے تو قدرت انہیں کہیں اس اُون سے ہی محروم نہ کر دے۔

ان ساری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شالباف زمانہ قدیم سے ہی کشمیر میں موجود تھے۔ بڈشاہ کے زمانے سے قبل ہی کشمیری شال دلّی کے معتبر اور مقدس حلقوں میں مقبول تھا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ جیسے برگزیدہ بزرگ بھی یہ اوڑھتے تھے۔ دراصل شال ابتدا سے ہی بزرگوں، درویشوں، سادات اور مذہبی رہنماؤں کی پوشاک کا حصہ مانا جاتا تھا۔ جب مغل بادشاہ اکبر نے دینِ الٰہی کا اعلان کیا تو اس نے ان دنوں کشمیری شال اوڑھ کر ہی اپنی پاکی اور بزرگی کے دعوے کئے۔ اس بات کا اظہار کرتے ہوئے ابوالفضل لکھتے ہیں کہ اکبر نے اپنی بزرگی اور درویشی جتانے کے لئے شال اوڑھنے شروع کئے۔ خیر۔ اکبر کے مخالف مورخ عبدالقادر بدایونی نے اس بات کا کوئی بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ وہ لکھتے ہیں کہ شال صوفی خصائل کے درویش اوڑھتے تھے اور اس کے اوڑھنے سے سچ مچ پرہیزگاری کا ثبوت فراہم ہوتا تھا۔ اس بحث سے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اگر شالبافی ابتداء سے ہی کشمیر میں موجود تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہی اور صرف بڈشاہ کے دور میں ہی نمایاں ہوئی۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم زمانۂ قدیم میں کشمیر کے اقتصادی نظام کا جائزہ لیں۔

زمانۂ قدیم میں کشمیر کے اقتصادی نظام کا انحصار زراعت پر تھا۔ کشمیر چھوٹے موٹے دیہات میں منقسم تھا جو خود کفیل تھے۔ ہر گاؤں ایک اقتصادی یونٹ تھا جس

میں کسان مشترکہ طور زراعت کا کام انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایسے تمام کام کرتے تھے جو دیہی زندگی قائم رکھنے اور اس کو ترقی دینے کے لئے ضروری تھے۔ ان کاموں میں ندی نالے کھودنا، سڑکیں بنانا اور کپڑا بُننا بھی شامل تھا۔

کشمیر کے اس اقتصادی نظام نے جس میں کشمیری سماج چھوٹے چھوٹے خود کفیل دیہات پر استوار تھا اور جس میں کسان زراعت کے ساتھ ساتھ دستکاریوں وغیرہ کے مشاغل میں بھی مصروف رہتے تھے، کشمیر میں کام کاج اور دستکاریوں کو سماجی تقسیم کی بنیادوں پر نکھرنے اور پروان چڑھنے ہی نہیں دیا۔ اس نوع کے سماجی اور اقتصادی طور طریقے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے کاموں کی طرح شالبافی بھی کسانوں تک ہی محدود رہی۔ وہ اس میں کوئی بہتری یا نیا پن پیدا نہ کر سکے کیونکہ وہ زیادہ تر زراعت وغیرہ کے جھمیلوں میں ہی اُلجھے رہے۔ خیر ہارون تہذیب سے شالبافی کو پھلنے پھولنے کے پورے مواقع میسر ہوئے کیوں کہ اب دستکاری زراعت سے الگ ہو چکی تھی اور اب یہ کام سماجی طور پر تقسیم کار کے اصولوں کے تحت اور مارکیٹ یعنی خریداری کی سہولیات بہم کرتے ہوئے انجام دیا جانے لگا تھا۔ یہ سچ مچ ایک اچھی تبدیلی تھی جو کشمیر کے اقتصادی سماجی نظام کو پوری طرح بدلنے میں کارآمد ثابت ہوئی اور جس سے دستکاریوں میں کام آنے والے اوزاروں اور آلات میں زبردست بہتری پیدا ہوئی۔

یہ نیا ماحول لگ بھگ آٹھویں صدی عیسوی تک کشمیریوں کو نکھارتا سنوارتا رہا اور طرح طرح سے اُن کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ تاہم اس نے اس زمانے کے بعد مزید ترقی حاصل نہیں کی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ آٹھویں صدی عیسوی کے بعد کشمیر میں سیاسی استحکام نہ رہا۔ سیاسی رنجشوں کے سبب خانہ جنگی اور افراتفری میں اضافہ ہوتا رہا جس کے نتیجے میں اس زمانے میں باقی کاموں کی طرح شالبافی بھی خاطر خواہ ترقی

نہ کر سکی بلکہ زبردست خرابی کا شکار ہو گئی۔ ذولچو (Dulacha) منگولوں کے حملے سے کشمیر کے حالات مزید ابتر ہو گئے جس کے نتیجے میں تباہی پورے کشمیر کا مقدر بن گئی عام لوگوں کے ساتھ ساتھ کاریگر بھی تباہ حال ہو گئے۔ جو کسی طرح بچ نکلا اس کی حالت غیر ہو کر رہ گئی۔

۱۳۲۰ء عیسوی کے بعد جب یہاں اسلام ظہور پذیر ہوا تو یہاں کے حالات بدل گئے۔ سماجی اور اقتصادی بہتری لانے کے لئے حکمرانوں نے معقول انتظامات کروائے۔ دستکاریوں کو دوبارہ ترقی دی گئی۔ شال بافی کو از سر نو منظم کیا گیا۔ زین العابدین (بڈشاہ) نے چند ایسے اقدامات کئے جن سے یہ "مُردہ فن" دوبارہ جی اٹھا۔ اُس نے کاریگروں کی حوصلہ افزائی۔ شال کے لوم (Loom) اور دوسرے آلات کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے بھی تمام تر انتظامات کئے گئے۔

مغل بادشاہوں نے شالبافی کے ہُنر کو مزید ترقی دی۔ کشمیری شال دُور دراز تک پہنچانے کی خاطر انہوں نے جدید طریقے پر منڈیاں تلاش کیں اور انہیں منظم کیا۔ افغان دور میں شالبافی کو پھر تقویت ملی اور اس زمانے میں کشمیری شال یورپ پہنچا۔

سکھ حکمرانوں نے بھی شالبافی کو وسعت دینے میں دلچسپی دکھائی لیکن وہ لوموں کی تعداد بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ انگریزوں نے پہلے ہی پشمینہ اون پر ایک قسم کی اجارہ داری قائم کر لی تھی۔ وہ گلاب سنگھ اور زور آور سنگھ کی مدد سے پشمینہ اون لداخ سے نورپورہ، شملہ اور پنجاب جیسے مقامات تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب انگلستان اور فرانس کے تاجر لداخ سے براہِ راست پشمینہ اُون منگاتے تھے جس سے شالبافی کو زبردست نقصان پہنچا۔

ڈوگروں کے دورِ اقتدار میں شالبافی مزید زوال پذیر ہوئی۔ اس زمانے میں کشمیری شال کے بدلے یورپ میں مشین سے بنایا جانے والا شال زیادہ مقبول تھا۔ مشینی شال سستا تھا اور یورپ کے لوگوں نے کشمیری شالوں کے بدلے ان ہی شالوں کا استعمال شروع کر دیا۔

۱۸۷۶ء کے بعد (جب فرانس اور جرمنی کے مابین جنگ ہوئی) کشمیر میں شالبافی کا خاتمہ ہوا اور شالبافوں اور دیگر کاریگروں نے شال بُننا ہی ترک کر دیا کیوں کہ اب شالوں کا یورپی خریدار عنقا تھا۔ ہندوستانی راجے اور مہاراجے بھی اب کشمیری شال خریدنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

o — (کشمیری سے ترجمہ
مترجم:- شفیق احمد)

نشاط انصاری

وازہ وان

تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ انسان کو اس دھرتی پر قدم رکھنے کے فوراً بعد جس اہم چیز کی ضرورت محسوس ہوئی وہ تھی اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی ضرورت ۔ انسان کی تین اہم اور بنیادی ضرورتوں میں سے کھانے پینے کی ضرورت کا امکان اُسے اپنے اردگرد کے ماحول میں ظاہری طور تھا ہی نہیں۔ لیکن قدرت نے اُسے اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے دوسرے تمام جانداروں پر ہر رنگ میں برتری عطا کی ہے۔ اسی فطری عظمت اور بزرگی کی وجہ سے ہی انسان نے زمین پر اپنی زندگی کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہی شعور سے کام لے کر اپنے سے کمزور اور کمتر درجہ کے جانداروں کو مغلوب کرنا شروع کرلیا۔ اپنے ابتدائی دور میں وہ اگرچہ پیٹ بھرنے کی خاطر گھاس پھوس، خودرو جنگلی سبزیوں، پھلوں اور درختوں کی چھال تک سے بھوک مٹانے کا طور طریقہ دریافت بھی کرچکا لیکن پھر بھی وہ اس محدود قسم کے کھانے پینے کے طریقوں پر کسی بھی طرح مطمئن نہ تھا جس کی وجہ سے وہ اس کام کے لئے کوئی متبادل راستہ تلاش کرنے

کیلئے فطری طور مجبور تھا

بن مانسوں کی طرح پہاڑی کھوہوں، غاروں، گپھاؤں اور سال خوردہ درختوں کے کھوکھوں میں زندگی بسر کرنے والے ابتدائی دور کے اُس انسان کے بارے میں عالمی تواریخ میں اسی طرح کے حالات ملتے ہیں کہ وہ گھنے جنگلوں، بیابانوں، صحراؤں اور پہاڑی دروں میں ننگا منگا زندگی بسر کرتا تھا اور نوکیلے پتھروں، لمبی لمبی ہڈیوں اور اسی قسم کے دوسرے تیز دھار والے آلات سے اپنے سے کم طاقت یا گزند پہنچانے والے جنگلی جانوروں، درندوں اور اُڑنے والے پرندوں کا شکار کرکے اُن کے گوشت کو کچا ہی چٹ کرجاتا تھا۔ چونکہ پکانے یا بھوننے کے لئے آگ ایک اہم وسیلہ ہوتا ہے لیکن آگ کے تصور تک سے اس دور کا انسان نابلد ہی تھا۔ لہٰذا وہ کچے گوشت کو ہی کھانے پر مجبور تھا اور اس لحاظ سے ابتدائی دور کے انسان اور درندے میں کوئی بھی فرق نہ پایا جاتا تھا۔

قدرت نے انسان کو اپنے سے کم طاقت دوسرے جانداروں کو مغلوب کرنے کا گُر ودیعت کیا ہے اور وہ اپنی شعوری صلاحیتوں سے ہی اپنے سے کمتر درجہ کی مخلوق پر غالب ہونے کی طاقت رکھتا ہے اور غالب و مغلوب کا یہ سلسلہ روزِ اول سے ہی چلا آیا ہے۔ موجودہ دور میں بھی یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور رہتی دنیا تک چلتا رہے گا۔ اس فلسفۂ حیات کو ہم "سروائیول آف دی فٹیسٹ" بھی کہہ سکتے ہیں اور یہی بات ڈاروِن کی تھیوری کا مطمعِ نظر بھی ہے۔ مُلّا جلال الدین رومی زندگی کی اس حقیقت سے متاثر ہوکر اشعار کے پیرایہ میں فرماتے ہیں ؎

خاق بخشد خاک را لطفِ خُدا — تا خورد آب و بروید صد گناہ
باز خاکے را ببخشد حلق و لب — تا گیاہش را خورد اندر طلب
چوں گیاہش خورد گشت حیوان رفت — گشت حیوان لقمۂ انسان رفت

ان اشعار سے ہی کچھ مترشح ہو رہا ہے کہ اس زمین پر جس قدر بھی نباتات پائے جاتے ہیں وہ زمین اور جمادات کے اجزاء کو چوس چوس کر اپنے لئے خوراک پیدا کرتے ہیں۔ حیوانات چونکہ نباتات سے اعلیٰ ہیں اس لئے وہ نباتات پر ہی پلتے رہتے ہیں۔ غالب و مغلوب کے اس فلسفے کی چھاپ انسانی ذہن پر اُس وقت سے پڑ چکی ہے جب سے انسان آدم بن کر اس زمین کی سطح پر نمودار ہو چکا ہے۔

انسان مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے زمین سے اُگنے یا اگائے جانے والے اجناس کی بصیرت پاکر زمین کو شگافتہ کرنے کے بعد اناج پیدا کرنے کا ارادہ بدیہی طور کر چکا ہوگا۔ اسکے نتیجے میں اُس نے گھنے جنگلوں اور پہاڑی دروں کو چھوڑ کر میدانی علاقوں، وادیوں اور ترائیوں میں آنا شروع کیا جیسا کہ کتابوں میں بھی درج ہے اور ارادتاً وہ دریاؤں، ندی نالوں اور نہروں کے کناروں پر سکونت اختیار کرنے لگا۔ اس طرح سے وہ میدانی علاقوں میں پہنچ کر زمین سے آہستہ آہستہ اجناس پیدا کرنے کے قابل بن گیا۔

یہ قدرتی بات ہے کہ جب انسان مدتوں بعد اپنی اس خاص ضرورت اور زندگی کی اولین بنیادی چیز کو حاصل کرنے میں قدرے خود کفیل بن چکا ہوگا تو اُسے اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں تبدیلی لانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور یوں انسان کا ایک ہی طرح کے کھانے پینے کے مراحل سے آگے کی طرف گزرنا لازمی بنا ہوگا۔

تہذیب و تمدن کے ابتدائی زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کرنے کے بعد انسان کو طرح طرح کے لذیذ اور ذائقہ دار پکوان اور کھانے تیار کرنے کا خیال چٹکیاں لے چکا ہوگا اور متنوع قسم کے پکوانوں اور ضیافتوں کی تیاری میں اگر کوئی چیز اس کے لئے بنیادی نوعیت کی تھی تو وہ صرف گوشت ہی تھا جس

کا استعمال وہ زمین پر قدم رکھتے ہی کر چکا تھا۔ کیوں کہ یہی گوشت انسان کی غذا کا وہ اہم جُز تصور ہوتا ہے جو طبّی لحاظ سے اس کی نشوونما، پرداخت اور قوتِ مدافعت میں کلیدی رول ادا کرتا آیا ہے۔ اُسے اس بات کا احساس ضرور ہوا ہوگا کہ گوشت کو ایک ہی ڈھنگ سے بھون کر کھانے میں صحیح لذت حاصل نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ ابتدائی دور میں پتھر اور دھات کے زمانے کا انسان جنگلی جانوروں، پرندوں اور درندوں کے گوشت کو کچّا کھانے کا ہی عادی تھا اور جب اس نے صدیوں کی صحرانوردی کے بعد آگ ایسی اہم چیز کو دریافت کر لیا تو وہ گوشت کو آگ پر سینک کر یا بھون کر استعمال کرنے لگا۔ مگر مدتوں ایک ہی طریقہ سے گوشت کو استعمال کرنا اور اس کی اکتاہٹ کا سبب بن جانا ایک بدیہی امر تھا۔ اسی لئے اُسے گوشت کھانے کے متبادل طریقوں کی جانکاری کا خیال لازمی طور آیا اور اپنے ارتقاء کے تیسرے دور میں انسان نے گوشت کو باضابطہ طور برتنوں یا ہانڈیوں میں پکا کر کھانا شروع کیا جیسا کہ کتبِ تواریخ میں درج ہے۔

انسان چونکہ جمالی قدروں کا عاشق، شیدا ہے، تبدیلیوں کا خوگر ہے اور لطیف جذبات اور پاکیزہ خیالات سے مملو ہے اس لئے اس نے ذائقہ دار پکوان اور کھانے تیار کرنے کے سلسلے میں کوششوں پر کوششیں کر لی ہونگی۔ اس قسم کی کوششوں میں دنیا کے ہر خطے میں بسنے والے لوگوں میں ہم آہنگی کا ہونا ایک لازمی بات ہے لیکن جو جو ممالک اور خطے تاریخی لحاظ سے تہذیب و تمدن کے مرکز مانے جاتے تھے وہ اس کوشش میں ایک دوسرے سے آگے نکل چکے۔ چنانچہ وسط ایشیا کے سبھی ممالک میں سے ایران ہی ایسا ایک ملک ہے جو اس بات میں دوسروں سے سبقت لے چکا۔ جبھی تو ایرانی لوگ گوشت سے طرح طرح کے پکوان اور کھانے تیار کرنے میں جدّت پیدا کرنے میں سرِ فہرست مانے جاتے ہیں۔

چنانچہ گوشت سے طرح طرح کی لذیذ ضیافتیں اور مزے دار پکوان تیار کرنے میں جو رول ایرانیوں نے ادا کیا، وہ ثقافت کی تاریخ کا ایک اہم باب خیال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی اس پیش رفت کا براہِ راست اثر کشمیر نے مکمل طور قبول کیا۔ کیوں کہ ظہورِ اسلام کے بعد ایرانی کلچر، ایرانی تہذیب و تمدن اور ایرانی ثقافت نے کشمیر خاص کر وادی میں زندگی کے ہر شعبے پر اپنے دیرپا اثرات مرتب کئے۔ بالکل اسی اثر کے تحت ایران اور ایرانی کلچر نے ہمارے یہاں کے لباس میں گلوبند، دستار، موزہ، فرغل، موزہ بند، رومال، سینہ بند، ایزار، کلاہ، ایزار بند، عرق چین، اچکن، شیروانی، چوغہ، عبا، قبا، عمامہ، طرہ، دستانہ، پیراہن، قمیض، زیر جامہ، نقاب، ایسے نئے نئے البسہ کے نام دئے۔ زیورات میں حلقہ بند، دستانہ، انگشتری، پازیب، بازوبند اور نگینہ۔ کھانوں میں بریانی، کلچہ، فالودہ، باقرخوانی، شوربا، فرنی، شیرمال، نان، منتنجن، مزعفر پلاؤ، زردہ ایسے نام دئے اور گوشت سے تیار کئے جانے والے سالنوں اور پکوانوں میں کباب، قیمہ، روغن جوش، آب گوش، یخنی، قورمہ، مرغ مسلّم اور گوشتابہ کی متنوع ضیافتوں کا اضافہ کیا۔ اگرچہ کئی لوگوں کے کہنے کے مطابق (جو ایران گئے ہیں) اس نوعیت کی متنوع ضیافتیں اب وہاں پائی نہیں جاتیں نہ دوسری بات ہے۔ لیکن کشمیر میں ان پکوانوں کی ابتدا ایرانیوں کے توسط سے ہی ہو چکی ہے۔

گوشت کو مختلف طریقوں سے پکانے کے لئے مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہاں باورچیوں کا ایک ایسا گروہ وجود میں آگیا جن کو "وازہ" کہا جاتا ہے۔ وازہ اصل میں آشپز یا طبّاخ کو کہتے ہیں۔ جہاں تک وازہ لفظ کا تعلق ہے اس کا ماخذ سنسکرت زبان کا "واج" لفظ ہے۔ اس سہ حرفی سنسکرت لفظ کا آخری

حرف یعنی جیم (ج) بہ فتحہ پڑھا جاتا ہے اور کثرتِ استعمال سے "واج" کا یہی لفظ بگڑتے بگڑتے "وازہ" کی صورت پا گیا۔ ہمارے گھرانوں میں کھانا پکانے والی خواتین وازہ وان تیار کرنے کے فن سے چونکہ نابلد ہوتی ہیں۔ اسی لئے یہاں ایک ایسا طبقہ جگہ جگہ پایا جانے لگا جنہیں گوشت سے طرح طرح کے سالن تیار کرنے میں زبردست مہارت حاصل ہوتی ہے اور وہ نہایت مہارت، تحمّل اور ایک خاص طریقے سے وازہ وان تیار کرتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لئے طبّاخ کو بہت ہی محنت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ وازہ وان تیار کرنے کے لئے ہمارے گھرانوں میں معمول کے محدود باورچی خانوں میں بنے ہوئے چولھے کام نہیں دیتے بلکہ اس کیلئے باورچی خانوں کی چار دیواری سے باہر کھلی جگہ یا پھر مکان کے صحن کے ایک گوشے میں آگ روشن کی جاتی ہے اور اُس پر بہت سے برتن رکھ کر پکوان تیار کئے جاتے ہیں۔ الاؤ سے قطع نظر اس کام کے لئے اینٹوں یا پتھروں کی قریباً ایک فٹ اونچائی کی دو متوازی عارضی دیواریں سی بھی بنائی جاتی ہیں جسے کشمیری میں "وُر" کہتے ہیں جہاں (درمیانی جگہ میں) سوکھی لکڑی کے بڑے بڑے کندوں کو جلایا جاتا ہے اور اینٹوں یا پتھروں کے سہارے بیک وقت دس بارہ دیگ، دیگچے اور ہانڈیاں رکھی جاتی ہیں جن میں طرح طرح کے مرغن سالن تیار کئے جاتے ہیں۔

سینکڑوں لوگوں کی خاطر قسم قسم کی لذیذ اور ذائقہ دار گوشت کی ضیافتیں تیار کرنے کے لئے یہ مخصوص جگہ "وازہ وان" کہلاتی ہے یعنی وہ خاص جگہ جہاں وازہ یا طبّاخ متنوع قسم کی ضیافتوں کو باورچی خانے سے الگ جگہ پر تیار کر سکے۔ وازہ وان اصل میں دو لفظوں کا مرکب ہے — وازہ اور وان، وان کشمیری میں دکان کو کہتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح ایک دکان میں روزمرہ کی بکنے والی چیزیں مختلف برتنوں میں کافی جگہ گھیرے ہوئے ہوتی ہیں اسی طرح طبّاخ

کے سامنے، دائیں بائیں اور آگے پیچھے تانبے کے برتن دیگ، دیگچے اور پتیلیاں وغیرہ بکھری ہوئی ہوتی ہیں جن میں کہ وہ صبح سے شام تک یا شام سے دوسرے دن دوپہر تک پکوانوں کو پکاتا رہتا ہے۔ وازہ وان پر چونکہ بہت سا روپیہ پیسہ خرچ ہوتا ہے اس لئے اس کا اہتمام اکثر شادی بیاہ یا پھر کسی اور ایسی ہی تقریب پر کیا جاتا ہے اور یہ مختلف درجوں کا ہوا کرتا ہے یعنی کم درجہ والا، درمیانی درجے کا اور بہت ہی اعلیٰ پایہ کا یعنی جو جس قدر دھن دولت والا ہو وہ اُسی حساب سے اس پر روپیہ پیسہ خرچ کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر ہمارے سماج کے بڑے بڑے سرمایہ دار اور صاحب ثروت اپنی امارت اور سرمایہ داری کی نمود و نمائش کی خاطر ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی خاطر کوئنٹلوں کے حساب سے گوشت پکواتے ہیں۔

گوشت سے تیار کئے جانے والے پکوانوں اور سالنوں کے لئے اکثر و بیشتر بکروں اور بھیڑوں کا ہی گوشت استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ بھیڑیں اور بکرے بکریاں عموماً ایک سال کی عمر سے کم کی ہوتی ہیں اور جتنے بھی پکوان تیار کرنے مقصود ہوں ان کے لئے بکرے اور مینڈھے کے مخصوص اعضاء کے گوشت کا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے میں آشپز کو طول امل سے کام لینا پڑتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قصاب بکرے یا مینڈھے کو ذبح کرتا ہے تو اس سے گوشت کو بغیر کتر بیونت کے تول کر طباخ کے پاس لایا جاتا ہے جو اطمینان اور ہوشیاری کے ساتھ مختلف اعضاء سے گوشت کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر الگ الگ برتنوں میں جمع کرتا ہے۔ یہ گوشت جس قدر تازہ ہو اسی قدر پکوان اچھے بنائے جا سکتے ہیں کیوں کہ باسی گوشت سے ذائقہ دار پکوان تیار نہیں ہو سکتے۔ جس طریقے سے طباخ بھیڑ بکریوں کے مختلف اعضاء سے گوشت کاٹ کر اور پکوان بنایا کرتا ہے اُس کی تفصیل سرسری طور پر یہاں بیان کرنا ناگزیر ہے کہ کن مراحل سے ایک خاص پکوان کو گزارا جاتا ہے:۔



وازہ وان — ایک منظر

کباب۔ کباب دو طرح کے بنائے جاتے ہیں ایک شامی کباب اور دوسرا سیخ کباب۔ لیکن شادی بیاہ کے موقعہ پر جو کباب تیار کیا جاتا ہے وہ سیخ کباب ہی ہوتا ہے اور اس کے لئے بکرے اور مینڈھے کی ران یا کنگے جیسے اعضا سے کاٹا ہوا بغیر چربی کا گوشت استعمال ہوتا ہے۔ کباب بنانے کے لئے اس گوشت کو ایک خاص قسم کی لکڑی کے مسطح گول تختے پر بڑے سے قصابی چاقو سے ریزہ ریزہ کیا جاتا ہے۔ اس عمل کے دوران گوشت میں نمک، الائچی سبز، بادیانہ، الائچی کلاں، سونٹھ، زیرہ ایسے مصالحہ جات ملائے جاتے ہیں پھر اس گوشت میں لس آہٹ پیدا کرنے کے لئے انڈے ملانے کا مرحلہ آجاتا ہے اور ایسا کرنے سے کباب کا گوشت سیخ پر خود بخود چپک کر رہ جاتا ہے اور کباب لگے ہوئے سیخ کو بعد ازاں دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھ کر سینکا جاتا ہے۔ بھن جانے کے بعد گھی، ڈالڈا یا تیل میں اسے خوب تلا جاتا ہے اور تلنے کے بعد چاولوں سے بھری ترامی* پر اسے قرینے کے ساتھ سجایا جاتا ہے اور جب محفل میں کھانا لایا جاتا ہے تو کھانے والے سب سے پہلے کباب کے ہی چٹخارے بھرتے ہیں۔

طبیق ماز۔ طبیق ماز بھی وازہ وان کی ایک انوکھی ضیافت مانی جاتی ہے۔ اس کے لئے مینڈھے کی پسلیوں کا گوشت معہ ہڈیوں کے استعمال ہوتا ہے اس کے بنانے اور پکانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مینڈھے کی ثابت پسلیاں کسی بڑے برتن میں خوب اُبالی جاتی ہیں۔ اس دوران اس میں ہلدی کی ہلکی سی آمیزش کی جاتی ہے بعد ازاں چاقو سے اسے مستطیل شکل کے قتلوں میں کاٹا جاتا ہے۔ پھر اُن مستطیل ٹکڑوں کو گھی میں تل کر اچھی طرح سے گھی چسایا جاتا ہے تاکہ طبیق ماز ٹکڑے کی اوپری سطح بھربھری ہوجائے اور ہڈیوں کا رنگ قدرے سیاہی مائل ہوجائے۔ تیار ہونے کے بعد اس

* تانبے کا بڑا سا پلیٹ جس میں چار اشخاص بیک وقت مل کر کھانا کھاتے ہیں۔

پر ورقِ نقرہ چڑھایا جاتا ہے۔ پھر ترامی (پلیٹ) پر اسے بھی سجایا جاتا ہے۔ اگر گرم گرم ہی کھایا جائے تو یہ اپنا پورا ذائقہ دے سکتا ہے۔

رستہ۔ رستہ کے لئے بھی بکرے یا مینڈھے کے کنگے یا ران کا گوشت استعمال ہوتا ہے۔ کباب کے گوشت کی طرح اسے لکڑی کے تختے پر سائیدہ بنانے کے بجائے گول یا مربع پتھر کی سل پر رکھ کر لکڑی کے ہتھوڑے (گوشپڑ) سے خوب کوٹا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ اس میں مصالحہ جات کے علاوہ چربی بھی ملائی جاتی ہے۔ کوٹنے کے دوران سخت قسم کے ریشے اس میں سے باہر نکالے جاتے ہیں۔ رستہ کے لئے استعمال ہونے والے گوشت کو پتھر کی سل پر اس قدر کوٹا جاتا ہے کہ چربی کی ملاوٹ سے اس کا رنگ سفیدی مائل (ہلکا پیازی) ہوجاتا ہے۔ جب رستہ کا گوشت مکمل طرح سے سائیدہ اور لسلسا بنایا جاتا ہے تو طباخ اسے چھوٹے چھوٹے پیڑوں کی شکل دے کر الاؤ پر رکھی ہوئی دیگ میں ڈالتا جاتا ہے اور پھر ان کو خوب اُبالا جاتا ہے اور یہ از خود پھول جاتے ہیں۔ آج سے سالہا سال قبل پتھر کی سل پر کوٹنے کے بجائے رستہ کے لئے گوشت کو لکڑی کی بڑی اوکھلی میں موسل سے کوٹا جاتا تھا مگر جب سے تراشی ہوئی پتھروں کی سلوں کا رواج اس کام کے لئے جگہ پاچکا تب سے اوکھلی والا سلسلہ ختم ہوگیا۔

آب گوش۔ وازہ وان میں سب سے زیادہ لذیذ، سب سے مزے دار اور بے ضرر پکوان آب گوش ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بنانے کے لئے بکرے یا مینڈھے کے کنگے اور پشت کے آخری حصے کا گوشت استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے گوشت کو اُبالا جاتا ہے پھر اُبلے ہوئے گوشت کو دودھ میں ڈال کر خوب پکایا جاتا ہے اور الاؤ پر اسے اُس وقت تک برابر رکھا جاتا ہے جب تک اس کا دودھیا شوربا گاڑھا نہ ہوجائے۔ اس میں زیادہ تر الائچی سبز، دارچینی اور الائچی کلاں

حسب مقدور ڈالے جاتے ہیں۔ ہلدی اس میں نہیں ڈالی جاتی۔ اس پکوان کا شوربا لوگ بہت پسند کرتے ہیں اور ہر کوئی ذوق و شوق سے زبان کے چٹخارے لیتا ہے۔

روغن جوش۔ یوں تو بھیڑو کے ہر ایک عضو کا گوشت روغن جوش کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر زیادہ تر کمر کا حصہ اس کے لئے موزوں رہتا ہے۔ اس کی بوٹیاں دوسرے پکوانوں کے مقابلے میں کچھ بڑی ہی رکھی جاتی ہیں۔ اس میں گھی قدرے زیادہ ہی ڈالا جاتا ہے اور سارے مصالحے بھی اس میں ڈالے جاتے ہیں۔ اور پھر بالکل سرخ رنگ کا بنانے کے لئے زعفران کے ریشوں کا تھوڑا سا محلول روغن جوش میں خصوصیت کے ساتھ ڈالا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تاج خروس سے جو جوشاندہ تیار کیا جاتا ہے وہ بھی (سرخ) رنگ میں اضافہ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا شوربا بہت ہی ذائقہ دار ہوتا ہے۔

ہندی روغن جوش۔ بھیڑو کے سینے اور پسلیوں کے گوشت سے ہندی روغن جوش بنایا جاتا ہے۔ اس میں بھی تاج خروس کا جوشاندہ استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ اس میں قدرے کھٹاس پیدا کرنے کے لئے دہی بھی ملایا جاتا ہے۔

دانہ وُل قورمہ۔ اس پکوان میں بھیڑ و یا بکرے کے سینے کا گوشت زیادہ موزوں رہتا ہے۔ یہ سالن جب پک کر تیار ہوتا ہے تو اس میں میٹھا ہی ڈال دیتے ہیں اور خوشبو کے لئے سبز دھنیا کاٹ کر ملایا جاتا ہے۔

دُڈ یا دَنہ پھول۔ اس فوزائیدہ وردانٹی میں کام آنے والا گوشت بکرے یا بھیڑو کے لنگے یا رانوں کے نچلے حصے سے چُن کر لیا جاتا ہے اور کباب و طبق ماز کے ساتھ ہی ترامی پر بھی رکھا جاتا ہے۔

مرزہ وانگن قورمہ۔ قورمہ کے لئے بھیڑو یا بکرے کے ہر ایک حصے اور عضو

میں سے گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیوں کا انتخاب کیا جاتا ہے اور خاص کر گوشت کے ان حصوں کو اس کے لئے چُنا جاتا ہے جو کُر کُری (چبانے والی نرم ہڈی) قسم کے ہوں۔ مصالحہ جات سے قطع نظر اس میں سُرخ مرچیں قدرے زیادہ ہی ڈالی جاتی ہیں۔ اسی لئے اس کے ساتھ دہی کا استعمال لازمی قرار دیا گیا ہے۔

تارکھ ماز۔ وازہ وان میں اس ورائٹی کا نیا نیا اضافہ کیا گیا ہے اور اس کے لئے اکثر بھیڑو کے کنگے کے نچلے سروں کو کام میں لایا جاتا ہے۔

میتھ ماز۔ یہ پکوان سُکھائی ہوئی میتھی اور بکرے یا بھیڑو کے معدے (ڈمبنی) سے تیار کیا جاتا ہے۔ معدے کو پہلے اُبالا جاتا ہے اور اس پر جو ریشول کی تہیں ہوتی ہیں ان کو صاف کیا جاتا ہے۔ پھر چاقو سے لکڑی کے تختے پر اُسے ریزہ ریزہ کر دیا جاتا ہے اور پھر دونوں چیزوں کو تیل میں تل کر پکایا جاتا ہے۔

گوشتابہ۔ اگر گوشتابہ کو حاصل وازہ وان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے لئے بکرے یا بھیڑو کے کنگے اور ران کے نرم نرم حصوں کے گوشت کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ پھر لکڑی کے موٹے ہتھوڑوں (گوشت پُر) سے پتھر کی سِل پر نہایت تحمل اور قرینے کے ساتھ کوٹا جاتا ہے۔ اس دوران اس میں التصاق پیدا کرنے کے لئے ایک خاص مقدار میں چربی ملائی جاتی ہے جس سے اس میں مکمل طور لیس پیدا ہوتی ہے۔ پتھر کی سِل پر کوٹتے کوٹتے گوشتابہ کے گوشت کا رنگ سفیدی مائل (ہلکا پیازی سا) بن جاتا ہے۔ جب گوشت کو مکمل طور ملائیدہ بنایا جاتا ہے تو طباخ اس کے بڑے بڑے گول گول پیڑے بناتا ہے۔ اُدھر سے الاؤ پر بڑی سی دیگ میں دہی کو خوب اُبالا جاتا ہے اور اُبلتے ہوئے دہی میں اُن پیڑوں کو ڈالا جاتا ہے اور جب اس کا شوربا گاڑھا ہونے لگتا ہے تو اُن گوشت کے گولوں کا سائز پھول کر دو گنے سے بھی زیادہ ہوتا ہے اور اس کی خوشبو سے روح تازہ

ہوجاتی ہے ۔ گوشتابہ جس قدر بڑے سائز کا بنے اسی قدر آشپز کی فنکاری تسلیم کی جاتی ہے ۔ گوشتابے کو دیکھ کر ہی ہر کسی کے منہ میں پانی آجاتا ہے ۔ کسی کی ناراضگی یا غصے کو گوشتابہ ہی پانی کر دیتا ہے ۔

وازہ وان میں ایک زمانے میں یہی سالن اور دو چار چٹنیاں ہی شامل تھیں لیکن اب ان روائیتوں کے علاوہ اور بھی کئی قسموں کے پکوان شامل وازوان کیے گئے ہیں مثلاً زرشک قورمہ (گوشت کی وہ قسم جس میں زرشک کا استعمال ہو) ، کشمش قورمہ (گوشت کا وہ پکوان جس کے ساتھ کشمش ملائے جائیں) پمپوشس تھُول (انڈے کو اُبال کر کنول کے پھول کی شکل کا بنایا جانا) تارکہ ٹھول (یہ بھی انڈے سے بنایا جاتا ہے اور انڈا پہلو دار تیار بنتا ہے) ۔

ان سارے پکوانوں کے علاوہ قسم قسم کی چٹنیاں وازہ وان کا مستقل حصہ بنی ہوئی ہیں اور ان میں بادام چٹنی ، زرشک چٹنی ، اخروٹ کی گریوں کی چٹنی ، کاجو کی چٹنی اور سبز مرچوں کی چٹنی قابل ذکر چٹنیاں ہیں ۔ شامی کباب ، مچھلیوں کے کباب ، پنیر اور گچھیوں (سماروغ) کے پکوانوں نے بھی وازہ وان میں اپنا وجود منوالیا ہے اور ان چیزوں کے علاوہ مُرغ مُسلّم وازہ وان کی شان کو دوبالا کرتا ہے ۔ انکے علاوہ زردہ اور متنجن و فرنی یا حلوا وازہ وان میں شامل ہیں ۔

وازہ وان چونکہ اسلامی کلچر اور ثقافت کی ایک بہترین پیش کش ہے ، اسی لئے کشمیر میں اس کا چلن زیادہ تر مسلمان گھرانوں میں ہی ہے شادی بیاہ کی محفلوں ، دوست واحباب کی مجلسوں ، عصرانوں ، عشائیوں اور کنونشنوں اور عید ملنوں یا ایسی ہی دوسری تقریبوں پر جب مہمانوں کے سامنے وازہ وان کو پیش کیا جاتا ہے تو چار چار آدمی ایک ہی ترامی (بڑی سی پلیٹ) میں اکٹھے کھانا کھانے لگتے ہیں ۔ وازہ وان

میں گوشت کی جو خصوصیات ترامیوں پر ہی سجائی ہوئی ہوتی ہیں اُن میں کباب ، طبق ماز ، میتھ ماز ، دُنی / دہنہ پھول یا ناٹھ اور مُرغ مسلم قابل ذکر ہیں ۔ جونہی کھانا شروع ہوتا ہے تو طباخ دوسرے تیار کئے گئے پکوانوں کو درمیانی قسم کے قلعی دار دیگچوں میں یکے بعد دیگرے لاتا جاتا ہے اور نہایت ہی فن کاری اور سلیقے کے ساتھ ترامیوں پر سالن ڈالتا جاتا ہے اور ان میں سے سب سے پہلے رستہ کی گردش ہوتی ہے ۔ اس کے بعد روغن جوش کی باری آتی ہے ۔ پھر دانہ ولہ قورمہ کو پلیٹوں پر ڈالا جاتا ہے ۔ بعدازاں آب گوش اور اس کے بعد مرتہ وانگن قورمہ اور آخر پر گوشتابہ سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے ۔ گوشتابے کی باری آتے ہی مہمان خود بخود سمجھ جاتے ہیں کہ اس کے بعد اور کوئی سالن نہیں آئے گا ۔ گوشتابہ کی گردش وازہ وان کا کلائمکس ہوتا ہے ۔ پلاؤ ہو یا زردہ اور دوسری چٹنیاں اور دہی کے بڑے بڑے مٹی کے پیالے (کھاسی) کھانا کھانے کی شروعات کے ساتھ ساتھ ہی ہر ترامی کے اردگرد سجائے جاتے ہیں اور مہمان اپنی مرضی کے مطابق ان میں سے ہر ضیافت کو ٹیسٹ کرتے ہیں ۔

کشمیر کی منفرد ثقافت کا یہ اہم حصہ کشمیر کی ہی ایجاد ہے اور اس کا شہرہ اب چہار دانگ عالم میں پہنچ چکا ہے اور یوں یہ ہماری وادی تک ہی محدود نہیں رہا ہے بلکہ کشمیر سے باہر سارے ہندوستان اور بدیسی ملکوں میں بھی بہت پسند کیا جارہا ہے ۔ یہاں کے تجربہ کار طباخ اب ملک اور بیرون ملک اپنے فن کا مظاہرہ کرکے وازہ وان سے غیر کشمیریوں کو متعارف کرنے میں اپنا کردار نبھاتے ہیں ۔ وازہ وان اب یہاں کی سیاست پر بھی پوری طرح چھا چکا ہے ۔

شیام لال سادھو

سوامی امرناتھ

اکثر لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اس کائنات کا خالق، اس کا بنانے والا ایک لامحدود طاقت ہے، وہی اس کی ہر لحاظ سے نگہداشت کرتا ہے اور وہی آخر اسے مخصوص وقت پر فنا کر دیتا ہے۔ اس لامحدود طاقت کو متعدد لوگ ایک قسم کی شخصیت تصور کرتے ہیں جس کا کوئی شریک نہیں جو واحد ہے۔ لوگوں نے اس کے لاکھوں نام رکھے۔ بعض لوگ اسے خدا کے نام سے پکارتے ہیں۔ بعض God اور بعض بھگوان اور شیو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شیو کا مطلب ایک ایسی طاقت یا شکتی ہے جو اس کائنات کا بھلا چاہتی ہے اور مستفیض کرتی ہے۔ یہ شش جہات یہ ساری سرشٹی اسی لامحدود طاقت میں سمائی ہوئی ہے ٹھیک اسی طرح جیسے ایک صنوبر کا قدآور درخت ایک چھوٹے سے بیج کے حقیر سے دانے میں پنہاں رہتا ہے۔ اس کے بعد یہ سرشٹی وسعتوں سے ہمکنار ہونے کے بعد اپنا وقت مکمل کر کے پھر ایک بار شیو میں سما جاتی ہے۔ بھگوان شیو کے اور بھی بہت سے نام ہیں جن میں شنکر مہاراج، مہادیو اور شمبھو ناتھ بھی شامل ہیں۔

ہمارے ملک ہندوستان میں کروڑوں لوگ بھگوان شیو کی پوجا کرتے ہیں۔ سینکڑوں تیرتھ پہاڑوں کی چوٹیوں، سمندر کے کناروں اور گھنے جنگلوں میں واقع ہیں جہاں یاتری طویل اور صبر آزما مسافت طے کر کے پہنچ جاتے ہیں اور اپنی تمام تر عقیدت اور شردھا سے پوجا کرتے ہیں۔ سوامی امرناتھ کا تیرتھ استھان، جہاں شیو بھگوان نے دیوتاؤں کو درشن دے کر انہیں امرت پلایا۔ پانچ بلند ترین تیرتھوں میں سے ایک ہے۔ دیگر چار تیرتھ ہیں — بدری ناتھ (ہمالیہ) جگن ناتھ (اڑیسہ)، دوارکا ناتھ (سوراشٹر) اور رامیشورم (تامل ناڈو)۔ امرناتھ کی یاترا کے لئے نہ صرف ہندوستان کے اطراف واکناف سے ہندو بڑی تعداد میں آتے ہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک سے بھی یاتریوں کی ایک خاصی تعداد یہاں درشن کیلئے آتی ہے۔ امرناتھ کا لفظی معنی ایک ایسی طاقت ہے جو امر، لافانی اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اس تیرتھ کے ساتھ امرناتھ نام کی کیا مناسبت ہے؟ اس کی وضاحت اگلے صفحات میں ہوگی۔

جس تیرتھ کو آج امرناتھ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کا اصلی نام امریشور بتایا جاتا ہے۔ کلہن پنڈت کی تحریر کے مطابق راجہ نر کے زمانے میں بھی (لگ بھگ ایک ہزار قبل مسیح) اس کا نام امریشور ہی تھا۔ "نیل مت پوران" میں بھی اسی نام سے اس کا ذکر ملتا ہے جو نراج اور شکھدیو نے بھی یہی نام استعمال کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ امرناتھ کا نام ابھی تین سو سال قبل ہی مقبولیت حاصل کر گیا ہے۔

امریشور تیرتھ بستی سے کافی مسافت پر واقع ہے۔ میلوں لمبے راستے پر صرف برف ہی برف نظر آتی ہے یا پھر مرغزار اور جنگلی گھاس۔ دور دور تک کوئی درخت دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں کوئی مندر نہیں ہے۔ صرف پُر جلال برف پوش اونچی اونچی

چوٹیاں ہیں، شور مچاتے ندی نالے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ جو ہڈیوں کو منجمد کردیتے ہیں اور بڑی بڑی گول چٹانیں ـــــ!

ان ہی پہاڑوں میں ایک تنگ گھاٹی کی گود میں ایک بڑی گپھا واقع ہے جیسے کوئی الف لیلوی دیو منہ کھولے کھڑا ہو ـــــ! گپھا کا دہانہ تقریباً پچاس فٹ لمبا ہوگا اور اس کی چوڑائی اس سے زیادہ ہی ہوگی۔ گپھا کی گہرائی اس سے قدرے کم ہوگی۔ اسی میں برف کا ایک لنگ ہے۔ برف کی یہ منجمد مورتی اسی انداز میں نظر آتی ہے جیسے شیو مندروں میں ہم اکثر دیکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ سفید رنگ کی ہے اور منجمد ہونے کی وجہ سے سمٹ سی گئی ہے جبکہ باقی کالے پتھروں سے تراشی جاتی ہیں۔ اس لنگ کی یہ خصوصیت ہے کہ جب اماوس کے بعد چندرما دن بدن بڑھنے لگتا ہے تو یہ بتدریج بڑھتا جاتا ہے اور پھر پونم کی رات جب چندرما اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آسمان کے کنارے پر دمکنے لگتا ہے تو یہ عظیم برفیلی قلم جیسی مورتی اپنی پوری جسامت اور قدوقامت میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد چندرما آہستہ آہستہ گھٹنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ لنگ بھی قطرہ قطرہ پگھلنے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

امرناتھ سوامی یا امریشور کی مہما آخر کیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ جب یہ کائنات بھگوان شیو میں سما گئی تھی تو اس کے من میں ایک ترنگ سی بیدار ہو اٹھی' اور اس نے اس کائنات کو اجاگر کرنے کی خواہش کی۔ چنانچہ پرکرتی معرض وجود میں آئی۔ اسی پرکرتی میں سے وہ دنیا بھی پھوٹ پڑی جو خاک' باد' آب' آتش وغیرہ جیسے عناصر سے بنی ہے۔ اسی کے ساتھ زندگی کا بھی ظہور ہونے لگا' دیوتا پیدا ہونے لگے اور پھر یم دوت ابھر آیا اور اس نے اندر اور دیگر دیوتاؤں کے رنگ میں بھنگ ڈالنا شروع کیا۔ دیوتا اس کی حرکتوں سے تنگ آکر پرم شیو کی شرن میں

آکر التجا کرنے لگے کہ ہم یم دوت سے کیونکر خلاصی حاصل کرسکتے ہیں؟ بھگوان ان سے پرسن ہوئے۔ انہوں نے چندر کو چیر کر امرت حاصل کیا۔ ایک ایسا رس جس کا بس ایک قطرہ کسی کو بھی لافانی بنا سکتا ہے۔ امرت کی جو دھارا وہاں نیچے گری۔ اس نے امراوتی ندی یا امرگنگا کا روپ دھارن کیا۔ دیوتاؤں نے امرت پیا اور وہ موت کے خوف سے آزاد ہوگئے۔ اب ان کی آہ وزاری رنگ لائی اور پرم شیو بلاکم وکاست انہیں اپنے درشنوں سے فیضان بخشتے۔ اس کے بعد منجمد لنگ کا سروپ وقوع ہوا' جو آج بھی اسی حالت میں ہے۔ دیوتاؤں سے کہا گیا کہ اب تم امر ہوگئے اور اس مقام کے متعلق یہ بشارت دی گئی کہ یہ اس سرشٹی کی شام تک امریشور کے نام سے معروف ہوگی کیوں کہ اس مقام کا یہ اعجاز ہوگا کہ یہاں پہنچ کر ہر شخص امر ہو جائے گا۔

بنی نوع انسان ہمیشہ امرت کی خواہش میں سرگرداں رہا ہے۔ جب امریشور گپھا کی خبر قرب وجوار میں پھیل گئی تو یہاں یاتریوں کا تانتا بندھنے لگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس یاترا کی چرچا کا سلسلہ کس خاص دور میں شروع ہوا۔ راج ترنگنی میں[۲] دو واقعات اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ راجہ سندھیمان (ق م ۳۴ سنہ سے ب م ۱۶ سنہ تک) برفیلے لنگ کی پوجا کیا کرتا تھا جس سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ لوگوں نے امریشور کا لنگ سالہا سال پہلے دریافت کرلیا تھا اور ان کا اس بات میں مکمل اعتقاد تھا کہ اس کی پوجا سے منش کا جنم سپھل ہوسکتا ہے۔ دوسرا واقعہ اس سے بہت پہلے ہوا ہے ـــــ راجہ نر (راج ترنگنی۔ ترنگ اول) کے عہد میں ایک برہمن اور اس کا سسر پریوار کو لے کر راجدھانی سے نکلے اور شیشرم ناگ کی طرف ہولئے جو امریشور کے راستے میں پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہمارے پاس "نیل مت پوران" کی شہادت بھی موجود ہے یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی ہے کہ سوامی امرناتھ جی کی یاترا کتنے ہزار

برسوں سے بھگتوں کے من میں فیضان کا دیپ جلاتی رہی ہے۔ آثار و قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی خاص وقت تک لوگ مسلسل اس یاترا پر جاتے رہے ہیں لیکن پھر ناسازگار حالات، موسمی مشکلات یا پھر دیگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ یاترا نہیں ہو سکی ہوگی اور رفتہ رفتہ اسے لوگوں نے فراموش کیا ہوگا اور نہ جانے کتنے برسوں تک پوتر گپھا کی طرف جانے والے برف پوش راستے یاتریوں کی دید کو ترستے رہے ہوں گے۔

۱۹۲۵ء میں یاترا کے ایام کے دوران کشمیر میں زبردست سیلاب آیا خاص طور پر پہلگام اور امرناتھ کے اطراف میں طوفان باد و باران نے طوفان مچایا۔ سینکڑوں یاتری جن میں سادھوؤں کی ایک خاصی تعداد شامل تھی، اس سیلاب کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس کے بعد کے دو تین برسوں تک یاتری پوتر گپھا تک جانے سے اجتناب کرنے لگے۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے حالات کے بعد گنگا بل کی یاترا کافی اثر انداز ہوئی اور شاردا کی یاترا طاق نسیاں ہو گئی۔ لیکن بعد میں یہ کن حالات میں ایک بار پھر ابھر آئی، اس کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ مٹن کے ملک گھرانے کے طفیل اس گپھا کی بازیافت ہوئی ہے اور یاترا کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک گھرانے کا ایک بزرگ اپنے مویشیوں کا ریوڑ لے کر مہاگنس کی چوٹیوں کے اس پار پنج ترنی کے اطراف و اکناف میں گھوم پھر رہا تھا۔ یہ بزرگ اس گپھا اور برفیلے لنگ کی موجودگی سے قطعی ناآشنا تھا۔ ایک دن اس کے کئی بھیڑ ریوڑ میں جمع نہیں ہوئے۔ وہ پریشان ہو کر ان کی تلاش میں نکلا اور قرب و جوار کے ہر گوشے میں انہیں تلاشتا رہا۔ اسی دوران اسے یہ گپھا نظر آئی۔ اس نے برف کا شیولنگ بھی دیکھا۔ ابھی یہ اپنی حیرت پر قابو نہیں پا سکا تھا کہ اسے کبوتروں کی ایک جوڑی بھی گپھا میں نظر آئی۔ اس کی آنکھیں

حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کیوں کہ اس سارے کوہستانی علاقے میں دُور دُور تک کہیں بھی کوئی پرندہ نظر نہیں آتا تھا۔ مٹن واپس پہنچتے ہی اس نے ان چشم دید واقعات کا ذکر پنڈتوں اور برہمنوں سے کیا۔ انہوں نے اپنے اسلاف سے اس کے متعلق زبانی سُن رکھا تھا لیکن نہ وہ خود کبھی وہاں گئے تھے اور نہ انہیں راستوں کی آگہی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ ملکوں کے ہمراہ گپھا تک آ گئے اور درشن کئے۔ اب طے یہ پایا کہ ملک گھرانے کے لوگ ہی اس دشوار گذار پہاڑی راستے پر یاتریوں کی راہنمائی اور نگہداشت کیا کریں گے۔ مٹن کے پنڈتوں نے بھی اس کی ذمہ داری قبول کی۔ یاتریوں سے اس یاترا کے لئے بعض ٹیکس حاصل کئے جاتے تھے جیسا کہ اُس زمانے کا دستور تھا۔ اس کے علاوہ یہاں یاتری بھگوان کو چڑھاوا بھی ارپن کرتے تھے۔ اس آمدنی میں سے ملکوں اور پنڈتوں کو برابر کا حصہ ملتا تھا۔ اب یاتریوں سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ لیکن چڑھاوے کی جو رقم جمع ہو جاتی ہے جس میں سونا، چاندی، پارچہ جات اور نقد رقم شامل ہوتی ہے اس میں اب مزید دو فریق بھی حصہ دار ہوئے ہیں۔ دھرمارتھ ٹرسٹ اور وہ جمعیت جن کی تحویل میں شری امرناتھ سوامی کی چھڑی یا علم رہتی ہے جو اس یاترا کے ہر پڑاؤ پر یاتریوں کی رہنمائی اور رہبری کرتی ہے۔

زمانہ قدیم میں کشمیر میں راجوں اور مہاراجوں نے متعدد افسر تعینات کئے ہوئے تھے جو شاہراہوں کی نگہداشت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان لوگوں کو مارگیش، مارگاپتی جیسے ناموں سے پکارا جاتا تھا جس کا مطلب راستے کا مالک، بڑا حاکم تھا۔ بیرون ریاست سے اس وقت تک کوئی شخص وارد نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ متعلقہ پرگنے یا خطے کا مارگیش اس سلسلے میں ضروری اجازت مرحمت نہ کرتا تھا۔ راستوں کی رکاوٹوں کو دور کرنا اور انہیں آمد و رفت کے قابل بنائے رکھنا انہی حاکموں کا فرض منصبی تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ راستوں پر راہزنوں، ڈاکوؤں اور دشمنوں

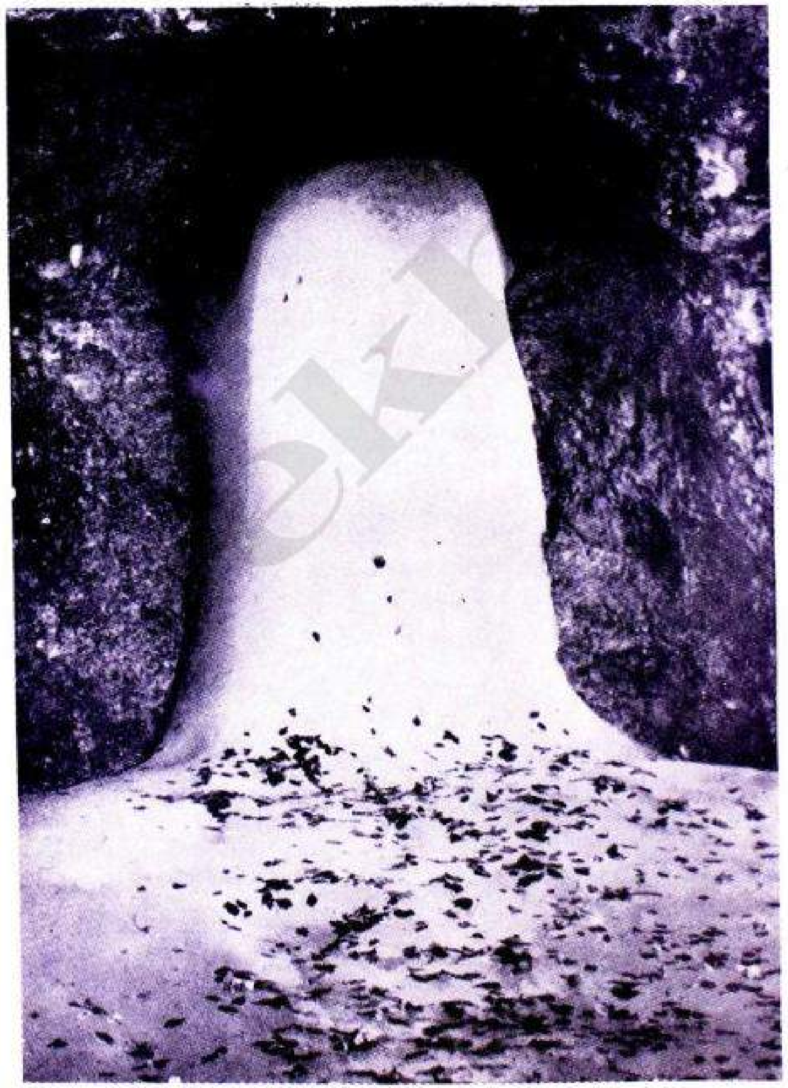
کی سرگرمیوں پر روک لگانا بھی انہی عہدہ داروں کا فرض ہوتا تھا۔ مسلمان سلاطین کے عہد میں بھی راستوں کے یہ نگہبان عرصۂ دراز تک کام کرتے رہے مگر تاریخ کے مختلف ادوار میں اس عہدے کے نام بدلتے رہے اور پھر ان عہدہ داروں میں سے بعض کو ماگرے اور بعض کو ملک پکارا جانے لگا۔ امرناتھ یاترا سے متعلق ملک بھی غالباً پرانے وقت کے مارگیش رہے ہوں گے اور گردشِ دوران نے انہیں ایک بار پھر یاتریوں کی راہبری اور انہیں ہر قسم کی سہولت بہم کرنے کا اہم فریضہ سونپ دیا۔

سوامی امرناتھ جی کی یاترا کا اصلی مُدعا امر یا لافانی بننا ہے۔ انسان کا یہ جسم فانی ہے۔ یہ کس طرح لافانی بن سکتا ہے؟ مگر سبھی دین دھرم، اوتار اور پیغمبر اس بات کا یقین دلاتے رہے ہیں کہ انسان کی رُوح لافانی ہے۔ لہذا اس یاترا کا مقصد یہی ہے کہ انسان اس گیان یا آگہی کا عرفان حاصل کرے جس کے فیض سے وہ اسی زندگی میں لافانی آتما کی بصیرت حاصل کر سکے اور اپنے من کو اس مقام پر قرار دلا سکے تاکہ ہماری انفرادی شخصیت کے وہ رُجحان، جو ہمیں محبت کی شاداب وادیوں کی بجائے نفرت کے ویرانوں کی طرف لے جانا چاہیں، ہمہ گیر انسان پرستی کی منزلِ مُراد کی طرف لے جا سکیں۔ ایک دوسرے کے درمیان منافرت کا بیج بونے کے بدلے وحدت اور اتحاد کی راہ دکھائیں تاکہ وہ اپنی ذات کی وسعتوں میں ڈوب کر بالآخر وہ ایسا عرفان حاصل کر سکے جو اُسے بقائے دوام بخشے۔ مگر یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لئے تو نفس کُشی اور خود ضبطی کی زبردست ریاضت مطلوب ہے جس سے من کا میل دُور کرنے میں مدد مل سکے۔ یہ یاترا دراصل نفس کُشی اور خود ضبطی کی ایک متحرک تمثیل ہے جس میں سبھی یاتری اداکار ہیں۔ چنانچہ تن اور من کی تطہیر کے لئے اشنان کرنے پڑتے ہیں۔ پُوجا کی جاتی ہے۔ موزوں غذا استعمال میں لائی جاتی ہے اور دان دینا پڑتا

ہے۔

پُرانے زمانے میں یاتری بٹہ یار ہی سے اشنان کرنے لگتے تھے۔ اس کے بعد گنپت یار، شتراہ یار، شوپور، پاندریٹھن، پانپور، سیدیار، بارہمو، مٹھون، اونتی پور، سنگم بالیار، واگہ ہوم، ہستکھن، ڈکدھر، دوکی یار، ترندن یار، سری گفوارہ، بُدر، سرہامہ، بھدر، کمن ناگ، وترناگ اور سلر جیسے تیرتھوں پر اشنان اور سندھیا سے من صاف اور شیتل ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد نارائن کا تیرتھ ہے گنیش بل۔

آج سفر اگلے وقتوں کے مقابلے میں نہایت آسان ہو گیا ہے۔ آج یاتری عموماً گاڑیوں میں پہلگام پہنچ جاتے ہیں۔ البتہ سوامی امرناتھ جی کی چھڑی پونم کے چھبیس روز ایک جلوس کی صورت میں سری نگر کے دشنامی اکھاڑے سے باقاعدہ پُوجا پاٹھ کے بعد نکالی جاتی ہے۔ چھڑی کے ہمراہ بڑے بڑے سرکاری اہلکار بھی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دھرم ارتھ کے اعلیٰ عہدہ دار، پولیس اور بہت سے سادھو بھی جلوس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ چھڑی کے سیوک اسے آہستہ آہستہ پیدل آگے لے جاتے ہیں۔ پہلے دن وہ پانپور تک جاتے ہیں۔ دوسرے دن بیج بہاڑہ۔ اس کے بعد مٹن، عیش مقام اور پھر پہلگام۔ یہاں پہنچ کر یہ لوگ دو تین دن قیام کرتے ہیں۔ اس جگہ کو اب سادھو پڑاؤ کہتے ہیں۔ پہلگام میں ٹھہرنے کے دوران یاتری آگے کے دُشوار پہاڑی سفر کی تیاری کرتے ہیں۔ اس دوران باقی یاتری بھی وہاں گاڑیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں پہلگام میں بہت کم مکان نظر آیا کرتے تھے اس لئے یاتری یہاں خیموں کی بستی بساتے تھے۔ ان ایّام میں ایسا لگتا تھا جیسے پہلگام خیموں کا کوئی شہر ہو۔ لیکن آج یہاں مکانیت کا کوئی مسئلہ نہیں تاہم بیشتر یاتری خیموں میں ہی قیام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ پہلگام سے نکلنے کے بعد آگے چندن واڑی کا پڑاؤ آتا ہے۔ پھر زوجن اور پنج ترنی کے اہم پڑاؤ آجاتے ہیں جہاں یاتری رات



امرناتھ ـــ کیلاش پتی شِو کا آکار

گذارتے ہیں۔ ان مقامات پر بھی اب متعدد شیڈ تعمیر ہوئے ہیں مگر اگلے وقتوں میں سردی کی شدّت یا ناگہانی بارش یا برفباری سے حفاظت کے لئے صرف خیموں پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ چونکہ پہلگام کے بعد کوئی گاڑی آگے نہیں جا سکتی اس لئے یاتری اپنا سامان خچروں پر لے جاتے ہیں۔ بعض معمّر یا معذور لوگ خود بھی ڈانڈیوں میں بیٹھ کر یہ پوتر یاترا کرتے ہیں۔ یاترا کے ہمراہ ہزاروں گھوڑے ہوتے ہیں۔ مرکبان اور مزدوروں کی ایک بڑی تعداد بھی یاتریوں کی اعانت کے لئے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ ہر پڑاؤ پر ایک پُر رونق بازار کی سی گہما گہمی نظر آتی ہے۔ ان بازاروں میں یاتریوں اور اُن کے ہم سفر ساتھیوں کو ضرورت کی سبھی چیزیں ہر وقت دستیاب ہوتی ہیں۔

پونم کے پندرھواڑے کے دن یاتری صبح تین بجے پہلگام سے چندن واڑی کی طرف نکلتے ہیں۔ سب سے آگے امریشور بھگوان کی چاندی کی چھڑی یاترا کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ سادھوؤں اور یاتریوں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ انہوں نے نصف شب کو برف کے پانی سے اشنان کیا ہوتا ہے۔ روانگی سے قبل پُوجا اور آرتی ہوتی ہے۔ شنکھ اور یاتریوں کے والہانہ فلک شگاف نعروں سے پہلگام کی فضا گونج اُٹھتی ہے "امرناتھ سوامی کی جے ....." پہلگام سے چندن واڑی کی چڑھائی یاتری نہایت مستعدی اور شوق سے طے کرتے ہیں۔ اس راستے کا بیشتر حصّہ چونکہ اندھیرے میں ہی طے ہوتا ہے اس لئے یاتریوں کو بظاہر مشکل نظر نہیں آتا۔ مگر دو ایک میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ہی ان کی سانس پھُولنے لگتی ہے اور وہ ٹھہر ٹھہر کر سستانے لگتے ہیں۔ اتنی دیر میں صُبح صادق کی روشنی میں گرد و پیش کی ہر چیز نہا جاتی ہے اور یاتریوں کو اندازہ ہونے لگتا ہے کہ انہیں آگے کن پہاڑوں پہ چڑھنا ہے۔ تاہم چونکہ یہ یاترا کی ابتدا ہی ہوتی ہے اسلئے کمزور یاتری بھی اپنی تمام ہمّت مجتمع کر کے ایک عزم کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

چھڑی تین چار گھنٹوں میں چندن واڑی (۲۶۰۰ م) پہنچ جاتی ہے، اور رات کے لیے یہاں پڑاؤ ڈالا جاتا ہے۔ باقی یاتری بھی رات یہیں گذارتے ہیں۔ گھنٹے بھر میں ہی یہ وسیع و عریض قطعۂ ارض خیموں کے ایک شہر میں بدل جاتا ہے۔ بازار سج جاتے ہیں جہاں انواع و اقسام کی پکی ہوئی چیزیں مل جاتی ہیں۔ یہاں کھانڈ، مٹی کا تیل اور بالن وغیرہ اشیائے ضرورت بھی وافر مقدار میں دستیاب رہتی ہیں۔ شہر میں مجسٹریٹ، پولیس، انجینئر، ڈاکٹر، صحت و صفائی کا انتظام کرنے والے، وائرلیس اور رضاکار ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ یاتری نہاتے ہیں اور پوجا کرنے کے بعد اس جگہ چلے جاتے ہیں جہاں چھڑی مبارک ہوتی ہے۔ بعض لوگ گرد و پیش کے فطری حسن کا نظارہ کرنے چلے جاتے ہیں۔

چندن واڑی کا قطعۂ اراضی قدرے بلندی پر واقع ہے۔ یہاں اطراف و جوانب سے برفیلے پانی کی چھوٹی چھوٹی شیتل ندیاں پاؤں چومتی، گیت گاتی خراماں خراماں بہتی رہتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوہ کی وادی کے پرجلال دیو نے پاؤں پھیلا کر آرام کرنے کی ٹھان لی ہو۔ یہاں تین اطراف میں تین اونچے اونچے سربفلک پہاڑ کھڑے ہیں جن کے دامن گنجان جنگلوں سے شاداب نظر آتے ہیں۔ ایک طرف برف کی دبیز تہہ سے ڈھکا ہوا ایک تختہ سا نظر آتا ہے۔ اس برف کے نیچے سے وہ ندی بہتی ہے جو شیش ناگ سے نکلتی ہے۔ اس جگہ کو برف کا پل "Snow Bridge" کہا جاتا ہے۔ مہم پسند اور بہادر قسم کے یاتری یہاں برف پر پھسلنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں مگر بالعموم یاتری اور مرکبان وغیرہ مغموم اور بجھے بجھے سے نظر آتے ہیں کیوں کہ دوسرے دن انہیں پسو گھاٹی سر کرنا ہوتی ہے۔ یہ پہاڑ نہایت دشوار گذار اور تقریباً عمودی ہے۔ یہ سطح زمین کے ساتھ ایک سو دس ڈگری کا زاویہ بناتا ہوگا۔ پگڈنڈی بھی نہایت تنگ ہے۔ اس میں ان گنت موڑ آتے

ہیں، سانس پھول جاتی ہے۔ کمر دوہری ہوجاتی ہے اور گلا سوکھ جاتا ہے لیکن اسے تر کرنے کے لئے حدِ نظر تک کہیں پانی نہیں ملتا۔ یاتری، مرکبان، گھوڑے، مزدور، ڈانڈیاں اس انداز سے محوِ سفر ہوتی ہیں جیسے ایک لمبی سی زنجیر ہو۔ گھوڑ سواروں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں پیچھے کی طرف لڑھک نہ جائیں۔ ڈانڈیوں میں بیٹھے یاتریوں کو یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں اُن کے دل کی حرکت ہی بند نہ ہوجائے اور اسی ہیجان خیزیت میں اگر کہیں بارش ہونے لگے، جو اس قسم کی چڑھائی چڑھتے ہوئے ممکن ہوسکتی ہے، تو یہ پرپیچ تنگ راستے کیچڑ سے بھر جاتے ہیں اور ہر پل مسافروں کے پھسلنے کا خدشہ رہتا ہے۔ یہ صورتِ حال بے پناہ مشکلات کا باعث بن سکتی ہے۔

پسُو کا پہاڑ زیادہ بلند نہیں ہے۔ اس کی چوٹی زیادہ سے زیادہ ۳۲۰۰ م بلند ہوگی مگر اس کی چڑھائی عمودی اور نہایت دشوار گذار ہے۔ چڑھائی چڑھتے چڑھتے درخت بتدریج کم ہوتے جاتے ہیں اور چوٹی تک پہنچتے پہنچتے بس اکا دکا درخت ہی نظر آتے ہیں۔ تجربہ کار مرکبان یاتریوں کا حوصلہ بڑھاتے جاتے ہیں۔ انکی آواز گھٹا ٹوپ تاریکی میں روشنی کی ایک کرن کی طرح پھوٹتی ہے "یا پیر دستگیر... کمر کو جھکا کر۔ خدا کو یاد کر......" ان آوازوں کی صدائے بازگشت یاتریوں میں ایک نئی ہمت جاگرت کرتی ہے اور امرناتھ سوامی کے معتقد والہانہ طور نعرے بلند کرنے لگتے ہیں۔

ہر ہر مہادیو......

امرناتھ سوامی کی...... جے

شیو ہرے...... شیو ہرے

عقیدت بھری ان صداؤں سے بے قرار دل کو قرار مل جاتا ہے۔ بلندی پر پہنچتے ہی ایک اور گروہ سے مڈبھیڑ ہوجاتی ہے یعنی بھکاری ــــ یہ لوگ دستِ سوال دراز کرتے

ہیں، تن بدن کی خیر ..... خوشی نال آوے، خوشی نال جاوے ..... بال بچہ راضی ....

اس منزل پر پہنچ کر یاتری مسرور ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر سستا لیتے ہیں اور پھر آگے کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔

پشو گھاٹی کے ان پہاڑی پُرپیچ اور دشوار گذار راستوں پر بھی بعض جوان مرد خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ یہ رضاکار چندن واڑی سے پینے کا پانی لاتے ہیں اور راستے بھر یا اُوپر تک پہنچ کر یاتریوں کو پلاتے ہیں۔ پانی ختم ہونے پر یہ لوگ نیچے جا کر پھر سے پانی لے آتے ہیں۔ میں پہلی بار ۱۹۳۶ء میں امرناتھ یاترا پر گیا۔ وہاں پشو کی چوٹی پر سردار جوگندر سنگھ (جگو سنگھ) تھا۔ یہ ایس۔ پی کالج کا مشہور کھلاڑی اور اسکاوٹ تھا اور یاتریوں کو پانی پلاتا تھا۔ اس کی جانبازی کا یہ عالم تھا کہ وہ پانی سے بھری ہوئی دو دو بالٹیاں لیکر پشو گھاٹی پر یوں دوڑتا ہوا اوپر تک آجاتا تھا جیسے اُس میں ایک ٹینک کی سی شکتی ہو۔ جگو اب بھی بہت سے دلوں میں زندہ ہوگا۔ ۱۹۳۹ء میں جب جنگ چھڑی تو وہ فوج میں تعینات ہوا۔ اسے افریقہ بھیج دیا گیا جہاں سے وہ پھر کبھی واپس نہ آسکا۔

اس پہاڑ کا نام پشو کیوں پڑا۔ یہ نام دراصل سنسکرت کے لفظ پیش گری (पशुगारी) سے نکلا ہے۔ "پِشُ" لفظ کا مطلب پِسنا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دیوتا اور راکھشس چندن واڑی کے قریب تک اکٹھے ہی بھگوان کے درشن کرنے آئے۔ راکھشس کہنے لگے: "پہلے میں، پہلے میں" اور اس طرح بدتمیزی پر اُتر آئے۔ اس پہاڑ پر چڑھتے چڑھتے دیوتا ان پر چڑھ دوڑے اور ان کو لگ بھگ پیس کر رکھ دیا۔ اسی واقعے کی مناسبت سے اس پہاڑ کا نام پشو گھاٹی پڑا ہے۔

اس پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد سبزہ زار اور جنگلات عنقا ہونے لگتے ہیں۔ دُور کہیں اِکا دُکا درخت نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں جنگلی پھولوں کی اَن گنت اقسام

چٹانوں سے پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ یاتریوں کا راستہ نہایت بلندیوں پر بل کھاتا ہوا چلا جاتا ہے لیکن ندی نیچے، بہت نیچے گہرائیوں میں بہتی ہے۔ یاتریوں کے لئے ندی تک پہنچنا اس لحاظ سے ناممکن ہے کیوں کہ پہاڑ کا اگلا حصہ نہایت عمودی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں میں دوسری مرتبہ امریشور گیا۔ امر سنگھ کالج کے اسکاوٹ میرے ہمراہ تھے۔ ان میں وزیر ہری کرشن بھی شامل تھا جو ہاکی کا بہترین کھلاڑی سمجھا جاتا تھا۔ نہایت چاک چوبند، پھرتیلا اور دوڑ کا ماہر۔ ہم پشو پہاڑ سے تھوڑا آگے آگئے تھے کہ ایک مرکبان کا گھوڑا بدک اٹھا اور اس نے اپنی پیٹھ سے کاٹھی گرا دی۔ کاٹھی پہاڑی کی ڈھلان پر گرتی ہوئی نیچے ندی کی طرف چلی گئی۔ مرکبان بے چارگی سے دیکھتا رہ گیا۔ بھلا اس خطرناک ڈھلان پر اُترنے کی جرأت کون کر سکتا تھا؟ پولیس کے اہلکار بھی بے بسی کی نگاہیں پھینکتے ہوئے آگے بڑھے۔ اتنی دیر میں ہری وزیر اس جگہ پہنچا۔ اس نے برق رفتاری سے اپنا بلٹ نکالا اور بے پناہ مستعدی اور ہمت سے پہاڑی کی ہیجان خیز ڈھلان پر جھاڑی نما درختوں کو تھامتا ہوا نیچے اترا۔ بالآخر وہ مطلوبہ جگہ تک پہنچا۔ اس کی ہمت سے تحریک حاصل کر کے ایک اور اسکاوٹ اس کے پیچھے پیچھے آگیا۔ دونوں نہایت چابکدستی سے کاٹھی کو اوپر تک لانے میں کامیاب ہوگئے۔ بہت سے لوگ ان کی شجاعت اور آہنی عزم کا یہ کارنامہ دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے اور دیر تک اور دُور تک انہیں داد دیتے رہے۔ بدقسمتی سے اس واقعہ کے دو تین برس بعد ہی ہری کرشن گولی کا شکار ہو کر فوت ہوا۔

یاتری اس دن زوجن پہنچ جاتے ہیں۔ اس جگہ تک اب راستہ مقابلتاً ہموار ہے۔ کہیں کہیں بس معمولی سی چڑھائی چڑھنا پڑتی ہے۔ راستے میں کئی چراگاہیں پڑتی ہیں۔ مگر سب سے شاندار نظارہ ششیرم ناگ کا ہوتا ہے۔ اس جھیل کے ارد گرد اونچے اونچے پہاڑ ہیں جن کے درمیان جھیل کی مخملی شفاف لہریں ایسے نظر آتی ہیں جیسے مدہر

کا جام ہو۔ یہاں اشنان اور سندھیا کے بعد پوجا پاٹھ کی جاتی ہے۔ کلہن پنڈت کے مطابق اس کا اصلی نام سُسرم ناگ ہے اور اس کے ساتھ ہی عقب میں "داماد کا ناگ" ہے۔ ان جھیلوں کے یہ نام کیوں کر پڑے ہیں۔۔۔ اس کی تفصیلات راج ترنگنی کی دوسری ترنگ میں درج ہیں۔ اس کا پس منظر مختصراً کچھ اس طرح ہے:

راجہ نر نے ایک نہایت حسین استری چندر لیکھا کو دیکھا اور اس پر اپنا دل لٹا بیٹھا۔ وہ اسے زبردستی اپنے محل میں لے جانے کے منصوبے مرتب کرنے لگا۔ چندر لیکھا وشاکھا نام کے برہمن کی بیاہتا تھی۔ وہ ایک ناگ کی بیٹی تھی جس کا نام سُسروس تھا۔ جب وشاکھا کو راجہ کی ہوس اور اُس کے شیطانی ارادوں کا علم ہوا، وہ اپنے مکان کے پچھلے دروازے سے فرار ہو کر اپنے سُسر کے پاس پہنچا۔ اُس کے سُسر نے غیظ و غضب میں آ کر قہر کا سامان برپا کیا۔ بادل گرجے، بجلی چمکے اور ایک طوفان پھٹ پڑا۔ اولوں کی جگہ بڑے بڑے پتھر گرنے لگے۔ نر اور اس کی سلطنت تباہ ہو گئی۔ اس زبردست تباہی کے بعد چندر لیکھا کا باپ بے حد اُداس ہو گیا اور اس نے یہاں سے بھاگ کر امرلشور کے راستے پر نیا گھر بسایا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام سسرم ناگ پڑا جو آہستہ آہستہ ششترم ناگ بنا۔ وشاکھا نے بھی ایک ناگ کا روپ دھارن کر کے "داماد ناگ" میں بسیرا کر لیا۔ مگر امرناتھ مہاتم کہتے ہیں کہ راکھشسوں کا قلع قمع کرنے کے لئے وشنو بھگوان نے یہ جگہ شیش ناگ کو سونپ دی تھی چنانچہ کہتے ہیں ششترم ناگ سے مطلب وہ جگہ ہے جہاں لوگ سکھ شانتی سے رہتے ہوں۔

اگلے دن یاتری واوجن میں قیام کرتے ہیں۔ اس جگہ کو والیو ورجن کہا جاتا تھا کیوں کہ یہ پہاڑ شیشرم ناگ سے ایک کلومیٹر کی مسافت پر ہے اور اس کی بلندی بھی کوئی ۳۵۰۰ م ہو گی۔ خوشگوار موسم میں بھی یہ جگہ سُنسان اور اُجاڑ نظر آتی ہے۔

حدِ نظر تک خاموشی کے سائے لرزاں و ترساں دکھائی دیتے ہیں۔ بے برگ و ثمر ویرانے۔ ڈھونڈنے سے بھی کوئی پھول یا سبزہ نظر نہیں آتا۔ اس سنگلاخ پہاڑ پہ ہولے کے جھکڑ ہر وقت چنگھاڑتے رہتے ہیں۔ یہ زمہریر ہوائیں جسم کے انگ انگ کو منجمد سا کر دیتی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ہزاروں سال قبل ایک ہیبت ناک راکھشس یہاں آندھی کا روپ دھارن کر کے آ گیا۔ اس نے بڑی ریاضت کے بعد شیو ناتھ کی خوشنودی حاصل کی تھی اور اس طرح زبردست طاقت حاصل کی تھی۔ چنانچہ اس نے آتے ہی دیوتاؤں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ دیوتا شیو ناتھ کی شرن میں آ گئے لیکن انہوں نے کہا کہ میں نے ہی اسے یہ طاقت بخشی ہے اس لئے میں اسے مار نہیں سکتا۔ آپ لوگ وشنو بھگوان کے پاس جائیں۔ وشنو بھگوان پہ دیوتاؤں کی آہ و زاری کا بے حد اثر ہوا۔ اس نے زماں سانپوں کے راجہ شیش ناگ کو بھیج دیا۔ اُس نے اپنے ایک ہزار سر اٹھائے اور اس ساری آندھی کو چوس لیا۔ اس کے بعد دیوتا سُکھ شانتی کا سانس لے کر بیٹھے۔ ان تیز و تُند آندھیوں کا یاتریوں پر اس قدر اثر رہا ہے کہ اب بھی چھوٹے چھوٹے کنکر جمع کر کے علامتی طور پر ایک مکان کا ڈھانچہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس میں روپے پیسے اور چاول وغیرہ رکھ کر پوجا کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ آندھی اٹھتے وقت یہاں پناہ لی جا سکے۔ ایک دوسری دلآویز جگہ ہے استھان مرگ۔۔۔! یہاں سیلانی بھی سیاحت پہ آتے ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں یہاں لارڈ رپن، جو اُس وقت ہندوستان کے وائسرائے تھے، شکار کھیلنے آئے تھے۔

واوجن میں رات گزارنے کے بعد یاتری صبح سویرے آگے بڑھتے ہیں۔ اِس دن انہیں پنج ترنی پہنچنا ہوتا ہے۔ راستے میں مہاگنس کا پہاڑ آتا ہے جو اس سارے سفر میں بلند ترین مقام ہے۔ یہ ۴۶۰۰ م کی بلندی پر واقع ہو گا۔ چڑھائی اگرچہ پشہ گھاٹی اتنی عمودی نہیں ہے تاہم یہ مقابلتاً کافی طویل ہے۔ اعصاب

شکن چڑھائی چڑھتے چڑھتے یاتریوں کی سانس پھولنے لگتی ہے اور کتنے ہی یاتری سفر کی صعوبت سے نڈھال اور کچھ بیہوش بھی ہوجاتے ہیں۔ مہا گنیش چڑھنے کا اس لئے یاتریوں کو بے حد خوف رہتا ہے اور وہ ہر لمحہ پکارتے رہتے ہیں:

ہر ہر مہادیو......
بھگوان شنکر کی جے.....
امرناتھ سوامی کی جے......

یہاں قرب و جوار میں متعدد اقسام کی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں جونہی آفتاب کی ارغوانی شعاعیں چمکنے لگتی ہیں تو موتی کی طرح دمکنے والے شبنم کے قطرے پگھل جاتے ہیں۔ لیکن یاتری بکھرے بکھرے سے ہوتے ہیں۔ کچھ تو ان سربفلک پہاڑوں کی بلندیوں کی وجہ سے اور کچھ بے پناہ تھکان کی وجہ سے اور پھر ان ہیجان خیز پرپیچ پہاڑی راستوں کا خوف بھی ان پر مسلط رہتا ہے۔ چنانچہ ان ہواؤں کے لمس سے ہی متعدد یاتری بے ہوش ہوجاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں یاتری اپنے ساتھ انار دانہ اور پسے ہوئے آم کی چٹنی رکھتے تھے جس کے استعمال سے غنودگی محسوس کرنے والے یاتری پھر سے چست اور مستعد ہوجاتے تھے۔ لیکن اب یاترا کے ہر پڑاؤ پر ڈاکٹر اور رضا کار ادویات لے کر امداد کیلئے حاضر ہوتے ہیں۔

مہا گنس کی بلندیوں سے نہایت حسین نظارے نگاہوں میں سمانے لگتے ہیں۔ اردگرد پربتوں کے دائروں کی آسمان کو چھوتی ہوئی چوٹیاں سپید سپید اچھوتی چادر تلے گم سُم سی نظر آتی ہیں۔ فضا میں برف کی شگفتہ اور فرحت بخش خوشبو مہکتی ہے۔ نیلے نیلے آسمان کی بیکراں وسعتوں میں دُور کہیں

آوارہ بادلوں کے اکا دُکا ٹکڑے منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ طلوع ہوتے سورج کی ہلکی ہلکی کرنوں میں جنگلی پھولوں پر دمکتے ہوئے شبنم کے قطرے۔۔۔ فطرت کی یہ ساری رعنائیاں۔۔۔ انہیں دیکھنے کا انسان کو بہت کم موقعہ ملتا ہے۔ آگے نظر دوڑائیں تو پہاڑ کی ڈھلان شروع ہوجاتی ہے۔ خوشگوار موسم میں یاتری خوشی خوشی ڈھلان اُترنے لگتے ہیں اور پنج ترنی پہنچ کر سستانے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ جگہ نشیب میں واقع ہے۔ گویا کسی بالٹی کا پیندا ہو۔ یہاں چلتے چلتے یاتریوں کو ندی نالے عبور کرنا پڑتے ہیں۔ غالباً اسی مناسبت سے اس جگہ کا نام پنج ترنی رکھا گیا ہے۔ کہتے ہیں جب شیوجی مہاراج تانڈو ناچ کیا کرتے تھے تو اُن کے ملبوسات پانچ چادروں کی صورت میں پھیل گئے۔ گنگا ان چادروں میں سے نیچے اُتری اور اس سے یہ پانچ ندیاں بنیں جنہیں بعد میں پنج ترنی کہا گیا۔ یہاں ہیلی کاپٹر کے لئے ہیلی پیڈ آسانی سے تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال اس دن یہاں ہزاروں یاتری قیام کرتے ہیں۔ مرکبان۔ گھوڑے وغیرہ غرض بڑی چہل پہل اور گہما گہمی رہتی ہے۔ بھجن کیرتن منڈلیاں جوش و خروش سے سرگرم ہوجاتی ہیں کیوں کہ دوسرے دن صبح گپھا میں سوامی امرناتھ جی کے درشن کرنے ہوتے ہیں۔

کل پونم ہے۔۔۔ یاتری رات کے تین بجے ہی تیار ہوتے ہیں۔ چھڑی کی پوجا کی جاتی ہے اور یاترا اپنی آخری منزل کی طرف گامزن ہوجاتی ہے۔ کوئی آدھ کلومیٹر طے کرنے کے بعد دو میل پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں دو ندیوں کا سنگم ہوجاتا ہے۔ ایک تو وہ پانی ہے جو پنج ترنی سے بہتا ہے اور دوسری وہ ندیا ہے جو امرناتھ سوامی کی گپھا کے پانی کو اپنے ساتھ ملاکر بہتی ہے۔ اس جگہ کو امرگنگا کہتے ہیں۔ اس جگہ سے یہ پانی بال تل کی طرف بہہ جاتا ہے اور بالآخر نالہ سندھ سے مل جاتا ہے۔ دو میل پہنچ کر یاتری دائیں جانب ہو لیتے ہیں اور ندی کے کنارے کنارے آگے

گھاٹی کی چڑھائی چڑھنے لگتے ہیں جس میں پوتر گپھا واقع ہے۔ چڑھائی عمودی ہے اور ٹھنڈ شدت کی۔ ارد گرد برف کی ایک دبیز تہہ نظر آتی ہے۔ راستہ تنگ ہے مگر یاتری عزم و ہمت کے پیکر بن کر قدم بہ قدم منزل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ منزل اب بس نزدیک ہے ــ صرف چار کلومیٹر۔ انہیں ہر قدم پر بشاشت ہوتی ہے اور یہ سرشار ہو کر نعرے لگاتے ہیں اور آخر منزلِ مُراد اُن کے سامنے ہوتی ہے۔ گپھا کے نزدیک پہنچکر یاتری مختصر سے وقت کے لئے آرام کرتے ہیں اور پھر امر گنگا میں انتہائی ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہیں۔ کپڑے بدلتے ہیں اور اوپر گپھا میں چلے جاتے ہیں۔ (کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں یہاں لوگ ننگے بدن راکھ مَل کر داخل ہوا کرتے تھے اور تانڈو ناچ کرتے تھے)۔ پھر عقیدت و احترام سے پوجا پاٹ ہوتی ہے۔ پھر بھگوان کو حتی المقدور نذرانے ارپن کرتے ہیں ــ سونا، چاندی، نقدی، نارجیل یا پھل وغیرہ۔ یہاں چونے کی مٹی ہوتی ہے جس کا یاتری ماتھے پر تلک لگاتے ہیں۔

سمندر سے اس گپھا کی بلندی ۳۸۰۰ میٹر ہے۔ یہاں حدِ نظر تک کہیں بھی آدم ہے نہ آدم زاد ــ بس خاموشی کے سائے لرزاں و ترساں! مگر ٹھیک اسی دن اس گپھا سے کبوتروں کی جوڑی نکلتی ہے جنہیں دیکھ کر یاتری خوشی سے پھولے نہیں سماتے ــ جب تک وہ کبوتروں کی جوڑی نہیں دیکھتے انہیں اپنی یاترا سپھل محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کبوتر کھاتے کیا ہیں اور یہاں کہاں سے آتے ہیں، یہ ساری باتیں اسرار کی دھند میں لپٹی ہوئی ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ دراصل امریشور مہاراج کے سیوک ہیں اور یہ کبوتروں کا روپ دھارن کر کے بھگتوں کو درشن دینے آتے ہیں ـ!

یہ پہلے ہی بتایا گیا ہے کہ اس گپھا کی چھت سے پانی کے قطرے ٹپکتے رہتے ہیں جہاں یہ گرتے ہیں وہاں پونم کی راتوں میں ایک مورتی اُبھر آتی ہے۔ کبھی کبھی دو

مورتیاں ہوتی ہیں یعنی شو ناتھ اور پاروتی جی کی ــ ویسے اکثر تین مورتیاں ہوتی ہیں۔ یہ تیسری مورتی گنیش جی کی ہوتی ہے۔ ان مورتیوں کی جسامت ہر سال یکساں نہیں رہتی، یہ بڑھتی یا گھٹتی رہتی ہیں۔ بھیڑ بھاڑ میں یاتری مورتیوں کے پیر چھونے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر بھگتوں کے بے پناہ اژدھام میں کوئی اس بات کے لئے زیادہ اصرار کرے کہ وہی پہلے پیر چھوئے تو اس کے مجروح ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے لہٰذا ان کے بچاؤ کے لئے ارد گرد جنگلہ لگایا گیا ہے۔

بہت سے سائنسدان بھی اس گپھا میں تحقیق و جستجو کے لئے آتے ہیں۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر یہ مورتیاں کیسے بنتی ہیں۔ اس سلسلے میں متعدد آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اسے STALACTITE / STALAGMITE کے عمل سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں مگر آج تک اس سلسلے میں کوئی خاطر خواہ یا معقول دلیل پیش نہیں کی گئی ہے۔

واپسی پر یاتری پنچ ترنی میں قیام کرتے ہیں اور دوسرے دن پہلگام پہنچکر شام کو سری نگر آجاتے ہیں۔ جو لوگ جلدی درشن کرلیں وہ پونم ہی کے دن پہلگام پہنچ جاتے ہیں۔ ایام رفتہ میں واپسی کے وقت ایک مخصوص شرادھ کیا جاتا تھا۔ لودل تیرتھ ترال کے نزدیک واقع ہے۔ پہلگام سے اگر ماطیشور کے نزدیک پہاڑ کے اُس پار آجائیں تو ہم ترال پہنچ جاتے ہیں۔ مگر اب لوگ بس میں سیدھے سری نگر آجاتے ہیں۔

سوامی امرناتھ جی یاترا ہمہ پہلو اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے روحانی پس منظر کے علاوہ یاتری فطرت کی رعنائیاں دیکھ کر مسرور ہو اُٹھتا ہے۔ یاترا کا راستہ جہلم کے کنارے کنارے پڑتا ہے۔ اس کے بعد نالہ لیدر کا سنگیت یاتریوں کے کانوں میں رس گھولتا ہے۔ لیدر گھنے جنگلوں کے پاؤں چھوتا ہوا جھاگ اڑاتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ شاداب مرغزاروں کی نزہت و تنوع کی دلآویزیاں دودھ جیسے

اس کے شور مچاتے پانی پر سایہ فگن رہتی ہیں۔ آگے بڑھیں تو پھولوں کی وادیوں میں سے دودھ کی نہریں سی بہتی دکھائی دیتی ہیں۔ دور پہاڑوں کی برف پوش پیشانی دمکتی دکھائی دیتی ہے اور حدِ نظر تک برف پوش ڈھلوانیں، سنہری چراگاہیں اور شفاف جھیلیں نگاہوں میں سما جاتی ہیں۔ یہ نظارے منظر دل کے نہاں خانوں میں مچل کے رہ جاتے ہیں۔ لطیف ہوائیں اور آبشاریں تو آدمی کو سحر زدہ سا کر دیتی ہیں۔ اُسے موہ مایا کے جال سے بہت دور ایک روحانی دنیا میں پہنچا دیتی ہیں جہاں انسانیت، اخوت، اتحاد اور آشتی کی قدریں اُبھرنے لگتی ہیں۔ یہ پس منظر دل و دماغ پہ اس حد تک خوش گوار اثر مرتب کرتے ہیں جس کی کیفیت شیکسپیئر کے الفاظ......

SERMONS IN STONES AND BOOKS IN RUNNING BROOKS میں ادا ہو جاتا ہے۔

امرناتھ یاترا منزل بہ منزل کی جاتی ہے۔ راستے میں جو بھی تیرتھ استھان آتے ہیں وہاں یاتری اشنان کرتے ہیں اور پوجا کی جاتی ہے۔ پچھلے زمانے میں بہت سے یاتری دن کو فاقہ کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ سنگھاڑے کا آٹا اور اس طرح کی دیگر چیزیں اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔ ایسے یاتری رات میں تین بجے جاگا کرتے تھے۔ اشنان سندھیا اور پوجا پاٹ کر کے چائے پی لیتے تھے اور نئے پڑاؤ کی جانب لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگتے تھے۔ اس پڑاؤ پر پہنچ کر بھی یہ لوگ سب سے پہلے نہا کر بھگوان کی پوجا کرتے تھے۔ اس کے بعد کہیں جا کر وہ کھانا بنانے کی تیاری کرتے۔ اس طرح کی یاترا بے پناہ مشقت اور ریاضت کی متقاضی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے بیتے دنوں میں انسان کے پاس فراغت بھی تھی اور شانتی بھی۔ وہ اس پوتر یاترا کے دوران اپنی گرہستی کے جنجال سے مُکت رہتے تھے۔ آپسی کھاگے چارے اور انسانیت کی سچائیاں جنہیں وقت کی گرد نے دھندلا دیا ہوتا ہے، یہ

یاترا اس گرد کی دبیز تہہ کو بتدریج ہٹاتی ہے اور ہمارا من شفاف اور شیتل ہونے لگتا ہے۔ فطرت کی آغوش میں شگفتہ اور فرحت بخش ہوائیں، صاف پانی جس میں جنگلی جڑی بوٹیوں کی صحت بخش تاثیر رچی ہوتی ہے، سادہ غذا ـــ! یہ ساری باتیں ـــ یہ سارا پس منظر انسان کو اپنے نجی اغراض سے بالاتر کر دیتا ہے۔ اس میں آگہی کا شعور بیدار ہوا اُٹھتا ہے اور وہ اپنے وجود کے شش جہات کا عرفان حاصل کرنے لگتا ہے۔ امرناتھ مہاتما کہہ گئے ہیں کہ جو شخص امرناتھ یاترا کرے گا، وہ اس سنسار میں رہ کر بھی مُکتی حاصل کرتا ہے یعنی اس پہ دنیا کے دکھ اور سکھ اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک ابدی سکون پاتا ہے۔ جن لوگوں کو اس کٹھن تپسیا کے بعد سکون اور شانتی کا یہ گوہرِ مقصود حاصل ہوتا ہے۔ وہ بار بار اس یاترا پہ جانے کے متمنی رہتے ہیں۔ میری یادوں کی تابناک سرزمین میں اس شخص کے خدوخال اب بھی اُبھر کر سامنے آنے لگتے ہیں جسے میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ اس نے ستائیس بار یاترا کی تھی اور وہ اپنے اس عزم کا بار بار اعادہ کرتا تھا کہ زندگی کے آخری ماہ و سال تک وہ اس یاترا پر برابر جاتا رہے گا۔!

آج زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے۔ اس برق رفتار دور میں فرصت اور فراغت عنقا ہو گئی ہے۔ یاتری صبح سویرے ہی پہلگام پہنچ کر چندن واڑی چلے آتے ہیں یا پھر سری نگر سے ہی براہِ راست ایک ہی دن میں واوجن یا پنج ترنی پہنچ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے یاتری پہاڑوں، چراگاہوں اور جھیلوں کے پس منظر سے مستفیض نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ گھر، دفتر اور کاروبار کا بوجھ ان کے کندھوں پر برابر لدا رہتا ہے۔ اب تو ایسے لوگوں کے لئے بہت ہی سہولت ہو گئی ہے۔ یہ لوگ بس میں بیٹھ کر گنگن اور پھر سونہ مرگ سے بال تل پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں سے دومیل تک صرف بارہ کلومیٹر کی مسافت ہے اور وہاں سے گپھا صرف چار کلومیٹر

دوُر ہے۔ اگر کوئی شخص ٹیکسی میں بیٹھ کر نکلے تو وہ ایک ہی دن میں یاترا کر کے شام کو پھر واپس سری نگر پہنچ سکتا ہے۔ اسے CRASH PILGRIMAGE کہا جا سکتا ہے۔ ساٹھ برس پہلے پنڈت آنند کول بامزئی نے اس بات کی پیش گوئی کی تھی اور انجام کار یہ صحیح ثابت ہوئی۔!

لوگ چاہتے ہیں کہ پوجا پاٹ اور عبادت سے ان کے دُنیاوی مسئلوں کا بھی کوئی حل نکل آئے۔ لیکن کیا امرنشور یاترا سے اُن کے دُنیاوی مسئلوں کا واقعی کوئی حل نکل آتا ہے؟ میں اس پر اپنی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ جیسا میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں میں نے ابتدائی طور ۱۹۳۶ء میں یاترا کی ہے جس پر ماڈرن ریویو میں میرا باتصویر مقالہ بھی شائع ہوا ہے۔ یہ کلکتہ کا ایک معتبر رسالہ تھا۔ اس مقالے سے یہاں میں ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:

"نئی وچار دھارا کے لوگ نہ جانے کیا کچھ کہیں ۔ مگر گپھا کو دیکھنے کیلئے لوگ اطراف و اکناف سے آتے ہیں ۔ یاتری اور بھگوان تک بھی ان کے خلوص کی قدر کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ کشمیر کے آج کے مہاراجہ (یعنی ۱۹۳۶ء میں) نے گپھا تک نئی سڑک تعمیر کرائی۔ کیوں کہ اس نے یہاں جس دان کی درخواست کی تھی وہ اُسے یُوراج کی صورت میں مل گیا تھا۔ کشمیر کے ہی ایک مسلمان آئی۔سی۔ایس منسٹر نے اس گپھا میں اولاد کے لئے التجا کی اور جب ان کے ہاں اولاد ہوئی تو وہ تشکر کے جذبات لئے پھر دو بار یہاں آئے۔ ایک نوجوان بنگالی عیسائی، جس نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی تھی اور St. Stephen College دہلی میں پروفیسر تھا، واپسی پر نمونیہ کا شکار ہوا۔ اُس نے مرنے سے پہلے یہ پیغام تحریر کیا،

"میرے دوستوں سے کہا جائے کہ یاترا مکمل کر کے میں نہایت تسکین کے ساتھ اس عالم سے رخصت ہو رہا ہوں"!

مگر یاتری روحانی تسکین اور شانتی کے لئے امرنشور یاترا کرتے ہیں۔ ایک انگریز سیّاح نے اپنی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"فطرت کا نظارہ اس قدر شاندار، پُرکشش اور دلآویز ہے کہ اس جگہ پہنچ کر انسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خالق کائنات کے پاس پہنچ گیا ہے"۔

چنانچہ تاریخ کے مختلف ادوار میں سادھوؤں، سنتوں، صوفیوں اور شاعروں نے بھی اپنے اپنے طریقے سے انہیں جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔

کوہ و دریا و غروب آفتاب
من خدا را دیدم آنجا بے حجاب

(اقبالؒ)

شیو شکھتی اکھ نامہ رُپہ بنیون
پانہ بوز ماتہ کیا نوّن ونن
پرمانند پانس بنّن
من تھبر کر لوژن پر بھو

(پرمانند)

تہوار

تیوہار سماجی زندگی کی رعنائیوں اور انسانی مسرت کا اظہار ہوتے ہیں۔ ہر قوم کو اپنے تیوہار عزیز ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو قبیلے ابھی تک ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شریک نہیں وہ بھی مختلف رقصوں اور تقاریب کے ذریعے دائمی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی محفلیں ان کے تیوہار ہوتے ہیں۔ مہذب لوگ اپنے تیوہاروں کو عہدِ اول سے تزک و احتشام کے ساتھ مناتے آئے ہیں۔ ان تیوہاروں میں قومی، سماجی اور مذہبی تیوہار شامل ہیں۔ کشمیر جس طرح دیگر باتوں میں ایک مخصوص رنگ پیش کرتا ہے اسی طرح اس کے تیوہار بھی کافی قدیم اور رنگارنگی سے بھرپور ہیں۔

جب ہم ہندو تیوہاروں کی بات کریں تو ہمیں ان تیوہاروں کی ابتدا کھوجنے کے لئے نیل مت پوران کو کھنگالنا پڑے گا۔ اس اہم دستاویز کو پڑھنے سے کوئی ۵۲ تیوہار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے کئی اب تک چلے آرہے ہیں۔ کئی تیوہاروں کا روپ بدل گیا ہے اور کئی اب منائے ہی نہیں جاتے۔ ان تیوہاروں کا مختصر تجزیہ موزوں رہے گا۔

ان تیوہاروں میں "نوسموتسر" یعنی نئے سال کا تیوہار، "نوہم پات اُتسو" یعنی نئی برف کا تیوہار، شیوراتری، "کرشیارمبھ" یعنی کھیتی شروع کرنے کا تیوہار، پشاچ چترودشی (اس دن پشاچوں کا راجہ نکمبھ شنکر کی پوجا کرتا تھا)، زمین کی پیدائش کا پہلا دن (اس روز ساری دنیا کے نام پوجا کی جاتی تھی)، ارامنجری پوجا (اس روز ارا نام کے پھولوں کی پوجا ہوتی تھی)، بدھ جنم (گوتم بدھ کا جنم دن اس روز منایا جاتا تھا)، "وشنو دیو پوجا" روہنی سنیوگ (اس دن کیشپ رشی کا دن منایا جاتا تھا) "بھادر پدشکلا کرتیا" (اس روز ہتھیاروں کی پوجا کی جاتی تھی) اور "نوان ودھان" (یعنی نئی فصل تیار ہونے کا تیوہار)۔

ان تیوہاروں پر سرسری نظر ڈالنے سے کشمیر کے ہندو تیوہاروں کی وسعت اور مزاج کا پتہ لگتا ہے۔ سارے جہاں کے نام پوجا کرنے کا مقصد عالمِ کل کی بھلائی کا ہی تصور تھا۔ اسی طرح کیشپ رشی کا دن منانے کا مقصد اس رشی کی یاد تازہ کرنا تھا جس سے دیومالا کے مطابق کشمیر کا بسایا جانا منسوب ہے۔ اسی طرح پھولوں کا یا نئی فصل کا تیوہار منانا بھی کشمیری ذوق اور شوق کو ہی اجاگر کرتا ہے۔ نیل مت پوران میں درج تیوہاروں میں سے ہتھیاروں کی پوجا کرنے کا تیوہار نہایت اہم اور دلچسپ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کشمیری کو پھولوں، پھلوں اور قدرتی نظاروں سے ہی پیار نہ تھا بلکہ وہ ہتھیاروں کو چلانا بھی جانتا تھا اور ہتھیار ہی اس کی آزادی کے ضامن تھے اس لئے وہ ہر سال ہتھیاروں کی یاد تازہ کرتا تھا۔ تیراندازی کے کرتبوں کا ذکر بھی چند تیوہاروں کے تعلق سے دیکھنے میں آیا ہے۔ نیا سال شروع کرکے اور نیا اناج استعمال کرنے کے تیوہار ابھی تک کشمیر میں منائے جاتے ہیں ہاں ان کی صورت تھوڑی بہت بدل گئی ہے۔

بعض کشمیری تیوہاروں کی دلچسپ بات یہ ہے کہ ابھی تک ان کے منانے میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک جیسے طریقے کا اظہار کرتے ہیں۔ کچھ تیوہار ایسے ہیں جن کو فصلی تیوہار کہنا بہتر ہوگا اور جن کا سیدھا تعلق دیہاتی زندگی "خصوصاً" کسانوں کے ساتھ ہے۔ فصلی تیوہاروں میں آج تک چلا آنے والا تیوہار ہے "گوہ نگل"۔ یہ تیوہار اُس روز منایا جاتا ہے جب کسان پہلی بار کھیتوں میں ہل چلانے کے لئے نکلتا ہے۔ اس روز مویشی چرانے والے گوالے بھی اپنے مویشی لے کر گاؤں کے قرب وجوار کی کاہچرائی (جو اب ختم ہو رہی ہے) میں نکل آتے ہیں۔ گوالوں کو مویشی پالنے والے اس روز شالی (چاول) یا نقدی دیکر اچھے سال کی تمنا کرتے ہیں۔ جب گاؤں میں شالی کی روپائی کی جاتی ہے تو اس روز بھی کسانوں کی عورتیں "تہری" کے تھال کھیتوں پر بانٹتی ہیں (ہلدی سے رنگے اُبلے چاولوں کو کشمیری میں "تہر" کہا جاتا ہے)۔ کشمیری مسلمان اور ہندو گھرانوں میں تیوہاروں اور بڑے دنوں کے موقعوں پر تہری بانٹی جاتی ہے۔ بہار کے موسم کے ساتھ ہی صرف دیہات میں مسلمان قبرستانوں پر چاول کے آٹے کی روٹی بطور نذر چڑھاتے ہیں جسے کشمیری میں "ٹائش ژوٹ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کا تعلق شہروں اور قصبوں سے نہیں۔ فصل کاٹنے پر بھی تہری بانٹی جاتی ہے۔ امیر کسان فصل جمع کرنے کے بعد جب کوٹھاروں میں شالی محفوظ کر لیتے ہیں تو وہ بھیڑ کی قربانی دے کر اطمینان وشکر کا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح کی تقریب کو نیاز کہتے ہیں۔ قبرستانوں میں ایک خاص موقعے پر چراغ جلانے کا رواج بھی کشمیر میں موجود ہے۔

کچھ تیوہار ہمارے قدیم ثقافتی ورثے کو آج تک قائم رکھے ہوئے ہیں۔ کشمیر میں عوامی رقص کی ایک صنف کا نام "دمالی" ہے۔ یہ ایک طرح کا Devotional dance ہے۔ ایک عوامی تیوہار۔ اور اس روز بھانڈ اور کچھ کسان بھی مختلف دیہات

میں، جموں کے بھانگڑہ طرز پر اُچھل اُچھل کر، زوردار ناچ اور گانے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ڈھول اور شہنائی سے اس ناچ میں تال اور لے پیدا کی جاتی ہے۔ اس طرح کا ناچ عقیدت، مسرت اور شادمانی کا مظہر ہے۔ چنانچہ اس طرح کا ناچ دیگر جگہوں کے علاوہ خصوصاً بیجبہاڑہ (ضلع اننت ناگ)، لال صاحب (گاندربل) اور خان صاحب (ضلع بڈگام) میں بڑی شان وشوکت اور احترام سے کیا جاتا ہے۔ ناچ کی جو صورت عورتوں میں قائم ہے وہ "روؤ" ہے اور ہندو اور مسلمان لڑکیاں اس کو ایک ساتھ ادا کرتی ہیں۔ ہندوؤں میں "ویگہ نژن" (رنگولی پرناچنا) شادی بیاہ کے تیوہاروں پر ہوتا ہے۔ اور اب ایسے موقعوں پر نوجوان ڈسکو ڈانس بھی کرنے لگے ہیں۔ ایک خاص بات کی طرف میں اشارہ کرنا چاہوں گا کہ ماہِ رمضان، جو اہلِ اسلام کا نہایت ہی متبرک مہینہ ہے، کشمیر میں بڑی عقیدت سے روزے رکھ کر مکمل کیا جاتا ہے۔ اس مہینے میں دیہات کے (شاید شہروں اور قصبوں کے بھی) رہنے والے مسلمانوں کے صحنوں میں ماہِ مبارک کی فضیلت کے سلسلے میں "روؤ" (دو رویہ نیم دائرے بنا کر پیروں کی تھرکن اور جسمانی حرکات کے ساتھ گیت گانا) کے حسین وجمیل گیت سننے کو ملتے ہیں جو میری واقفیت کے مطابق صرف کشمیر میں ہی گائے جاتے ہیں۔ "روؤ" طرز کا یہ ناچ بعد افطار کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے نوجوان لڑکیاں شروع کرتی ہیں اور اس کا سلسلہ رات گئے تک چلتا رہتا ہے۔

اس تفصیل اور ایک خاص سماجی یگانگت کے بعد ہم مخصوص تیوہاروں کے بارے میں مزید بات کرتے ہیں۔

○ ناگ یاترا۔ شری پی۔ این۔ کے بامزئی کے مطابق یہ تیوہار بھادوں شکلہ پکھش (Bright fortnight) میں تیرہ دن کے لئے منایا جاتا تھا۔ دلچسپ

بات یہ ہے کہ جہانگیر کے عہد تک ہندو اور مسلمان دونوں اس تیوہار کو مناتے تھے۔ بڈشاہ زین العابدین ہر سال اس تیوہار کی تقاریب میں شریک ہوتا تھا۔ بھادوں کے چاند پکھواڑے کے چوتھے دن جیاپیڈ پور میں عقیدت مندوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ یہ ایک طرح کا جشن ہوتا تھا جہاں ہزاروں شائقین جمع ہوتے تھے۔ یہاں پر شراب، ملائی، دال اور کھانے کے بھنڈار ہوتے تھے۔ اگر کوئی شخص نشہ وغیرہ کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا نازیبا حرکت بھی کرتا تو بادشاہ اُس کو برداشت کر لیتا تھا۔

○ ویتھ تُرواہ ۔ (وِتستا تریودشی)۔ بڑے بڑے دریاؤں سے ہر ملک کے لوگوں کو ایک خاص عقیدت ہوتی ہے اور اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کئی ممالک میں شہروں اور علاقوں کے نام بھی کسی مخصوص دریا کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ دور کیوں جائیں کشمیر کو ہی لیجئے۔ گلگت، نوبرا وغیرہ دریاؤں کے ہی نام ہیں۔ کشمیر میں جہلم کو وہی درجہ حاصل ہے جو ملک میں گنگا کو۔ بعض شاستروں نے جہلم میں نہانے کو کافی اہمیت دی ہے۔ اس دریا کے ساتھ کشمیریوں کو ایک خاص طرح کا اُنس اور لگاؤ ہے۔ اگرچہ اب یہ دریا اس اہمیت کو کھو بیٹھا ہے جو اسے پہلے حاصل تھی لیکن اس کے باوجود یہ ماضی کے کئی واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے تازہ کرتا ہے۔ اسی ضمن میں "ویتھ تُرواہ" کا دن جہلم کے جنم دن کے طور پر عہدِ سلاطین اور مغلیہ دور تک منایا جاتا رہا ہے۔ یہ تیوہار منانے میں سبھی لوگ شریک ہوتے تھے۔ پرانے رواج کے مطابق اُس دن دریا کے کنارے بسے ہوئے سب قصبوں میں جہلم کے دونوں کناروں پر چراغاں کیا جاتا تھا۔ کشتیاں اور بجرے جن پر دیئے روشن ہوتے تھے بہتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ بڈشاہ کے جانشین اور بعد میں اکبر اور جہانگیر

کے دور تک بادشاہ بہ نفسِ نفیس لازمی طور اس تقریب میں شرکت کرتا تھا۔ شری ور اس تیوہار کا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کرتا ہے:۔

"چاند کے پکھواڑے کے تیرھویں دن (بھادوں میں) بادشاہ جہلم کے جنم دن پر چراغاں دیکھنے کا خواہش مند رہتا تھا۔ وہ ایک کشتی پر سوار ہو کر راجدھانی میں پہنچتا۔ وہ کشتی میں بہترین طور پر کمپوز (compose) کئے گئے گانوں سے لُطف اندوز ہوتا اور ناؤ پر چڑھتے اور اُترتے وقت لوگوں کی دعائیں حاصل کرتا۔ شہریوں کی طرف سے جہلم کے کنارے رکھے گئے دیئے نہایت شاندار منظر پیش کرتے لگتا جیسے دیوتاؤں نے جہلم پر پھولوں کی بارش کی ہو۔ جب چاند کا عکس دریا میں تھرتھراتا تو لگتا تھا کہ چاند شہریوں کی خوبصورت عورتوں کا حُسن دیکھ کر شرمندہ ہو گیا ہے"۔

○ زنگہ ترے (شگون تریتیا/چیت کا تیوہار)۔ کشمیر کی بہار جو قدرے دیر سے ہی آتی ہے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو ایک وجدانی کیفیت عطا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بہار میں خوشی اور مسرت کا اظہار کرنے اور قدرت کی حسن کاری کو بغور دیکھ کر لطف اندوز ہونے کے لئے یہ تیوہار منایا جاتا تھا۔ یہ تیوہار چیت کے مہینے میں باغات اور کھلے میدانوں میں منایا جاتا۔ اس تیوہار کے موقعے پر پھولوں کے رنگوں کا مشاہدہ ہوتا اور ناچ گانے کی محفلیں سجتی تھیں۔ اس طرح کا تیوہار اب بھی کشمیر میں منایا جاتا ہے جو بہار کے موسم میں چلتا ہی رہتا ہے۔ اور "نوریہہ" اور "بیساکھی" کے تیوہاروں پر اس تیوہار کی خاص چہل پہل رہتی ہے۔ یہ تیوہار خواتین سے مخصوص ہے۔

بقول بامزئی "چیت کے تیوہار پر بادشاہ ایک ناؤ میں سوار ہوتا۔ اُسکا شہزادہ

اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ پھولوں کی بہار دیکھنے کے لئے راجہ "مراز" (جنوبی کشمیر) چلا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مراز میں بہار کی رنگینیاں زوروں پر ہوتی ہونگی۔ اونتی پور سے شروع کرکے، راجہ بیجبہاڑہ کے محلات اور دیگر مقامات کی سیر کرتا۔ وہ کئی مقامات پر اس لئے رکتا کہ شیریں آواز والی اور موسیقی میں ماہر حسیناؤں کے گیت سن سکے۔ اس بارے میں ایک بہترین گانے والی اور رقاصہ "تارا" کا ذکر بھی آتا ہے جو دیگر فن کاروں کے ساتھ "نارٹز" (ایک طرح کی لے) پر گاتی تھی۔ چیت کے تیوہار پر مختلف رنگوں سے بنی ہوئی خصوصی آتش بازیاں چھوڑتی تھیں۔ یہ آتش بازیاں کوئلے کے سفوف، گندھک اور قلمی شورے سے تیار کی جاتی تھیں۔ "شری ور" آتش بازیوں کی ہو بہو تصویر اس طرح پیش کرتا ہے:۔

"نلیوں سے نکلے آگ کے گیند آسمان کی طرف جاتے ہوئے چاندی کی طرح خوبصورت لگتے تھے۔ اور یہ آگ کے گولے زہرہ اور مشتری جیسے لگتے۔ جب شورے کی یہ آگ اگلتی پھلجڑیاں اداکارائیں اپنے ہاتھ میں تھامتی تھیں تو آسمان سے گرتے خوبصورت سنہری تاروں کی طرح چمکتی تھیں۔"

چیت کا یہ تیوہار سارے مسلم دور میں بھی مقبول رہا۔ اس دور میں اس موقعہ پر سری نگر کے لوگ ہاری پربت پر جمع ہوتے تاکہ وہ تیر اندازی اور کشتی کے کرتب دیکھ سکیں۔ لوگ اس روز اپنے جسم پر زعفران، عنبر، کافور اور صندل کا لیپ کرتے تھے اور خوبصورت لگتے تھے۔ بقول "شک" حسن شاہ چک اس تیوہار میں بلا ناغہ شرکت کرتا تھا۔ وہ ایک اونچا نشان گاڑھتا اور جو شخص اس نشان پر مار کرتا، اسے قیمتی تحائف جیسے ہاتھی، گھوڑے اور پیسے سے نوازتا تھا۔

آتش بازی کا یہ تیوہار بعد میں سرینگر میں "جتیس تیس" اور دیہات میں "پھرُوو" کی صورت میں چلتا رہا۔ اول الذکر سری نگر میں جہلم کے کناروں پر نوجوانوں کو دریا کے آر پار جلتے ہوئے کانگڑی کے غول چلاتے میں نے خود دیکھا ہے۔ لیکن اب یہ بھی ختم ہی سمجھئے۔ لیکن جہاں تک دیہات کا تعلق ہے چیت کے ہی مہینے میں لوگ گھاس کے چھوٹے گٹھے جلا کر سردی کو خیر باد کہتے ہیں۔

○ **شری پنچمی**۔ چیت کے بہار یہ تیوہار کے فوراً بعد منائی جاتی تھی۔ آج اس کو بسنت پنچمی کے نام سے منایا جاتا ہے۔ شاید اس تیوہار کا تعلق ہاری پربت میں بنے "شری چکر" سے ہے۔ لیکن یہ تیوہار شنکر آچاریہ مندر کی پہاڑی پر منایا جاتا تھا۔ اس کے لئے بیساکھ کے پہلے پندرھواڑے کی پانچویں تاریخ مقرر تھی۔ مورخ "شک" کے مطابق یہ تیوہار بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا۔ کچھ لوگ خوبصورت گلدستے بنا کر ان کی خوشبو سونگھتے۔ کچھ لوگ نشے میں ہوتے اور جب عورتیں یا اجنبی ان پر مسکراتے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے۔ ناچ گانے کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں اور بادشاہ بہترین فن کاروں کو زر بفت کی پوشاکیں عطا کرتا تھا۔ ڈیسڈری (Desideri) جو ۱۷۱۴ء عیسوی میں کشمیر آیا تھا، تحریر کرتا ہے کہ اس نے یہ تیوہار منانے کے لئے لوگوں کی بھاری تعداد کو شنکر آچاریہ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

○ **پھولوں کا تیوہار**۔ مغل دور میں یہ تیوہار بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ خاص کر جہانگیر اور نورجہاں ڈل جھیل پر تعمیر کردہ نئے باغات میں پاچناروں کی چھاؤں تلے اس تیوہار کا اہتمام کرتے تھے۔ معتمد نے "لالہ رُخ" میں گلابوں

کی رنگینی کو لافانی بنا دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"All Love and Light
visions by day and feasts by night."

"سب کچھ محبت اور روشنی ۔ دن کو تصوری دنیا کی سیر اور رات کو دعوتیں" پھولوں کے تیوہار کا سلسلہ شاید آج تک بہار کے موسم میں سری نگر میں رنگ رنگ کے گلابوں کی نمائش میں موجود ہے۔ اسی طرح کے تیوہار کشمیریوں کے ذوقِ جمال اور حسن و عشق کی غمازی کرتے ہیں۔ زیادہ زمانہ نہیں گذرا جب کشمیری بہار میں بادام کے شگوفوں کا لطف اُٹھانے کے لئے جوق در جوق ہاری پربت کے گرد و نواح میں پہنچتے تھے۔ یہاں بڑے بڑے بادام کے باغ تھے جنھیں کشمیری "بادام واری" کہتے ہیں۔ وہاں قہوہ پیا جاتا اور سنگھاڑے کھائے جاتے تھے لیکن اب یہ باغات سمٹتے جا رہے ہیں اور ان میں تیزی سے مکانات بن رہے ہیں۔

○ "سونتھ" (بسنت)۔ کشمیری پنڈت گھرانوں میں ہر سال نوریہہ (نیا سال) سے کچھ دن پہلے "سونتھ" یعنی بسنت کا تیوہار منایا جاتا ہے۔ اس دن سبھی کشمیری پنڈت گھروں میں ایک تھال سجایا جاتا ہے۔ اس میں چاول کے اوپر پھول، سبزہ، آئینہ، اخروٹ، دودھ، روٹی، قلم، دوات اور کچھ سکے رکھے جاتے ہیں۔ بسنت کی صبح کو گھر کے سب افراد باری باری سے اس تھال کو دیکھتے ہیں بعد میں دن میں گوشت پکایا جاتا ہے اور تھال کے چاولوں کو پیلے رنگ میں پکایا جاتا ہے۔ اسی روز دیہات میں ایک دو پرانی ہانڈیاں اور پولے وغیرہ ایک رسی میں باندھ کر گاؤں سے باہر ایک مخصوص جگہ لے جا کر بید کے درخت پر مار کر توڑے جاتے ہیں۔ وہاں سے دو ایک اخروٹ سبزے میں لپیٹ کر لائے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی تک دیہاتی ہندوؤں میں چلا آتا ہے۔

○ نوریہہ (نیا سال)۔ کشمیری ہندوؤں میں یہ تیوہار بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے۔ یہ تیوہار چیت کے پہلے پکھواڑے کے پہلے دن منایا جاتا ہے۔ کشمیری ہندو قمری سال کے حساب سے مہینوں کا حساب کرتے ہیں۔ اس دن گھر کے سبھی افراد نہاتے ہیں، صاف یا نئے کپڑے پہنتے ہیں۔ گھر میں اچھے اچھے کھانے خصوصاً ماس، مچھلی وغیرہ پکاتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ اس روز دوستوں کی، جن میں غیر ہندو بھی شامل ہوتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد لوگ گھومتے پھرتے ہیں۔ بچے خوش ہو کر کھیلنے میں مصروف رہتے ہیں اور بڑوں سے خرچہ وغیرہ حاصل کرتے ہیں۔ اس تیوہار سے ایک روز قبل "چترا ماوسیا" ہوتی ہے جبکہ ویزار ناگ (سری نگر)، اکن گام (ضلع اننت ناگ)، زینہ پورہ (ضلع پلوامہ) اور کئی دیگر جگہوں پر میلے لگتے ہیں۔ لوگ پوتر چشموں میں نہاتے ہیں اور میلوں میں سبھی مذاہب کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ نئے سال کا یہ تیوہار کشمیری ہندوؤں کے لئے کافی اہمیت کا حامل ہے اور اس میں "نیا سال ٹھیک سے خوش حالی لائے" کی دعائیں گھر گھر میں کی جاتی ہیں۔ شام کو بسنت کے تیوہار کی طرح تھال بھرا جاتا ہے اور صبح لوگ اس تھال کے درشن کرتے ہیں۔

○ بیساکھی یہ تیوہار مغل باغات اور راشٹہ بڑ کے مقام پر منایا جاتا ہے۔ اس روز گوردوارہ چھٹی پادشاہی میں دیوان لگتا ہے لنگر میں ہزاروں سکھ کھانا کھاتے ہیں۔ اس روز گرنتھ صاحب کا خصوصی پاٹھ ہوتا ہے۔ گوردواروں میں شادی مرگ کے گوردوارے کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہاں کئی موقعوں پر دیوان لگتے ہیں۔ کشمیر کے سکھ بھی سبھی گورو مہاراجوں کے دن نہایت آدر اور عزت سے مناتے ہیں۔ ان دنوں یہ زنگار رنگ کپڑے پہنتے ہیں اور گورو صاحبان کے راستے پہ چلنے کا عہد کرتے ہیں۔ ان دنوں ترال، مٹن، اننت ناگ اور دیگر سبھی گوردواروں

میں خصوصی دیوان منعقد ہوتے ہیں۔ گورو گرنتھ صاحب کا پاٹھ بھی ہوتا ہے اور پرشاد بانٹا جاتا ہے۔ عام لوگ اس دن باغات کی سیر کو جاتے ہیں۔

○ جیشٹھ اشٹمی (میلہ کھیر بھوانی)۔ یہ ایک مذہبی تیوہار ہے کشمیری پنڈت اس روز گھروں میں کھیر اور پوریاں بناتے ہیں، پوجا پاٹھ کرتے ہیں اور نوید بانٹتے ہیں۔ اکثر ہندو اس روز تولہ مولہ جاکر کھیر بھوانی کا درشن کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں باہر سے آئے کچھ سیاح بھی شریک ہوتے ہیں۔ یہاں پر ایک تاریخی چشمہ ہے جو رنگ بدلتا رہتا ہے۔ کالے اور سرخ رنگ کو برا شگون اور دودھیا، ہرے اور نیلے رنگ کو اچھا شگون مانا جاتا ہے۔ یہاں دن بھر لوگ آتے رہتے ہیں اور پوجا پاٹھ میں شریک ہوتے ہیں۔ جو لوگ یہاں نہیں آسکتے وہ تحصیل کولگام کے منزگام گاؤں میں بنے دیوی کے مندر پر جاکر پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔ اس جگہ شوپیان، بلوامہ، کولگام اور اننت ناگ کے مختلف دیہات سے یاتری آکر دن بھر بھجن گاتے ہیں اور کھانا پکاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایک روز پہلے ہی ڈیرہ جمالیتے ہیں۔ اس دن یہاں یگیہ وغیرہ بھی رچایا جاتا ہے۔

○ آشاڑھا اشٹمی۔ یہ تیوہار ماہ ہار میں چاند کے پکھواڑے کے آٹھویں دن آتا ہے۔ اس روز مکان کی صفائی کی جاتی ہے اور رنگولیاں بنائی جاتی ہیں۔ یہ رنگولیاں برانڈے، دہلیز اور چوکے کے علاوہ صحن میں بھی بنائی جاتی ہیں۔ کچن میں بنی رنگولی پر پیالے میں (کانسی کے) چاول اور پانی رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں انار کے پھولوں کی ایک ٹہنی ڈال دی جاتی ہے۔ دن میں اس پر ایک ٹوکری رہتی ہے اور شام کو یہ کسی انار کے پیڑ کے نیچے ڈالی جاتی ہے۔ اس روز بھی لوگ تولہ مولہ جاتے ہیں اور وہاں پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔

○ ساون پورنما (امرناتھ یاترا)۔ کشمیر سے باہر اس تیوہار کو رکھڑی کے طور پر منایا جاتا ہے اور بہن بھائی کو راکھی باندھتی ہے۔ کشمیر میں اس تیوہار کو شوجی کا تیوہار مانا جاتا ہے۔ اس روز امرناتھ میں برف سے بنے شولنگ کے درشن ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس یاترا میں شریک نہیں ہوتے وہ گھروں میں برت رکھتے ہیں اور کھیر یا پوری کھاتے ہیں۔ گھر کو اچھی طرح صاف کیا جاتا ہے اور پوجا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپ ہے کہ امرناتھ کی گپھا پر جو چڑھاوا اس دن آتا ہے اس میں قصبہ مٹن کے مسلمان "ملکوں" کا بھی حصہ ہے۔ مشہور ہے کہ انہوں نے ہی اس گپھا کو کھوجنے میں مدد کی تھی۔ اسی روز بجبہاڑہ کے قریب "ہتجارہ" میں ایک میلہ لگتا ہے جہاں دور دور سے لوگ آکر شریک ہوتے ہیں۔ ؎

○ جوالا چتردشی۔ اس روز بھی لوگ برت رکھتے ہیں اور جوالا مکھی (کھریوہ پانپور) میں میلہ لگتا ہے۔ ہزاروں لوگ اس روز جوالا مکھی کے درشن کرنے جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہاں ایک آگ کی جوالا (شعلہ) پتھروں کے بیچ سے لگاتار جلتی رہتی تھی۔ لوگ نیچے چشمے میں نہاکر مندر میں تہری اور بھیڑ کے پکائے ہوئے پھیپھڑے نذر کرتے ہیں۔

○ چندن ششٹھی۔ یہ تیوہار کشمیری پنڈتانیوں سے وابستہ ہے اور نیل مت پوران میں بھی اس تیوہار کے منائے جانے کا ذکر موجود ہے۔ یہ اسی طرح کا تیوہار ہے جس طرح پنجابی یا ڈوگری عورتیں کڑوا چوتھ کا تیوہار مناتی ہیں۔ البتہ اسے منانے کا ڈھنگ بالکل مختلف ہے لیکن مقصد ایک ہی ہے کہ اپنے اپنے خاوندوں کے لئے درازیٔ عمر مانگنا۔ اس دن عورتیں دن بھر فاقہ کرتی ہیں۔

؎ جہاں یاتری اشنان کرتے ہیں اور پوجا کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

دن میں کئی بار نہا کر لال چندن لگایا جاتا ہے۔ شام کو چاند نکلنے کے بعد ورت توڑا جاتا ہے۔ اس روز عورتیں نمک کا استعمال نہیں کرتیں۔ یہ تیوہار بھادوں مہینے میں منایا جاتا ہے۔

○ **اننت چودش** (اننت چترودشی)۔ یہ کشمیری ہندوؤں کا بہت ہی قدیم تیوہار ہے اور ناگ دور کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس روز یہاں ناگ پوجا کی جاتی تھی۔ آج کل اس روز اننت ناگ کے بڑے چشمے پر میلہ لگتا ہے۔ اس دن عورتیں سانپ کی شکل کا ایک چھوٹا سا دھاگا پہنتی ہیں۔ پہلے مرد بھی زُنار کے ساتھ اس دھاگے کو باندھتے تھے۔ لیکن اب یہ چلن کم ہوگیا ہے۔ عورتوں کے "اننت" کیسری یا لال رنگ کے ہوتے ہیں اور مردوں کے سفید رنگ کے۔ اس تیوہار سے واضح ہے کہ یہ ناگ قبیلے کا تیوہار تھا جسے بعد میں سب ہندوؤں نے اپنا لیا۔

○ **پن دینا** (ستہ نرائن کی پوجا)۔ یہ تیوہار بھادوں کے چاند کے پکھواڑے میں منایا جاتا ہے۔ اس روز گھی پر بڑے بڑے روٹھ (بڑی روٹیاں) بنائے جاتے ہیں۔ بیب درد کی کتھا ہوتی ہے اور نوید بانٹا جاتا ہے۔ بیب ردد ویر بھدر کی بگڑی صورت ہے۔

○ **کھچر ماوس** (کھچڑی اماوس)۔ اس تیوہار کا ذکر بھی نیل مت میں ہے۔ یہ دن یکھشوں اور ناگوں کی صلح سے متعلق ہے۔ اس روز یکھشوں کے لئے مکان کے اوپری طبقے میں کھچڑی پکا کر رکھی جاتی ہے تاکہ ناگوں کو یکھشوں اور پشاچوں سے کوئی خطرہ نہ رہے۔ اس روز کشمیری پنڈتوں کے گھروں میں خوب صفائی ہوتی ہے اور سب لوگ شام کے وقت کھچڑی اور اچار کھاتے ہیں۔ جو کشمیری پنڈت وطن سے باہر ہیں وہ بھی یہ تیوہار بلاناغہ مناتے ہیں۔ اسی سے متعلق ایک اور تیوہار بھی ہے جسے "گاڈہ بتہ" یعنی مچھلی بھات کا تیوہار کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ناگوں کا

ہی تیوہار ہے۔ کیوں کہ ناگ مچھلیوں کے بڑے شوقین تھے اور انہوں نے اپنے لئے مچھلی کے درجنوں چشمے مخصوص کر لئے تھے۔ اور ان مچھلیوں کو ناگوں کے بغیر اور کوئی کھا نہیں سکتا تھا۔

○ **گور ترے** (گوری ترتیا)۔ ماگھ مہینے میں چاند کے پکھواڑے کے تیسرے دن یہ تیوہار منایا جاتا ہے۔ یہ تیوہار مصوری سے متعلق ہے اور اس بات کا گواہ ہے کہ قدیم زمانے میں کشمیری مصوری سے دل بہلاتے تھے۔ اس روز پروہت اپنے ججمانوں کے گھر ایک ایک دو دو ہاتھ سے بنی تصویریں لے جاتے ہیں اور دکھشنا حاصل کرتے ہیں۔

○ **کاوِ پنیم** (کاک پورنما)۔ ماگھ مہینے کی پورنماشی کو یہ تیوہار پڑتا ہے۔ یہ دن کوؤں کو کھلانے سے متعلق ہے۔ کوّا سماجی زندگی کے بہت قریب ہے۔ شاید اسی لئے اس کا دن بھی منایا جاتا ہے۔ اس روز برت رکھا جاتا ہے اور گھاس اور لکڑی کے پتل بنا کر اُن پر چاول وغیرہ رکھ کر کوؤں کیلئے مکان کے اوپری طبقے میں رکھا جاتا ہے۔ اس دن سے متعلق ایک لوک گیت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

کاگا رے کاگا!
کھچڑی والے کاگا!
اپنی کوّی کو ساتھ لے کر
گنگ بل میں نہا کر
بھوری مٹی سے ٹیکا لگا کر
لال ریشم کا جنیو ڈال کر
آ! ہمارے نئے مکان پہ

وڑیوں والا بھات کھا!

کچھ کشمیری پنڈت ماگھ کا مہینہ پورا مان کر اس مہینے میں صرف ایک وقت کھانا کھاتے تھے۔

○ ہیرتھ (شیوراتری)۔ اگرچہ یہ تیوہار ہندوستان کے سبھی ہندو بڑی عقیدت سے مناتے ہیں لیکن کشمیر میں یہ تیوہار بالکل ہی الگ طریقے پر منایا جاتا ہے۔ یہ تیوہار شیو اور پاروتی سے متعلق ہے اور نیل مت پران میں اس کا ذکر وضاحت سے کیا گیا ہے۔ پھواڑے (پھاگن مہینہ) کے ساتویں روز سے سارے گھروں میں لپائی اور صفائی کے بعد قریب ایک ہفتہ تک اس تیوہار کی مختلف رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ تیرہویں یا چودہویں دن پوجا ہوتی ہے۔ اس روز گھر کا مالک برت رکھتا ہے۔ ایک خاص کمرے میں' جو اس کیلئے مخصوص ہوتا ہے' پوجا کا سامان اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک بڑا گڑھا ایک چھوٹا گڑھا اور دیگر مٹی کے پیالے وغیرہ ہوتے ہیں۔ مٹی کے جو برتن استعمال میں آتے ہیں اُن کا تعلق بُرزہوم سے حاصل کئے گئے برتنوں سے واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ شام کو دعوت ہوتی ہے۔ دوسرے روز جسے سلام کہتے ہیں پیشہ ور لوگ آتے ہیں اور اُن کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ بچوں کو نئے کپڑے' مٹھائیاں اور خرچہ دیا جاتا ہے۔ اس روز گھر کے سب افراد چاہے وہ ریاست سے باہر بھی ہوں اکٹھا ہوتے ہیں اور بڑی دھوم دھام سے اس تیوہار کو مناتے ہیں۔ن

ن تہوار یا میلے کسی بھی مخصوص معاشرے کی اجتماعی و روحانی مسرتوں اور اعتقادات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ انہیں منانے سے جہاں ایک معاشرے کی سماجی روایات اور تہذیب کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے وہیں افراد کو ایکدوسرے کے فکری رجحانات کو سمجھنے کا بھی موقعہ ملتا ہے جس سے سماجی رشتے مضبوط بنانے میں مدد ملتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تہواروں کے تفریحی مقاصد

اب کچھ ایسے تہواروں کا ذکر جو ہمارے ہاں مسلمان بھائی اپنے مخصوص انداز میں مناتے ہیں۔ ہم یہاں پر ایسے تہواروں کا ذکر نہیں کریں گے جو کہ کشمیری مسلمان دنیا بھر کے مسلمانوں کی طرح پوری عقیدت و احترام سے مناتے ہیں گو کہ اُن میں بھی کشمیری مسلمانوں کا اپنا ایک منفرد انداز ہوتا ہے۔ مثلاً ماہ رمضان اور عیدین اور دوسرے کچھ موقعوں پر مسلمان عورتیں کشمیر میں "رَوْو" یا "رَوْف" گیت گا کر اپنی خوشیوں اور مسرتوں میں اضافہ کرتی ہیں۔ شاید ہی کوئی اور جگہ ہو جہاں ایسا ہوتا ہو۔ عید رؤف گیتوں کی اچھی خاصی تعداد ہمارے لوک گیتوں میں بھی محفوظ ہے۔

اسی طرح بزرگانِ دین اور اولیاءاللہ کے عرسوں پر یہاں درود و اذکار کے علاوہ ان بزرگان سے منسوب ختمات بھی پڑھے جاتے ہیں۔

○ کھئیم (گیارہویں)۔ چھٹی صدی ہجری کے عظیم روحانی پیشوا و بزرگ اور سلسلۂ قادریہ کے بانی حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کا عرس مبارک' جن کا روضۂ مبارک بغداد میں ہے' اگرچہ پورے برصغیر کے مسلمان احترام و عقیدت سے مناتے ہیں لیکن کشمیر میں یہ عُرس منانے کا بھی اپنا ہی انداز ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو ہی نہیں' بلکہ کشمیری پنڈت جاتی کو بھی اس عظیم روحانی پیشوا سے بے پناہ عقیدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی جب یہاں کوئی مشکل میں ہوتا ہے یا دستِ نگر ہوتا ہے تو اپنے آقا سے رجوع کرتا ہے۔ پنڈت جاتی کے لوگ حضرت پیرؒ کو "کہنوو" کہتے ہیں۔

خانیار سرینگر میں حضرت محبوب سُبحانی سید عبدالقادر جیلانیؒ کے موئے مبارک کے علاوہ کچھ اور تبرکات بھی ہیں۔ حضرت پیرؒ کا یومِ وصال ہر سال ١١ ربیع الاول کو بڑے ہی احترام و عقیدت سے منایا جاتا ہے اور پوری وادی کے اطراف و اکناف

(مسلسل از حاشیہ صفحہ گذشتہ) سے انکار ممکن نہیں اور یہ ہر کھوں کی شاندار روایات کو برقرار رکھنے کا موقعہ بھی فراہم کرتے ہیں۔ اب شیوراتری کو ہی لیجئے۔ جنوبی ہند میں اس دن جہاں وِشنو بھوجن لازمی ہے کشمیر میں ماس وغیرہ پکایا جاتا ہے۔ (ایڈیٹر)

سے عقیدت مند آستانۂ عالیہ پر حاضری دیتے آتے ہیں اور موئے شریف کے دیدار سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں اسی مناسبت سے قمری مہینے کی ہر گیارہویں کو حضرت پیرؒ کے عقیدت مند نذر و نیاز کرتے ہیں اور ختمات وغیرہ پڑھواتے ہیں۔ گیارہویں کو خاص طور حضرت پیرؒ کے نام پر چائے بنا کر لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں جسے "کہنچ چائے" (گیارہویں کی چائے) کہا جاتا ہے۔ گیارہویں کی چائے مسلمان اور ہندو دونوں ہی فرقوں کے عقیدت مند کرتے ہیں۔

○ **عرس حضرت شیخ نورالدین ولیؒ۔** حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین نورانیؒ کی پاک زندگی سے کون کشمیری واقف نہیں۔ انہوں نے لل دید کے بعد کشمیری شاعری کو "شرُک" کی صنف میں بہت کچھ دیا ہے۔ ان کا پنڈتی کلام نہایت گہرا، سنجیدہ اور فلسفیانہ ہے۔ اُن کے کلام میں تزکیہ نفس، سچائی، اخوت اور وحدت کے سدا بہار پھول موجود ہیں[1]۔ وہ کیموہ میں پلے بڑھے، وہیں سال ہا سال تک

۱؎ کشمیر کو اپنے مکین "ریشہ وار" یعنی ریشیوں کی پھلواری کہہ کر پکارتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین نورانی ریشی سلسلے کے بانی ہیں۔ کشمیر میں اسلام کی اشاعت کے بعد بھی لوگ اگرچہ "ریشیت" سے یکسر کنارہ کشی نہ کر سکے اور خلوت پسندی، ترکِ دنیا و ترکِ لذات جیسی روایات کو ایک نئے انداز میں اپنائے رہے (گو کہ یہ بات ظاہراً اسلامی تعلیمات کے منافی لگتی ہے کیوں کہ اسلام تو سعی و عمل اور جد و جہد کی دعوت ہی نہیں دیتا بلکہ اسکی تاکید بھی کرتا ہے) لیکن شاید ریشی سلسلے سے وابستہ حضرات نے یہاں کے لوگوں کے سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ اور مزاج کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے حصولِ مقصد (تبلیغ دین) کیلئے ریشی مسلک پر کاربند رہنا مناسب سمجھا ہو۔ حضرت شیخ کے کلام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُن کے نزدیک یہ سلسلہ ایک عقیدے کی توسیع ہے۔ آپ نے اپنے عارفانہ کلام میں بشمولِ خود سات ریشیوں کے نام لئے ہیں جنہیں وہ اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے ہیں:۔

اوّل ریشی احمد ریشی   دوئم حضرت اویس آو   ترییم ریشی زلکا ریشی   ژوریم حضرت میران آو

پونژیم ریشی رومہ ریشی   شییم حضرت پلاس آو   ستیم کرہم شنا ریشی   یہ کس ریشی منہ کیا ناو

(دفعہ کہیں جگہ یوں بھی لکھا ہے: "ستم مس کرہم ہشنا دیشی / دشنا ہشی) — ایڈیٹر

ایک غار میں عبادت کرتے رہے اور بعد میں ساری وادی کے اہم مقامات پر تشریف آور ہوئے۔ انہوں نے مختلف مقامات سے متعلق جو کہاوتیں کہی ہیں وہ آج تک زبانِ زدِ خلائق ہیں۔ اُن کی قرارگاہوں میں زمر، دیگام، روپہ وُن اور ہونڑی پورہ (بیروہ) کافی مشہور ہیں۔ اُن کی آخری آرام گاہ چرار شریف ہے جہاں ہر روز زوار کو سلسلہ لگتا ہے۔ چرار شریف میں کشمیری سن کے[1] ۸ رلبوہ کو، جو اکتوبر کے مہینے میں آتا ہے، ایک بھاری عرس منایا جاتا ہے۔ اس روز وادی کے طول و عرض سے عقیدتمند یہاں آتے ہیں[2]۔ تبرکات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ لوگ یہاں سے کالے رنگ کی مٹی کے خوبصورت برتن اور چرار میں بنی ہوئی نازک لیکن خوب گرم رہنے والی کانگڑیاں خرید کر لے جاتے ہیں[3]۔ لوگ یہاں نذر و نیاز لا کر رات کو رہتے ہیں[4]۔ جن قرارگاہوں کا اوپر ذکر کیا گیا

۱؎ اس موضوع پر میری اپنے رفیق شری موتی لال ساقی سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ عرس حضرت شیخ العالمؒ کی خاص بات یہ ہے کہ عرس کے دن جہاں آستانۂ عالیہ پر درود و اذکار کے بابرکت اجتماع ہوتے ہیں وہیں رات کو عورتیں ونہ وُن (گیت گانے) کی محفلیں سجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ رات کو سعد رنئے (شہنائی) وادن بھی ہوتا ہے جو صبح دم اختتام پذیر ہوتا ہے — (ایڈیٹر)

۲؎ کسانوں میں اس عرس کی زمینداری کے حساب سے بھی ایک اہمیت ہے۔ وجہ یہ کہ اس عرس کے ساتھ ہی گوالے / گڈریے زمینداروں کے ریوڑ چرانا چھوڑ دیتے ہیں اور تحمیت مزدور زمینداروں کے گھر چھوڑ کر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ — ایڈیٹر

۳؎ اس کے علاوہ یہاں کی خاص چیز "شنگہ ہیچہ" (سوکھے ہوئے ناشپاتی) ہیں جو زائرین بطور تبرک و تحفہ اپنے عزیز و اقارب کے لئے ساتھ لاتے ہیں — (ایڈیٹر)

۴؎ اسے ستم ظریفی ہی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخؒ اور اُن کے بیشتر خلفاء زندگی بھر گوشت کھانے سے اجتناب کرتے رہے۔ کچھ لوگ آج بھی چرار شریف میں عرس کے دوران گوشت کھانے سے پرہیز کرتے ہیں لیکن اکثر گھروں میں اس روز بے حساب گوشت کے پکوان مہمانوں کو پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ ریشیوں کے عرس کے موقع پر ڈھائی دن پہلے اور ڈھائی دن بعد پورے علاقے میں اور جہاں جہاں اُن کے عقیدت مند موجود ہیں گوشت یا گوشت کا کوئی پکوان پکایا نہیں جاتا۔ اسے "پال ہٹون" یا "پال پانچ" کہتے ہیں — (ایڈیٹر)

ہے وہاں بھی اسی روز عرس منایا جاتا ہے[1] ۔ یہاں پر لوگ اپنی مُرادیں پانے کے لئے دھاگا باندھتے ہیں جسے کشمیری زبان میں "دُش گنڈنِ" کہتے ہیں۔ مراد پوری ہونے پر لوگ نذر و نیاز دے کر دھاگے کو کھولتے ہیں۔ شاید یہ سلسلہ بودھوں سے چلا آرہا ہے ۔

○ **عرس ریشی مول** ۔ اننت ناگ میں بابا ہردی ریشی عرف ریشی مول کا عرس اُن کے یوم وصال پر یکم ذیقعدہ کو منایا جاتا ہے ۔ پانچ روز تک قصبہ اننت ناگ اور ملحقہ دیہات میں گوشت اور مچھلی کھانا ترک کیا جاتا ہے[2] ۔ ریشی صاحب ایک اعلیٰ پایہ کے بزرگ اور فقیر تھے کہتے ہیں انہوں نے عمر بھر گوشت نہیں کھایا بلکہ نہایت سادہ کھانا اور پہراوا پہن کر زندگی گذارتے رہے ۔ اس درگاہ پر ہندو اور مسلمان سب حاضری دینے آتے ہیں ۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے چند وزرائے اعظم بھی یہاں حاضری دینے آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسی بزرگ کی زمین پر آج اننت ناگ حنفیہ کالج قائم ہے۔ اس سکول کی وابستگی اس ٹرسٹ سے ہے جو ریشی مول کی درگاہ کی نگہداشت کرتا ہے ۔

○ **عرس بابا نصیب الدین غازی**۔ آپ اعلیٰ پایہ کے ریشی تھے۔ فارسی زبان میں تحریر کردہ آپ کا ریشی نامہ شیخ العالمؒ کی زندگی اور ان کے کلام کا جامع مرقع ہے۔ ان کا یوم وصال ۱۲ محرم الحرام ہے ۔ ان کے یوم وصال پر بجبہاڑہ میں دو تین روز تک میلہ لگتا ہے جس میں مضافات کے علاوہ اسلام آباد اور سری نگر سے بھی لوگ شرکت کرنے آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس روز کیموہ سے ایک

---

[1] حضرت شیخ کے خلفاء کے عرس بھی نہایت عقیدت و احترام سے منائے جاتے ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے ۔ (ایڈیٹر)

[2] اسے "پال پالنہ" یا "پرکھ پال" کہا جاتا ہے ۔ (ایڈیٹر)

جلوس نکلتا تھا[3] جو بجبہاڑہ کے پادشاہی باغ میں اختتام پذیر ہوتا تھا۔ اس پاس کے دیہات سے لوگ بڑی عقیدت سے بابا نصیب الدین کی زیارت کو آتے ہیں ان میں وہ بھانڈ بھی شامل ہوتے ہیں جو ایک مخصوص لوک ناچ (دمالی) اور گانے سے لوگوں کے دل کو اپنی اور کھینچ لیتے ہیں ۔ اس میلے میں کسان زن و مرد، بوڑھے بچے سبھی شرکت کرتے ہیں ۔

○ **عرس بتہ مول** ۔ حضرت شیخ داؤد کو کشمیری محبت اور عزت و احترام سے "بتہ مول" کہتے ہیں ۔ انہوں نے زندگی بھر گوشت یا مچھلی وغیرہ نہیں کھائی ۔ اُن کا تعلق شاہجہاں اور اورنگزیب کے زمانوں سے ہے۔ آپ کے والد کا نام شیخ شنگل بٹ تھا ۔ اُن کا پیشہ کاشتکاری تھا ۔ پھر وہ خواجہ یوسف کاٹجو کے مُرید بنے اور عشق الٰہی میں مگن ہوگئے ۔ ان کے عقیدت مندوں میں مسلمان ہی نہیں کشمیری پنڈت بھی شامل ہیں ۔ مشہور ہے کہ اُن کے غیر مُسلم عقیدت مند انہیں "بٹہ مول" کہا کرتے تھے ۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار کشمیر میں سخت کال پڑا ۔ حضرت شیخ اُبلے ہوئے چاول "بتہ" حاجت مندوں میں تقسیم کرتے اور غریبوں کی بھوک مٹاتے جس پر انہیں "بتہ مول" (اَن داتا) کہا جانے لگا ۔ آپ کا مزار اقدس بٹہ مالو بس اسٹینڈ کے قریب ہے ۔ انہیں کے نام پر اس پورے علاقے کو بٹہ مالُن کہا جاتا ہے ۔ انہیں "داوِ بٹہ مول" بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ مشاہدے میں آیا ہے کہ اُن کے عرس کے موقعہ پر بلا ناغہ سخت زور کی آندھی چلتی ہے ۔ پورے بٹہ مالُن علاقے میں اور جہاں جہاں آپ کے عقیدت مند موجود ہیں آج بھی ان کے عرس مبارک پر عرس سے ڈھائی دن پہلے اور عرس کے

---

[3] آج سے کوئی ۲۰/۲۵ سال قبل ایسا ہوتا تھا۔ جلوس میں کسی باکردار شخص کو گھوڑے پر بٹھا کر جلوس کی شکل میں بجبہاڑہ لایا جاتا تھا۔ اس کو "ڈاگہ پہراز" کہا جاتا تھا ۔ (ایڈیٹر)

ڈھائی دن بعد گوشت یا مچھلی وغیرہ نہیں پکائی یا کھائی جاتی۔

○ **جشنِ نوروز۔** ہمارے ہاں نوروز عام طور شیعہ فرقے کا تہوار مانا جاتا ہے اور یہ کشمیر اور ایرانی ثقافتی تعلقات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگرچہ اس روز دیگر فرقے بھی اس جشن میں شریک ہوتے ہیں۔ اس دن ریاست بھر میں تعطیل رہتی ہے۔ کسانوں میں اس تہوار کو بہار کی آمد اور ایک طرح سے (Demarcation Line) کی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ نوروز کے موقعہ پر ہی گوالے چرواہے ریوڑ چرانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھیت مزدور بھی زمینداروں کے ہاں جنس کے عوض کھیتوں پر مزدوری کے لئے آجاتے ہیں۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ میں نے اس مضمون میں عید، شب قدر، شب معراج جیسی مقدس تقاریب کا ذکر نہیں کیا۔ کیوں کہ یہ مقدس تہوار دنیا بھر کے مسلمانوں کی طرح کشمیری مسلمان بھی روایتی عقیدت اور انہماک سے مناتے ہیں۔ آثار شریف حضرت بل، جسے مدینہ ثانی بھی کہا جاتا ہے کشمیر کی اسلامی تعمیرات میں سب سے بلند مقام رکھتا ہے۔ یہاں ہر دن بڑا دن ہے۔ جمعہ اور دیگر اسلامی تیوہاروں پر ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں آکر اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور خاص مواقع پر موئے مقدس جناب سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے فیضیاب ہو کر سکونِ قلب پاتے ہیں۔

بہر حال تیوہار ہماری زندگی اور معاشرے کا ایک اہم حصّہ ہیں۔ ان سے مذہبی اور سماجی رہنماؤں کا درس ہم تک جاری رہتا ہے اور زندگی میں ایک طرح کا رچاؤ قائم رہتا ہے۔ کشمیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر تیوہار یہاں بھائی چارے کی فضا میں منائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے تیوہاروں اور بڑے دنوں کو عزّت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پسِ نوشت

○ **عرس بابا رشی۔** حضرت بابا پیام الدین کا روضۂ مبارک ٹنگمرگ سے تقریباً چار کلو میٹر دور ایک پہاڑ پر واقع ہے۔ عرس مبارک کے علاوہ یہاں وادی کے مختلف اطراف سے سینکڑوں افراد روزانہ اپنا ہدیۂ عقیدت نذر کرنے آتے ہیں۔ وادی کے لوگوں میں ایک اعتقاد یہ ہے کہ جس کسی عورت کے اولاد نہ ہو اگر وہ اس آستانہ عالیہ پر جاکر حاضری دے اور وہاں پر موجود چولھے کی لپائی کرے تو اس کی گود بھر جاتی ہے۔ چنانچہ آج بھی ہر روز درجنوں عقیدتمند چولھا لیپنے آتے ہیں۔ مشہور ہے کہ اگلے وقتوں میں جب کسی کی منت پوری ہو جاتی تو وہ پہلا بچہ آستانِ عالیہ کو نذر کر دیتا اور ایسے بچوں کو "ریشہ کُٹھ" (ریشیوں کی اولاد) کہا جاتا تھا۔ حضرت بابا پیام الدین "بابم ریشی" کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

○ **عرس زین شاہ صاحب۔** آپ حضرت شیخ العالمؒ کے خلیفۂ دوم ہیں۔ آپ نے اس زمانے میں عیش مقام جیسے دور دراز علاقے میں تبلیغ دین کا اہم مشن پورا کیا اور وہیں پُراسرار طور وفات پائی۔ وہیں آپ کا مزارِ مقدس ہے جہاں آپ کے عرس پر ہزاروں کی تعداد میں عقیدت مند حاضری دینے جاتے ہیں۔ ان کے عرس مبارک پر جنوبی کشمیر میں آج بھی ایک تقریب کا انعقاد ہوتا ہے جسے کشمیری میں "پھرِ زہ زالُن" کہتے ہیں۔ جنوبی کشمیر شدید سردی کے لئے مشہور ہے۔ بہار کی آمد پر یہاں "لشہ زُول" کاہرو کی لکڑی سے تیل والی چھپٹیاں جن کو جلائی جاتی ہیں اور اس طرح بہار اور نئے سال کا سواگت کیا جاتا ہے۔ یہ ایک

بہت ہی قدیم رسم ہے جس کا ذکر نیل مت پوران میں بھی موجود ہے اور یہ تقریب اس رسم کی اب واحد یادگار ہے۔

○ **عرس سید علی بلخیؒ**۔ آپ کا آستانہ عالیہ بچھرپورہ میں ہے۔ آپ اپنے جلال کی وجہ سے پوری وادی میں مشہور ہیں۔ آپ کے عرس مبارک پر پوری وادی سے بہترین گلوکار اور موسیقاروں کی ٹولیاں یہاں آتی ہیں اور رات بھر سماع کی محفلیں ہوتی ہیں۔ اس زیارت شریف کے بارے میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ میلہ کے دوران وادی بھر کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے زائرین یہاں سے آلات کشاورزی خریدتے ہیں۔ یہاں آلات کشاورزی کی فروخت میلے کی ایک اہم اور منفرد خصوصیت ہے۔ حضرت بلخیؒ کے بارے میں ریشی نامے میں درج ہے کہ جس جگہ وہ اس وقت آسودہ ہیں وہ قطعۂ زمین اپنے ساتھ بلخ سے لائے ہیں۔

○ **گونگل**۔ اسے خالصتاً کسانوں کا تیوہار کہا جا سکتا ہے کیوں کہ جس دن دھان کی بوائی ہوتی ہے اس روز سوکھی ہوئی سبزیاں پکائی جاتی ہیں اور تہری بانٹی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کچے چاول اور اخروٹ وغیرہ کھیتوں پر بچوں میں بانٹے جاتے ہیں۔

○ **بل**۔ یہ بھی کسانوں ہی کا ایک تیوہار ہے۔ جب بالیاں نکل آتی ہیں اور خوشے تیار ہو جاتے ہیں تو پورا گاؤں مل کر چاول اور گوشت پکاتا ہے اور پھر لوگ ایک دوسرے کو کھلاتے ہیں۔ اس تیوہار پر میرے رفیق شری موتی لعل ساقی نے مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پکوان کا کچھ حصہ کھیتوں کی نذر کیا جاتا ہے اور باقی گاؤں والے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس پانی سے گوشت دھویا جاتا ہے وہ کھیتوں میں چھڑکا جاتا ہے — (محمد احمد اندرابی)

مضمون کے سلسلے میں حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

(۱) نیل مت پران : انگریزی ترجمہ : ویدکماری گھئی

(۲) کاشرین مسلمانن ہندی رسم تہٕ رواج (کشمیری مسلمانوں کے رسم و رواج) تحریر غلام محمد خان، مطبوعہ کشمیری ڈیپارٹمنٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر

(۳) کاشرین بٹن ہندی رسم تہٕ رواج (کشمیری پنڈتوں کے رسم و رواج) مصنف: سوم ناتھ پنڈت مطبوعہ کشمیری ڈیپارٹمنٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر

(۴) اے ہسٹری آف کشمیر، مصنف پی۔ این۔ کے۔ بامزئی

(۵) "ہمارا ادب" سنہ ۱۹۷۹-۸۰ء (جموں و کشمیر نمبر) مطبوعہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز۔

• — (ارجن دیو مجبورؔ)

○

ریشم

انسائیکلوپیڈیا امریکہ کے مطابق چین یا ہندوستان ریشم کے ابتدائی گہوارے ہیں یا پھر یہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اس کا گہوارہ رہے ہوں مگر صرف ایک چینی ہی یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ ریشم کی دریافت کس طرح اور کب ہوئی تھی۔؟ کس شخص کو اس کی دریافت کا فخر حاصل ہوا تھا؟ ہندوستان کو ریشم کے بارے میں اس قسم کی کسی تاریخی اعتبار کی آگہی حاصل نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چین کی ایک ملکہ نے شہتوت کے درخت کی شاخوں پر ایک سفید کیڑے کو توت کے پتے کھاتے دیکھا جو کچھ دیر بعد غائب ہوجاتا تھا اور پھر ان ہی درختوں پر سفید غنچے پیچھے چھوڑ جاتا۔

ایک دن یہی ملکہ باغ میں ایک بڑے درخت کی گھنی چھاؤں میں اپنی سہیلیوں کے سنگ بیٹھی چائے پی رہی تھی کہ اتفاق سے اس کی چائے کی گرم پیالی میں ایک سفید کیڑا آن گرا۔ اس نے کسی سے یہ چائے گرا دینے کو کہا۔ مگر وہ یہ دیکھ کر بے حد حیران رہ گئی کہ اس غنچے سے ایک لمبی تارِ عنکبوت سی باہر نکلی۔ اس مہین تار کو کھینچا گیا

تو معلوم ہوا کہ سارا غنچہ ہی دراصل اسی دھاگے یا تار کا بنا ہوا ہے اور یہ سینکڑوں گز لمبا ہے۔ اس بیدار مغز ملکہ نے ان اسرار و رموز میں بے پناہ دلچسپی لی اور مسلسل تجربوں کے بعد اس تار کو حاصل کرنے کا باقاعدہ طریقہ تلاش کیا گیا اور آہستہ آہستہ ریشم کا کاروبار رائج ہونے لگا اور اسے بتدریج مقبولیت حاصل ہونے لگی۔

چین کے لوگ اس ملکہ کو برابر آج تک ایک دیوی کا مرتبہ دیتے آرہے ہیں اور چار یا پانچ ہزار برس گزرنے کے باوجود وہاں لوگ آج بھی ہر برس اس عظیم المرتبت خاتون کی یاد عقیدت و احترام کے ساتھ مناتے ہیں۔

ملکہ کا نام "سی لنگ چی" بتایا جاتا ہے اور اس کا تعلق فوہی کے شاہی خاندان سے رہا ہے۔ چینی مورخوں کے مطابق یہ دو ہزار سات سو قبل مسیح کا زمانہ رہا ہے جو انجیل میں بتائے گئے طوفانِ نوحؑ سے ایک سو سال قبل کا زمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں بھی ریشم کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ سنسکرت میں اسے "پٹ" کہا جاتا ہے اور ایک اندازے کے مطابق کشمیری کا لفظ "پوٹ" بھی اسے "پاٹ" یا "پٹ" لفظ سے نکلا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین صوفی نے اپنی کتاب "کشیر" کی جلد دوئم میں تحریر کیا ہے کہ ارسطو اور ٹالیمین نے بھی ریشم کے کیڑے پر تفصیل سے سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

ریشم کی آگہی اور اس کے کاروبار کا سلسلہ یورپ تک چھٹی صدی میں جاکر پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہاں تک سپین سے مسلمانوں کے دورِ حکومت میں پہنچا ہے۔ پروفیسر کے حتی "عرب اور اسلام" نام کی کتاب میں تحریر کرتے ہیں: "فرانس، اٹلی اور یورپ کے دوسرے ممالک میں بارہویں صدی میں ریشم کا ایک کپڑا ملتا تھا جسے عربی میں "تابی" کہا جاتا تھا اور یہ اسی نام سے اب تک دنیا میں معروف ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب اسے تابی کی جگہ "ٹابی" کہا جاتا ہے۔ پروفیسر حتی

یہ بھی لکھتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کی یورپی خواتین JAFFETA نام کے ریشمی ملبوسات کو بیحد پسند کرتی تھیں۔ اس لباس کو فارسی میں "تافتہ" کہا جاتا تھا اور ہم بھی آج تک اِسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔

کشمیر میں ابریشم کا ارتقائی عمل دھند کی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ ہمیں حتمی طور ابھی بھی یہ علم نہیں ہے کہ آیا ریشم کا کیڑا ہم نے خود دریافت کیا تھا یا یہ ہندوستان کے کسی حصے سے یہاں منتقل ہوا تھا یا پھر خود چین ہی سے لایا گیا تھا۔؟ پنڈت رام چند کاک جو مہاراجہ ہری سنگھ کے وزیرِ اعظم تھے، کو برزہ ہامہ میں آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے دوران ایک ٹائل دستیاب ہوا تھا جس کے متعلق ماہرین کی رائے یہ ہے کہ یہ تین ہزار سال پرانی ہے۔ اس ٹائل پہ ایک خاتون کی تصویر بنی ہوئی ہے جو باریک ریشمی لباس زیب تن کئے دکھائی دیتی ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کا کپڑا اُس دور میں چین سے یہاں آتا رہا ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کشمیری اسے خود بنتے رہے ہوں۔ اس زمانے کو "Neolithic age" کہتے ہیں۔ اور اس دور میں کشمیری ابھی غاروں اور گپھاؤں میں گذر بسر کرتے تھے۔ تاریخی شواہد موجود ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر میں ایک ہزار سال قبل مسیح تہذیب و تمدن کا دور دورہ رہا ہے۔

ریشم کی صنعت کا ابتدائی تاریخی ثبوت ہمیں چینی سفیر ہیون سانگ کے سفرنامے سے ملتا ہے۔ ہیون سانگ ۶۳۰ء میں کشمیر آیا۔ کہتے ہیں کہ اُن دنوں بیجبہاڑہ میں ایک عالمی بودھ کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہیون سانگ لکھتا ہے کہ کشمیر میں ریشم ایک جنگلی کیڑے سے حاصل کیا جاتا ہے اور یہاں کے الف لیلوی بازار رنگا رنگ قسم کے اونی اور ریشمی کپڑوں سے بھرے دکھائی دیتے ہیں۔

جنگلی غنچۂ ابریشم کو ریشم کے تار کے لئے استعمال میں لانے کا مطلب یہ ہے

کہ کشمیر کا اپنا ایک مقامی بیج رہا ہے جو اُن ایام میں ابھی پالتو نہیں بنا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کشمیر کی ریشم کے شعبے میں ایک الگ حیثیت رہی ہے اور غالباً کشمیریوں نے اسے خود ہی دریافت بھی کیا ہے اور اس کی ترقی کے لئے خود ہی کوششیں بھی کی ہیں۔ چنانچہ آج بھی ہمارے جنگلات میں شہتوت کے درختوں پر ریشم کے کیڑے اور ننھے منے غنچے دکھائی دیتے ہیں لیکن نہ ہم اس طرف کوئی توجہ دیتے ہیں اور نہ ہمارے پاس تحقیقات کا کوئی ذریعہ ہے۔!

تاریخ رشیدی میں مغل گورنر میرزا حیدر دوغلات کہتے ہیں کہ سلطان زین العابدین (بڈشاہ) کے دور میں یہ صنعت اپنے شباب پر تھی۔ اس کی تجارت بخارا کے ساتھ ہوا کرتی تھی اور بیج اور ریشم کا لین دین اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔

بُخارا سے کشمیر کے ریشم نے دمشق، مغربی ایشیا اور یورپ کی منڈیوں میں شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ میرزا حیدر دوغلات یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ ۱۵۴۰ء کے زمانے میں، جب وہ خود کشمیر کے گورنر تھے، تو کشمیر کے سبھی اہم بازاروں میں ریشم کے زرق برق جگمگاتے کپڑے آنکھوں کو چکا چوند کر دیتے۔ ان نرم، کومل اور دلآویز پارچہ جات کے سحر انگیز رنگ ان بازاروں میں الف لیلوی راتوں کا سارا حسن بھر دیتے۔ اتنے نفیس ریشمی پارچے دنیا کے مشہور شہروں میں بھی نہیں ملتے تھے لیکن کشمیر میں یہ نہایت آسانی سے دستیاب ہوتے تھے۔ میرزا حیدر یہ بھی لکھتے ہیں کہ خراسان جیسے علاقے میں، جسے ماوراء النہر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا، اس قسم کے پارچہ جات کہیں نہیں ملتے تھے۔ مگر ریشم کی صنعت کو ہمیشہ ہی اچھے دن دیکھنا نصیب نہیں ہوئے۔ یہ صنعت سینکڑوں برسوں تک گم گشتہ راہوں میں بھٹکتی رہی ہے۔

آئینِ اکبری میں ابوالفضل کشمیر کے ریشم کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کشمیر

ہیں توت کے پتّے ریشم کے کیڑوں کو کھلائے جاتے ہیں۔ لوگ شہتوت نہیں کھاتے۔ دیکھیں تو یہ بات آج بھی مطابقت رکھتی ہے کہ کشمیری ریشم کے کیڑوں کو توت کے پتّے کھلاتے ہیں اور خود ان درختوں کے شہتوت کھانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ہاں کھانے کے لئے توت کی ایک مخصوص اور میٹھی قسم اگائی جاتی ہے چنانچہ علاقہ زینہ گیر اس قسم کے شہتوت کے لئے کافی مشہور ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ ماضی میں قحط سالی کے دوران ان میٹھے شہتوتوں کو سکھایا جاتا تھا پھر انہیں پیس کر ان کے آٹے کی روٹی بنائی جاتی تھی۔!

جہانگیر بھی اپنی کتاب "تزکِ جہانگیری" میں ابوالفضل کے بیان کی تائید کرتا ہے چنانچہ وہ بھی کہتا ہے کہ کشمیر کے لوگ گلگت اور تبت سے ریشم کا بیج لاتے ہیں۔

کشمیر میں اب بھی کئی ایسی جگہیں ہیں جنہیں "تُلہ پچھر" یعنی خطِ شہتوت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان مقامات پر شہتوت کے وسیع و عریض باغات یا پھر توت کے درختوں کے گھنے جنگل رہے ہیں۔ ان جگہوں کے پاس ریشم کے کیڑے پالنے والے اور ریشم کا کاروبار کرنے والے لوگ رہتے تھے۔

ماضی میں ریشم سازی نجی طور کی جاتی تھی۔ سکھوں کے عہد میں بھی ریشم کا کاروبار لوگوں کے ہاتھوں میں ہی تھا اور بڑے پیمانے پر ہوا کرتا تھا۔ جی ٹی وینی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ ۱۸۳۵ء میں ابریشم کے شعبے کا ایک علیحدہ گورنر مقرر کیا گیا جس کا نام مہان سنگھ تھا۔ مشہور ہے کہ اس زمانے میں چاول کے بدلے ریشم خریدا جاتا تھا۔ ایک تہائی حصہ کشمیر میں استعمال ہوتا تھا اور باقی سارا پنجاب روانہ کیا جاتا تھا۔

منشی گنیش داس اپنی کتاب "تحفۂ کشمیر" میں تحریر کرتے ہیں کہ ۱۸۴۶ء میں حکومت کو ریشم کی صنعت سے دو ہزار اشرفی کی آمدن حاصل ہوتی تھی۔ یہ سکھوں کا

آخری اور ڈوگروں کا ابتدائی دور رہا ہے۔

ڈاکٹر مدسودن گنجو پی ایچ ڈی کی اپنی تھیسز (THESIS) میں کہتے ہیں کہ ۱۸۵۵ء میں یورپ میں ریشم کے کیڑوں کی وبا پھوٹ پڑی اور ان کی نسل ہی ختم ہوگئی۔ فرانس اور اٹلی، جہاں ریشم کی صنعت سینکڑوں برسوں سے چلی آرہی تھی، مایوس ہوگئے۔ اُن دنوں کشمیر پر مہاراجہ گلاب سنگھ کی حکومت تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۸۶۶ء میں یورپ کو کشمیر کا محتاج ہونا پڑا اور دو اطالوی ماہرین نے کشمیر سے پچیس ۲۵ ہزار اونس بیج خریدا۔ اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر اس دور میں کافی ترقی پر رہا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ ہم یورپ کے محتاج ہوتے گئے۔ اب ہم برس ہا برس سے اٹلی اور فرانس سے بیج منگاتے رہے ہیں اور آج تک اس سلسلے میں جاپان کی طرف آس بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہم مانگے کے اُجالے پہ تکیہ کئے ہوئے ہیں لیکن خود اپنا بیماریوں سے پاک و صاف بیج بنانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ۱۸۷۰-۱۸۷۱ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنے چیف جسٹس کے۔ این۔ مکرجی کو ریشم کی صنعت کا سربراہ مقرر کیا۔ وہ اگرچہ ایک بنگالی تھا لیکن اسے ریشم کے کام سے دلچسپی تھی۔ مہاراجہ نے ریشم کی اہمیت و افادیت بڑھانے میں بے پناہ کاوشیں بروئے کار لائیں۔ اس نے مرشد آباد سے دو ماہرین کو یہاں بلایا اور ریشم کا سارا کاروبار اُن کے سپرد کیا۔

۱۸۸۱ء میں حکومت نے ریشم کے کیڑے پالنے والوں سے پہلی بار نقد روپے کے عوض ریشم کے غنچے خریدے اور اس طرح روپے کا لین دین بھی شروع ہوا۔ اور سرکاری کنٹرول بھی۔ یہ سلسلہ ابھی تک قائم ہے اور یہ صنعت اب بھی "Government Monopoly" کے تحت چل رہی ہے۔

اسی برس دو سرکاری کارخانے بھی قائم کئے گئے۔ ان میں سے ایک اسلام آباد

تحصیل میں ڈیپرپور میں اور دوسرا سری نگر میں ہفت چنار میں۔ چونکہ ان کا پورا انتظام مرشد آباد کے ماہرین کے ہاتھ میں تھا اس لئے دونوں ہی کارخانوں کو "مرشد آباد کے کارخانے" کہا جاتا رہا۔ ایک تیسری فیکٹری رگھوناتھ پور نسیم باغ کے پاس قائم کی گئی اسے بہرام پور فیکٹری کا نام دیا گیا کیونکہ یہاں بہرام پور (بنگال) کا ایک ماہر کشمیریوں کو متعلقہ کام کی تربیت دیتا تھا۔

کشمیر ریشم کے کام کے لئے بہترین جگہ تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ صرف کشمیری ماہرین کی ہی رائے نہیں ہے۔ یہاں جو بھی بیرونی ماہر فن آیا اس کا یہی کہنا تھا کہ ارض کاشمر ریشم سازی کے لئے موزوں ترین جگہ ہے۔ ڈاکٹر تازیما جو عالمی شہرت کے سائنسدان ہیں اس صدی کی چھٹی دہائی میں کشمیر آئے تھے وہ بھی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ کشمیر میں ریشم کے لئے جاپان کی طرح موزوں آب و ہوا پائی جاتی ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو کئی ایک معاملات میں کشمیر ہی برتر درجہ رکھتا ہے۔

میری دانست میں ہمارے یہاں اس صنعت کی پس ماندگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس صنعت اور کاروبار کو پہلے پہل مہاراجاؤں نے اپنے ہاتھ میں لیا اور کشمیریوں کو یہ تاثر ملا کہ یہ بھی بیگار ہی کا ایک حصہ ہے۔ کسی شکستہ و بوسیدہ توت کے درخت کی شاخ کاٹنے پر بھی اُن کے ساتھ بے پناہ ظلم کیا جاتا۔ ظلم کی انتہا یہ تھی کہ دہشت زدہ کشمیری کی زبان پر یہ محاورہ چل نکلا "الٰہ اُکس تُلہ کل کرُن" یعنی کسی معمولی بات کا بہانہ بنا کر مصیبت میں پھنسانا۔ طبری کا یہ "کالا قانون" آج تک جاری ہے۔ بے چارہ کسان درخت اگاتا ہے، جگر کا خون دے کر یہ بوٹے پالتا ہے مگر جب یہ تناور درخت بن جاتے ہیں تو یہی کسان اگر انہیں ہاتھ بھی لگائے تو اس کے ہاتھ کاٹ دئے جاتے ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے بعد پرتاپ سنگھ نے ریشم خانہ نئے طرز پر چالو کرانے کا کام

نہ Dr. TAZIMA

پورا کیا۔ سر والٹر لارنس کو ریشم کی سروے کا کام تفویض کیا گیا اور اُن کی ہی سفارش پر پہلی بار اٹلی سے تارکشی کی اعلیٰ مشینیں منگائی گئیں۔ رام باغ میں ایک وسیع قطعہ اراضی کی نشاندہی کی گئی اور ۱۹۰۷ء میں یہاں ریشم خانہ قائم کیا گیا جو آج تک اس جگہ کام کر رہا ہے — اپنی انہی شکستہ و ٹوٹی پھوٹی مشینوں کے ساتھ!

ایس۔ این۔ کول "کشمیر اکنامکس" نامی کتاب میں کہتے ہیں کہ ساٹھ ہزار لوگوں کو کام پر لگایا گیا۔ مگر کول صاحب یہ نہیں بتاتے کہ ان میں سے ریشم کے کیڑے پالنے والے کتنے تھے اور تارکش کتنے تھے؟ میرے خیال میں کول صاحب نے جو مجموعی تعداد گنوائی ہے اس میں انہوں نے کرم کشوں کی بڑی تعداد کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اُن کے مطابق ایک لاکھ پونڈ قیمت کا ریشم پہلی بار تیار کیا گیا۔

ریشم خانے میں اب تک دو بار آگ لگی ہے — ۱۹۰۳ء میں اور ۱۹۱۳ء میں۔ ان سے کارخانے کو بے پناہ نقصان پہنچا تھا مگر حکومت کی نمایاں معاونت سے ۱۹۱۹ء تک اس کی سالانہ آمدن تین لاکھ ساٹھ ہزار سے تجاوز کر کے بارہ لاکھ تک جا پہنچی۔

کہا جاتا ہے کہ ممتاز انگریزی شاعر رُڈیارڈ کپلنگ پہلے شخص ہیں جنہوں نے برطانیہ سرکار سے کہا کہ کشمیر میں ریشم سازی کے زبردست امکانات موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ انہی کی سفارش پر برطانیہ سرکار کی طرف سے سلک ایسوسی ایشن آف گریٹ برٹن و آئرلینڈ کے سر تھامس وارڈل کشمیر بھیج دئے گئے جنہوں نے یہاں آکر ریشم کی صنعت کو نئے طریقوں پر چلانے کا سیر حاصل جائزہ لیا اور ۱۸۹۷ء میں یہاں کشمیر سری کلچر ڈیپارٹمنٹ کا قیام عمل میں لایا گیا اور مسٹر سی۔ ڈبلیو والٹن اس کے پہلے ڈائریکٹر مقرر کئے گئے۔ اس صدی کی چوتھی دہائی تک انگریز، فرانسیسی یا اطالوی ماہرین ہی اس کارخانے کی نگرانی کرتے رہے ہیں۔ چھوٹے موٹے ملازم مقامی ہوا کرتے تھے۔ تارکشوں

کے ساتھ سختی برتی جاتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر ان کے ساتھ جبر کیا جاتا تھا، انہیں جسمانی اذیتیں دی جاتی تھیں، اُن سے جُرمانہ لیا جاتا تھا اور صبح صادق سے شام کے دُھندلکوں تک اِن سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا تھا —!

برطانیہ کشمیر سے ریشم کے کاروبار کا پُورا فائدہ اُٹھا کر گیا۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کا سُورج طلُوع ہونے کے وقت توُت کے درخت بھی پرانے ہو چلے تھے اور اطالوی مشینیں اور ان پر کام کرنے والے تارکش بھی عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ کرم کشوں کے جھونپڑے اُس بیماری کے سپورز[۱] سے بھرے ہوئے تھے جس نے یورپ میں ریشم کے کیڑوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا تھا۔ لوئی پاسچر[۲] اُن دنوں ایک اعلیٰ پائے کے سائینس دان مانے جاتے تھے جنہوں نے کافی تحقیق و جستجو کے بعد اس بیماری کا سراغ لگایا اور اس کا نام PEBRINE رکھ دیا۔ انہوں نے بیماری سے پاک و صاف ریشم کے کیڑوں کا بیج تخلیق کیا۔ ہر ملک جہاں ریشم بنایا جاتا ہے وہاں بیج گھر بھی قائم کئے جاتے ہیں جن میں سینکڑوں سیڈ ایگزامنرز کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو بیماری سے پاک بیج تیار کرتے ہیں لیکن یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اس بیماری کے سپور گرد و غبار، چھت، در و دیوار اور کونوں کھدروں میں برسوں تک زندہ رہ سکتے ہیں اور ریشم کے کیڑوں کو بیمار کر سکتے ہیں۔ یہ بیماری اس قدر منحوس ہے کہ اٹلی کے ماہرین گذشتہ صدی کے دوران بے حد مایوس ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک ممتاز اطالوی ماہر نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اٹلی میں ریشم کا قابل فخر محل خود اپنی بنیادوں میں دفن ہو رہا ہے" —

(پروفیسر لمبارڈی)

راقم کو نہایت افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ کشمیر کی ریشم کی صنعت میں جب تک ایک انقلاب نہیں لایا جائے گا تب تک یہاں کے

---

[۱] SPORE بیماری کے جراثیم اپنی حفاظت کیلئے ایک سخت خول بنا لیتے ہیں۔

[۲] PASTEUR

ریشم خانے بتدریج روبہ انحطاط رہیں گے۔

۱۹۵۲ء میں راقم نے یہ بات اس وقت کے وزیر اعظم مرحوم شیخ محمد عبداللہ پر واضح کی تھی۔ میں نے کہا کہ اکثر دیہات کے قرب و جوار میں پائے جانے والے جنگلات خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہزاروں ایکڑ اراضی درختوں سے خالی ہے۔ مرحوم نے میری یہ بات تسلیم کی تھی اور چیف کنسرویٹر مسٹر پٹھانیہ سے صلاح و مشورہ کے بعد ایک نائب تحصیلدار کو یہ کام تفویض کیا گیا تھا کہ وہ اس قسم کے قطعات اراضی کی نشاندہی کرے۔ مقصد یہ تھا کہ ان جگہوں پر ٹریکٹر چلا کر توت کے بیج بوئے جائیں اور ان پر توت کے جھاڑی نما درخت اُگائے جائیں۔ ان جگہوں کے پاس ہی کم لاگت کے بڑے بڑے شیڈ بھی تعمیر کئے جائیں جہاں بیماری سے پاک و صاف ریشم کا بیج بھی تیار کیا جائے اور کرم کشی کا کام بھی بڑے پیمانے پر ہاتھ میں لیا جائے۔ مگر ۱۹۵۳ء کے سیاسی انقلاب میں یہ سکیم بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ یہ منصوبہ اگر حقیقت کا رُوپ دھار لیتا تو آج ہمارے یہاں ریشم کی پیداوار کی صورتحال قطعی طور مختلف ہوتی۔ کرم کش غنچۂ ابریشم بنانے میں سرگرم ہوتے اور خود ہی تار کھینچتے اور اس کی بُنائی کا کام بھی انجام دیتے۔ بے زمینوں کو اس طرح پورے سال کے لئے کام مل جاتا۔

۱۹۵۶ء کا موسم گرما میں نے چین میں گذارا۔ چھ ماہ تک میں چین کے اطراف و اکناف کی سیر کرتا رہا اور ریشم خانوں کی مجموعی حالت کا جائزہ لیتا رہا۔ لیونگ صوبے میں، جو چین کا ایک شمالی حصہ ہے، میں نے شاہ بلوط کے جھنگے پودوں پر ٹسر کیڑوں کی پرداخت ہوتے دیکھی۔

اکتوبر کے مہینے میں چین سے واپس آتے ہی میں نے جموں میں ٹسر غنچوں کی تلاش شروع کر دی۔ میں اُن دنوں وہاں ریشم خانے کا ڈائریکٹر تھا۔ اپنی تلاش کے دوران مجھے دو قسم کے کیڑے ملے۔ میں نے انہیں "سواتکا"[۱] اور "رائلی"[۲] نام دئے۔

---

[۱] SUVATIKA [۲] ROYLEI

خوش قسمتی سے یہ دونوں ملک میں اُس وقت رائج غنچۂ ابریشم کی اقسام سے نرم ثابت ہوئے اور ان سے مقابلتاً زیادہ لمبا تار بھی حاصل ہوا۔ یہ ایک اہم کامیابی تھی جو ہزاروں برس تک ہندوستان میں ممکن نہیں ہو سکی تھی۔

اس کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی اور میرے کام کا جائزہ لینے کے لئے دنیا کے بڑے بڑے ماہرین اور سائنسدان یہاں آئے۔ ان میں سر جے۔ بی۔ ایس ہالڈین (کلکتہ) ڈاکٹر ڈی تازیما (جاپان) اور ڈاکٹر وشنک (فرانس) قابلِ ذکر ہیں۔

اسے میری خوش قسمتی سے تعبیر کیجیے کہ میں جاپان کے کیڑوں کی ایک مخصوص قسم PERNEYI کو جموں کی "رایلی" سے ملانے میں کامیاب ہوا اور ایک مخلوط کیڑا HYBRID حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی جس کو دنیا کی بہترین اقسام میں شمار کیا جانے لگا اور اس سے ملک کی بیشتر ریاستوں نے تو استفادہ کیا لیکن ہماری ہی ریاست اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکی۔

میں نے ۱۹۵۶ء میں ایک اور کامیابی حاصل کی۔ کاسٹر جیسے جموں میں ارنڈ کہا جاتا ہے اور جو بے کار پڑی ہوئی زمین پہ اگتا ہے اور جسے گائے گھوڑے یا دیگر مویشی بھی کھانے سے احتراز کرتے ہیں، کے پتوں پر میں نے "اری" قسم کے ریشم کے کیڑے کی پرورش شروع کی۔ یہ عمل میں نے سال میں چھ مرتبہ دوہرایا۔ اس کا غنچہ ایک جانب سے خالی رہتا ہے اور اُبالے جانے کے بعد اس سے ریشم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا کاروبار آسام میں اس قدر وسعت اختیار کر گیا ہے کہ دوشیزائیں اس کی اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی ساڑھیاں شادی کے موقع پر پہنتی ہیں لیکن میرے بعد اس کام کی بھی کوئی نمایاں تقلید نہیں ہو سکی۔

● — (کشمیری سے ترجمہ)

مترجم: جان محمد آزاد

سلطان الحق شہیدی

پیپرماشی

پاپامیسی، پاپیرمیچی یا پیپرمیشی کو کارِ منقش، کارِ قلمدان، کارِ قلمکاری یا کارِ قلمدانی بھی کہتے تھے جسے اب نقاشی جیسے مختصر سے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

بولنے اور لکھنے کی طرح نقاشی (ڈرائنگ) بھی ایک قسم کا طریقۂ اظہار ہے۔ بولنے میں ہم آوازوں کا استعمال کرتے ہیں جبکہ ڈرائنگ میں خود اشیا کا نقشہ اتار کر مقصد کا اظہار کرتے ہیں۔ لکھنے اور ڈرائینگ میں ہم اپنی آنکھوں اور ہاتھوں کو استعمال کرتے ہیں مگر بولنے میں صرف زبان کو۔ جبکہ لکھنا اور ڈرائینگ دوسری طرح بھی مشابہ ہیں یعنی دونوں کے ذریعہ ہم اپنے خیالات کو دوسرے اشخاص تک پہنچانے کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے ڈرائنگ یعنی نقاشی کو ہنر کہہ سکتے ہیں کیوں کہ لکھنا تو انہی لوگوں کی سمجھ میں آتا ہے جو اس خاص زبان کے حروف سے واقف ہوں مگر ڈرائنگ صرف آنکھوں کی مدد سے سمجھی جا سکتی ہے بشرطیکہ دیکھنے والے میں ذوق اور حسن موجود ہو۔

پیپرمیشی کا ہنر، جسے دستکاری بھی کہتے ہیں، اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ کاغذ بنانا بلکہ اس سے بھی زیادہ قدیم کیوں کہ سجاوٹ، رنگ و روغن، نزاکت اور اس کا اظہار

انسانی خمیر میں موجود ہے۔

اگلے زمانے میں انسان نے گارے کے ساتھ گھاس کا چورا، چیتھڑے اور روئی وغیرہ ملا کر یا کوٹ کر کھلونے کی طرح مختلف اشیاء بنا کر ان کو رنگ و روغن سے مزین کرنا شروع کیا۔ ان اشیاء کا وزن کاغذ ایجاد ہونے کے سبب ہلکے پن میں تبدیل ہوتا گیا۔ آج تک کی معلومات کے مطابق کاغذ بھی ریشم کی طرح ۱۰۵ء میں پہلے چین ہی نے بنانا سیکھا ہے۔ اس کے بعد یہ ہنر وسط ایشیا میں پہنچا جہاں سے یہ عرب اور عرب سے سپین، اطالیہ اور فرانس تک آگیا اور اسی طرح ایران تک بھی۔ خود عرب میں کلام مجید اول اول ہرن کی کھال اور ہڈیوں وغیرہ پر تحریر کیا جاتا تھا۔ جب اسلام وسط ایشیا تک پہنچا، کہتے ہیں کہ ۷۵۱ء میں یہاں کے کاریگروں کو عرب لے جایا گیا جہاں انہوں نے کاغذ کی صنعت کو فروغ دیا۔

غرض کاغذ کی صنعت ایک طرف سے شمال و مغرب اور دوسری طرف جنوب و مغرب کی طرف پھیلتی گئی۔ نقش کاری یا نقاشی جس کا دوسرا رخ مصوری ہے بھی دور قدیم میں چین ہی میں درجۂ کمال تک پہنچی ہے اس لئے کاغذ کی دریافت ۔۔ اس پر نقش کاری کرنا اور یادگاری چیزوں پر PASTE کرنا سمجھ میں آتا ہے۔

پیپر انگریزی زبان کا لفظ ہے جو اطالوی زبان سے مستعار ہے۔ چیتھڑوں، روئی اور گھاس کے علاوہ درختوں کے بیچ کے نرم گودے کو کوٹ کوٹ کے مالیدہ سا بنانے یا اس سے کوئی چیز بنانے کو دراصل پاپیر میشی ہی کہا جاتا تھا۔ جس کی صاف، پتلی اور شفاف پرتوں کو بعد میں پیپر کہا جانے لگا۔ یہاں تک اس مالیدے کو کسی قالب پر چڑھا کر، کارآمد روپ میں ڈھالنے اور اس پر پھول کاری سے سجانے کا تعلق ہے عمومی طور اسی کو پیپر میشی کہتے ہیں۔ کارِ قلمدان، کار قلمدانی یا کار قلمکاری ممکن ہے اس وجہ سے اس کو کہا جاتا ہے کہ کسی بھی چیز پر نقش کاری اور بیل بوٹے

تو قلم اور پتلے برشوں سے بنائے جاتے تھے۔ البتہ کار قلمدان اس بات سے اس کو علیحدہ کر دیتا ہے کیوں کہ یہ قلمدان بنانے کے کام کو کہتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ دونوں نام فارسی یعنی ایرانی ہیں۔

اگرچہ ہماری ریاست کا تجارتی اور تمدنی میل جول گذشتہ دور سے سمرقند، تاشقند اور بخارا سے رہتا آیا ہے مگر کار قلمدانی ہم تک ایران سے پہنچا ہے۔ کہا جاتا ہے یہ ہنر سلطان زین العابدین نے یہاں کی گھریلو صنعت Home Industry کو بڑھاوا دینے کی غرض سے کشمیر لایا ہے۔ مگر دوسری روایت ہے کہ بانی مسلمانی حضرت میر سید علی ہمدانیؒ نے اپنے رفقاء اور مبلغین کی جو جماعت ساتھ لائی تھی اس نے نہ صرف دینی تبلیغ پر اکتفا کیا بلکہ لوگوں کو سماجی اور اقتصادی طور مضبوط بننے کے لئے ان کو نئے نئے فنون سے روشناس کیا۔ حضرت میر سید علی ہمدانی قدس سرہ نے ایک مفصل مضمون "ذخیرۃ الملوک" تحریر فرمایا تاکہ ہمعصر سلطان اس کے مطابق عمل پیرا ہو کر آنے والے بادشاہوں کی خاطر ایک روشن مثال رہے۔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے مفکر علامہ اقبالؒ ان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:۔

مرشدِ آن کشور مینو نظیر   میر و درویش و سلاطین را وزیر
خطۂ آن شاہ دریا آستین   داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آن مرد ایرانِ صغیر
با ہنرہائے غریب و دلپذیر

چنانچہ یہ بات بالکل درست ہے کہ پیپر میشی بھی ان کے ساتھیوں ہی نے یہاں کے لوگوں کو سکھائی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امیر تیمور جب آس پاس کے ممالک پر حملہ کر کے ان پر قابض ہوتا گیا تو کشمیر کے شاہمیری بادشاہ سلطان سکندر نے شاہی خان (زین العابدین) کو بہت سے قیمتی تحائف دے کر تیموری دربار میں بھیجا

جہاں تیمور شاہی خان کے تدبر، حوصلہ مندی اور فراست کو دیکھ کر بڑا متاثر ہوا اور اسے اپنے ہمراہ رکھا۔ سمرقند جیسے ان دنوں تیمور صنعت کاری کا مرکز بنا رہا تھا، شاہی خان ہر صنعت کے بارے میں ذاتی دلچسپی لیتا رہا اور پوری تندہی سے انکا جائزہ بھی لیتا رہا چنانچہ جب شاہی خان سلطان زین العابدین کے نام سے سربراہ سلطنت ہوا تو اس نے کشمیر کی ہمہ جہت ترقی کے بارے میں تمام تر توجہ صرف کی۔

ہیون سانگ کے سفرنامہ اور راج ترنگنی کے حوالے سے یہ بات صاف آشکارا ہے کہ کشمیر کے تجارتی تعلقات تبت کے ساتھ رہے ہیں اور یہاں کے عوام کا اکثر حصہ دستکاریوں میں مصروف رہتا تھا۔ البتہ جو فراغت اور امن و امان بڈشاہ (زین العابدین) کے دور حکومت میں کشمیر کو نصیب رہا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس دردمند بادشاہ کے روشن کارناموں کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ منہ سے بڈشاہ بادشاہ نکل جاتا ہے اور یہی نام اسے آئندہ بھی جاوداں بناتا رہے گا۔ ہر وہ حاکم جس نے عوامی کاموں کی جانب دھیان دیا یا دے گا اس کے لئے بڈشاہ ثانی کا لقب حاصل کرنا باعث صد افتخار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بڈشاہ کی والدہ کے مقبرہ کے باہر کوٹے ہوئے کاغذ کے منقش ٹائل لگائے گئے تھے۔ ہنر مردم (تہران جلد ۳، ۷) کے مطابق ماہرین کار نے تفصیل سے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ پیپر میشی کا کام سلجوقی دور میں ایران میں شروع ہوا ہے جو بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ یہ کام کار قلمدانی یعنی PEN HOLDER سے شروع ہوا ہے۔ صفوی دور میں ایرانی کاری گروں نے قلمدانی کام میں نیا پن پیدا کیا۔ قلمدان بڑے بڑے لوگوں کے لئے ایک امتیازی نشان بنا ہوا تھا۔ کیونکہ یہ نہ صرف قلم اور دوات رکھنے کا ایک ڈبہ ہی ہوا کرتا تھا بلکہ ایک قیمتی شیء بھی ہوا کرتی تھی۔ یوں رفتہ رفتہ قلمدان

کے ساتھ دیگر اشیاء بھی منسلک ہوتی گئیں۔ یعنی بوتلیں، رومال، انگوٹھیاں، چوڑیاں اور مہریں STAMPS وغیرہ بھی۔ چونکہ قلمدان اونچے درجے کے لوگوں کا وجہ امتیاز گردانا جاتا تھا اس لئے یہ لوگ اسے ایک دوسرے کے ہاں ایک قیمتی تحفے کے طور بھی بھیجا کرتے تھے۔ کاری گروں نے بھی اس میں طرح طرح کی طرحداریوں کا اضافہ کیا۔ اس طرح یہ BRIEF CASE زیورات کے بکسوں، ڈبے اور دیگر چیزوں کی صورت میں انگڑائی لیتا رہا۔

شروع میں جن کاری گروں اور ہنرمندوں کو ایران اور ترکستان سے یہاں لایا گیا تھا ان کے کام کو بڈشاہی دور میں نشاۃ الثانیہ ملا۔ اور تیسری بار چک دور میں سرکاری سرپرستی کے تحت اس کے ہنرمند پنپتے رہے۔ انہیں باضابطہ خصوصی مراعات سے نوازا گیا۔ ان دنوں اس کے مراکز جڈی بل، مدین صاحب، حسن آباد اور کمنگرپورہ وغیرہ تھے۔ چک دور کے بعد جب کشمیر مغلیہ سلطنت کے زیر تسلط آگیا تو مغل یہاں کے کئی کاری گروں کو لاہور، دلی اور آگرہ لے گئے۔ یوں پیپر میشی کے کاری گر دو طرح کے فائدوں سے فیض یاب ہوئے۔ اول یہ کہ مغل محلات اور حویلیوں کی چھتوں اور رشاہ نشینوں کو نقاشی سے سجایا جانے لگا۔ دوم ان کی تیار کی ہوئی اشیاء مہنگے داموں بکنے لگیں۔ اس سے پہلے انہوں نے کشمیر کے امام باڑوں کی چھتوں اور دیواروں، زیارت گاہوں کے گنبدوں کے اندرونی حصوں اور کھڑکیوں اور دروازوں کے پٹ اپنی لافانی صناعی سے بھر دئے تھے جس کی گواہی آج بھی یہ چیزیں خاموش زبان سے دے رہی ہیں۔

پٹھان دور حکومت میں یہ فن بھی دیگر فنون کی طرح ایک طرح سے منجمد ہو گیا۔ سکھوں نے اگرچہ کوئی اچھا کام نہیں کیا البتہ کشمیری ہنر سے زیادہ تعصب بھی نہیں برتا بلکہ اس کے ساتھ دوستانہ رویہ ہی اپنایا اور اب اس کی نوعیت ہی بدل گئی

ہے ۔

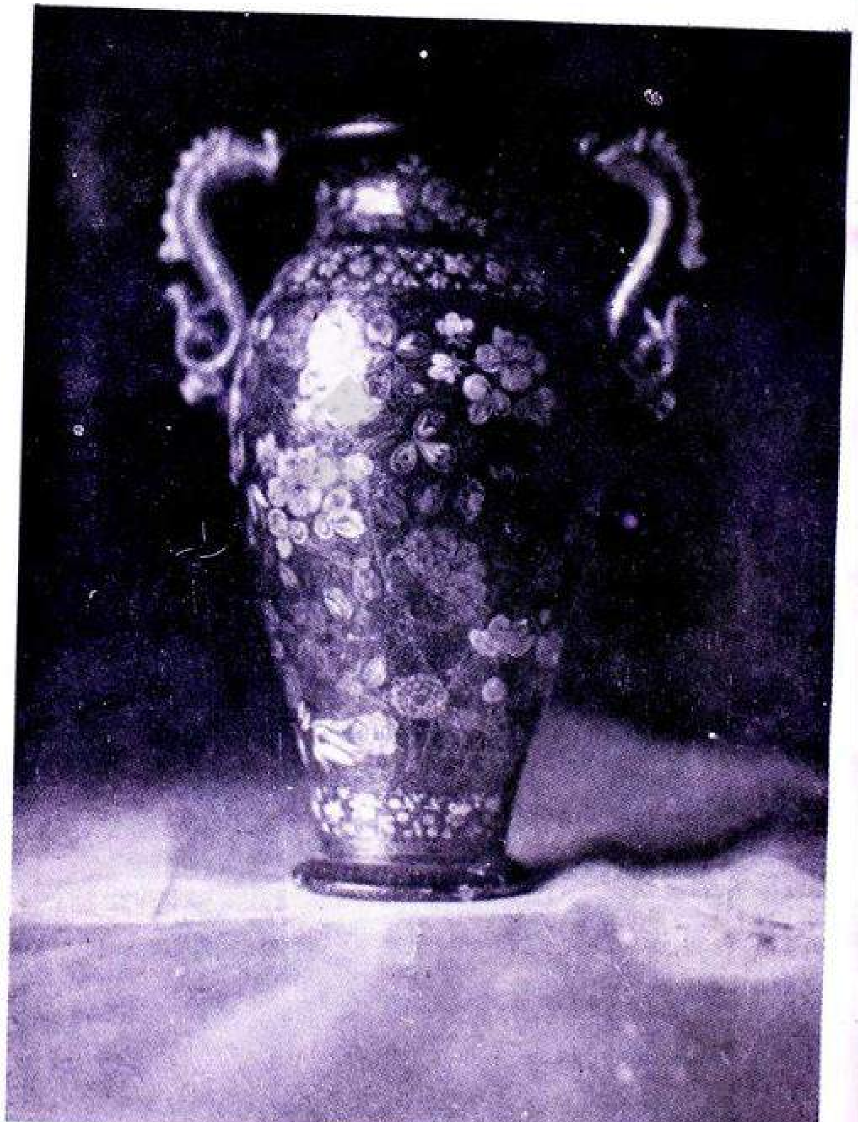
مورکرافٹ نے کشمیری کارِ قلمدانی کے نمونوں کو دِلّی دربار میں دیکھ کران کی بہت تعریف کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ نقش ونگار میں استعمال ہونے والے رنگ اور برش وغیرہ مقامی طور ہی بنائے جاتے ہیں البتہ کبھی کبھی دیگر جگہوں سے بھی منگوائے جاتے ہیں۔ پیپر ماشی جو نہایت محنت طلب اور نزاکت کا کام ہے اگرچہ شیعہ مسلمان ہی کرتے آئے ہیں لیکن تاریخ ایک مشہور کاری گر نرن موورت گر کا بھی پتہ دیتی ہے ۱۸۴۵ء میں ایک اور بلند مرتبہ نقاش سید تراب بھی ہوا کرتا تھا علی مغل اور عباس مغل میرے والد ماجد کے وقت نامور نقاش تھے ۔ خود میرے بچپن میں اکہ بانکہ نامی ایک قدآور نقاش پیپر ماشی کے ہنر میں نام کما چکا تھا ۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیپر ماشی جاننے والا طبقہ ایک اقلیتی طبقہ ہے اور اس نے عموماً اپنے ہی طبقہ کے آدمیوں کو یہ فن سکھایا جس سے کہ یہ محدود ہوکر رہ گیا ۔ کاری گروں کی کوتاہ اندیشی اور خود غرضی کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت آنند کول اپنی کتاب "Jammu & Kashmir State" میں لکھتے ہیں:

"کشمیر کے پیپر ماشی جاننے والے کاری گروں کی آمدنی اچھی ہے مگر وہ کل کے بارے میں سوچے بغیر اپنی کمائی (پونجی) کو ایک ساتھ خرچ کر بیٹھتے ہیں ۔ اکثر گھروں میں شام کو جلانے کی لکڑیاں بھی میسر نہیں ہوتیں ۔ وہ اپنے صحن کی پچر بندی سے چولھے کو جلاتے ہیں اور اگلے روز اپنی بنائی ہوئی چیزیں بیچ کر دوبارہ کھڑی کر دیتے ہیں" ۔

اسی کتاب میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

"کشمیری شال پیپر ماشی کے ڈبوں اور بکسوں میں رکھ کر فرانس بھیجے جاتے ہیں جو وہاں الگ سے بیچے جاتے ہیں" ۔



شرمندہ جن کے حسن سے ہوں بوستاں کے پھول

کر کے تیار کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بورے کے ساختہ کے مقابل گتہ کا ساختہ کمزور ہوتا ہے۔ اسلئے اس کے چند ہی ساختے بنتے ہیں البتہ بورے سے اسی فیصد چیزیں بنتی ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ چند کمزوریوں کے باوجود گتے کے ساختہ میں سہولت اور لاگت کی کمی کا فائدہ ہے۔ گتہ سب سے پہلے جاپان نے تیار کیا اور اس کے بعد دیگر ممالک میں بنایا جانے لگا۔ اس کی کئی موٹائیاں ہوتی ہیں اور موٹائیوں کی مناسبت ہی سے مختلف حصّوں (اعداد) میں استعمال کیا جاتا ہے۔

○ سریش (Glue): رنگوں میں مضبوطی کے علاوہ ساختوں کے جوڑنے میں استعمال ہوتا ہے۔ آج سے نصف صدی قبل نقاش سریش خود ہی تیار کرتے تھے۔ اس طرح کہ چوپایوں کی سریوں اور پالیوں کو پکا کر اس کا رس نکالتے تھے اور اسی کو گاڑھا بنا کر ٹکڑوں کی صورت میں سکھا کر رکھ دیا جاتا تھا۔ اور جب باہر سے سریش آنا شروع ہوا تو مقامی سریش ترک کر دیا گیا۔ اب تو Fevicol بھی بازار میں مہیا ہے لیکن وہ رنگوں میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ ہاں جوڑنے میں کارآمد ہے۔

○ ساختہ سامان: اس میں کئی چیزیں استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً:۔

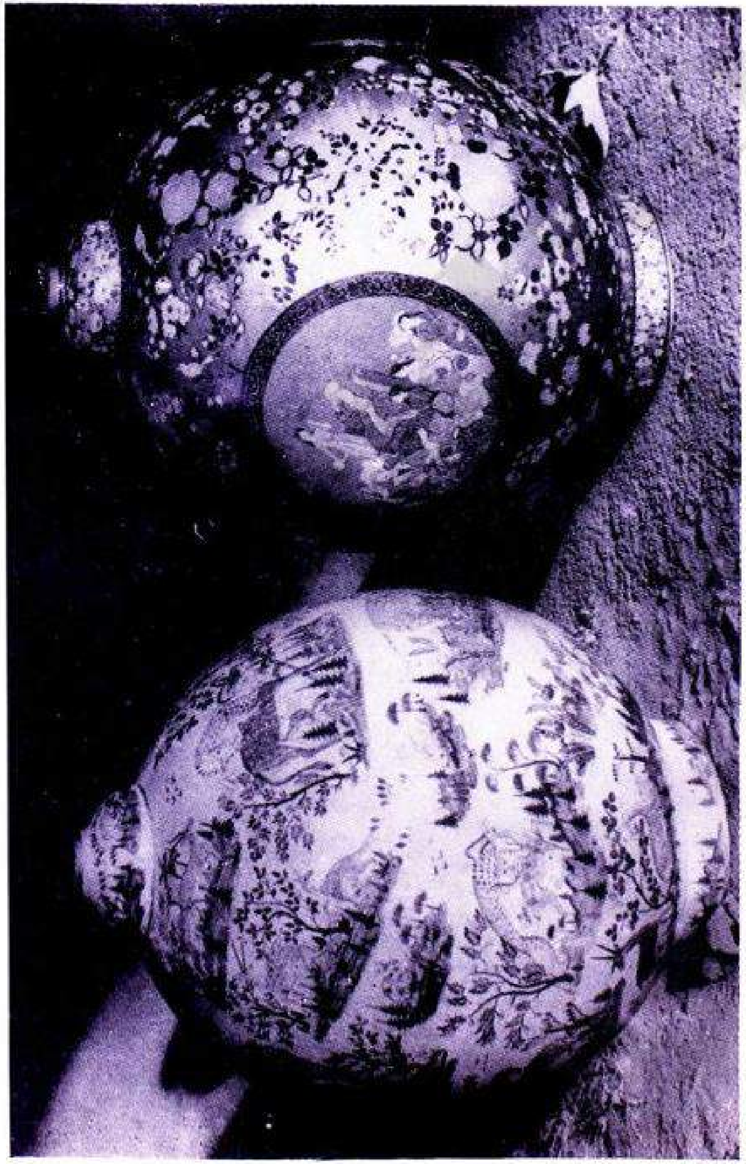
- قینچی ۔ گتہ کاٹنے میں بڑے سائز کی مقراض (Scissors) لازمی ہے۔
- ٹانکی ۔ اس کو chissel کہتے ہیں۔ اسے چھینی یا رکھالی بھی کہتے ہیں۔ یہ چپٹی ہوتی ہے اور سیدھ میں گتہ کاٹنے کے کام آتی ہے۔
- نالی دار کٹالی (Guage chissle) یہ نیم گول سرے والی چھینی ہوتی ہے۔ ہر چھینی لوہے کے عمدہ مسالہ کی بنی ہوتی ہے۔

مشہور انگریز مؤرخ برنیئر، جو اورنگ زیب کے ہمراہ کشمیر آیا تھا، یہاں سے اپنے دوست مالینوزشی مراطین کے نام اپنے خط میں یوں لکھتا ہے:

"خوبصورت چیز بنانے میں کشمیری کسی سے مات نہیں کھا سکتے۔ قلمدان، صندوقچے، چمچے، پالکیاں وغیرہ یہاں کی بنائی ہوئی چیزیں دیگر علاقوں کو تحفوں کے طور بھیجی جاتی ہیں جہاں ان کی بڑی قدر افزائی ہوتی ہے۔ ان میں اکثر چیزیں کوٹے ہوئے کاغذ سے بنائی جاتی ہیں۔"

کوٹے ہوئے کاغذ سے بنائی ہوئی چیزوں میں گاہکوں کی فرمائشوں سے وسعت آتی گئی اور اسی طرح ڈیزائن بنانے میں بھی تنوع پیدا ہوتا گیا۔ سلطانوں کی پسند، مغلوں کی پسند، ایرانی روایت، افغانوں کا شوق، سکھوں، ہندوؤں اور آخر میں انگریزوں کی فرمائشیں ان میں اضافے کرتی رہیں۔ یوں مختلف ڈیزائن مختلف ملکوں کی پسند کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ چیزوں کی بناوٹ اور اس کے انداز خاموشی سے اپنی تاریخ سازی کو دہراتے ہیں۔ مثلاً قلمدان، پھولدان، شمعدان، اگردان، عطر دان، کتاب دان، رحل، زیورات اور جیولری کے بکس، تمباکو ڈبے، شطرنج کے بکسے، اندرونی چھتوں کی تختیاں، پوڈر سیٹ، چوڑیوں کے بکس، رومال بکس، ٹائی بکس، ایش ٹرے (راکھ دانی)، تاش کے ڈبے، کھانے کی میزیں اور کرسیاں، ٹکٹ بکس، بسکٹ بکس، لیمپ سٹینڈ، رائٹنگ سیٹ، فنگر باول وغیرہ جیسی چیزوں میں لاسہ لپولو شکارگاہ، گل ولایت، شال طرح، چنار طرح، دربار جنگ اور خیام طرح خود اپنے وجود کے پس منظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ لداخ ستو کے برتن گئے، پنجاب اور جموں سلائی کیس اور چوڑیوں کے ڈبے۔ اسی طرح دیگر چیزوں کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پیپر میشی کے زمرے میں کس کس طرح کی چیزیں آتی ہیں اس کی مکمل فہرست ہم اگ



جو چھین لے دل وہ ہنر درست ہنرمند

سے دے رہے ہیں۔ طرحوں (ڈیزائینوں) کا شمار بھی علیحدہ کیا جا رہا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ پیپر میشی میں سجاوٹ اور کارآمد دونوں طرح کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ یعنی کچھ سچ مچ استعمال میں آتی ہیں اور اکثر فقط خوبصورتی بڑھاتے ہیں۔!

○ ساختہ بنانا۔ پہلے وقتوں میں بادشاہوں، راجوں، نوابوں اور امیروں وزیروں کی فرمائش کے مطابق پیپر میشی کا ساختہ اور اس کے ڈیزائن بنائے جاتے تھے۔ پہلے قالب پر کاغذ کے ورق چڑھائے جاتے تھے اور اس پر کوٹے ہوئے کاغذ (مالیدہ) کی پتلی پرت چڑھائی جاتی تھی۔ اس کے سوکھنے پر دوسری اور تیسری پرت چڑھائی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ پانچ سات پرتیں ہو جائیں اور بعد میں اسے تھاپی سے مطلوبہ موٹائی تک داب کر سکھانے کے بعد کاٹ کر اُتارا جاتا ہے۔

پیپر میشی کی چیزیں بہت طریقوں سے تیار کی جاتی ہیں لیکن بنیادی طریقہ یہی ہے کہ مطلوبہ چیز کی شکل کا ڈھانچہ بنایا جاتا ہے جسے Mould کہتے ہیں۔ یہ قالب بھی کہلاتا ہے۔ اسی قالب پر مالیدہ (Pulp) یا لُبرا منڈھ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آسانی کے لئے گتے کی چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ ہر دو صورت میں سانچہ ایک بنیادی جُز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب خالص لکڑی اور ہارڈ بورڈ کے سامان پر بھی نقاشی کی جاتی ہے جس کا ذکر ہم الگ سے کریں گے۔

سانچے تین قسم کے بنتے ہیں: (۱) لکڑی کے (۲) پختہ مٹی کے (۳) کچی مٹی کے۔ لکڑی کے سانچے دو قسم کے کاریگر بناتے ہیں۔ خرادی اور بڑھئی۔ پختہ مٹی کے سانچے کمہار تیار کرتے ہیں اور کچی مٹی کے سانچے ساختہ ساز اپنی مجبوری کے سبب خود ہی بناتے ہیں۔ ہر قالب ناپ تول اور عرض اور شکل متعین

نیم خشک ہونے پر اس بٹے سے اس کی سطحوں کو دبایا جاتا ہے اور اطراف درست کیے جاتے ہیں۔ یہ بٹہ تھاپی کا کام بھی دیتا ہے۔

- پرکار: یہ چھوٹے اور بڑے، دونوں سائزوں کا ہونا چاہیئے۔
- سکیل یا فٹہ: یہ ایک میٹر تک کی لمبائی کا ہونا چاہیئے۔
- ریگ مال جسے Sand Paper کہتے ہیں سطحوں کو ملائم اور ہموار کرنے کے کام آتا ہے۔
- پنسل: سخت اور نرم دونوں طرح کے کام آتے ہیں۔
- گنیا: یہ بھی ایک لازمی اوزار ہے جو ساختہ سازی میں اہم تصور کیا جاتا ہے۔

گتے اور کاغذ کے بُرادے کے ڈبے اور ساختے ایک مخصوص سائز تک ہی تیار کیے جاسکتے ہیں اور وقت صرف انہی کے پیچھے پیچھے چلنے پر رضامند نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ساختوں کی تیاری میں مختلف خام مواد استعمال ہونے لگا اور اس کی شکلیں بھی ضرورتوں کی طرح بدلنے لگیں۔ بڑی ٹرے، فریم، لمبے نکاٹی بکس، میزیں، اسٹول، کافی ٹیبل سیٹ اور سکرین (Screen) کا تصور پیپر ماشی میں عملی طور پر داخل ہوا تو اس میں ایسی لکڑی استعمال کی جانے لگی جو اینٹھ نہ جاتی ہو۔ اس لکڑی کے جوڑوں اور سطحوں پر مہین کپڑا منڈھ دیا جاتا ہے تاکہ کام ہونے کے بعد کہیں سے شگاف نہ ہونے پائے۔ اب سطح اور پتلی اشیاء یا میزوں کے Top ہارڈبورڈ کے استعمال ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے Panel اور فریم بھی اسی کے بنتے ہیں۔ کئی ساختوں میں لکڑی اور ہارڈبورڈ دونوں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ چینی مٹی کے، Sheet Metal کے، شیشے کے یا پیتل کے ساختے بھی لوہے والے ساختوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ چائے کے ڈبوں، بسکٹ کے بکسوں، سلائیوں کے نلکوں، صراحیوں اور حقوں میں اندر سے استر کے طور استعمال

ہوتے ہیں کیوں کہ ان میں نمی اور پانی سے نقاشی کی ہوئی سطحوں کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیئے۔

اب کچھ اور چیزیں جو پیپر ماشی کی اشیاء بنانے کے دوران کام میں لائی جاتی ہیں کا ذکر کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا مثلاً

○ **سل بٹّا** — پتھر کا چوڑا سا صاف تختہ اور بٹّہ۔ اس پر رنگ مصالحہ پیسنے کا پتھر ہوتا ہے جسے کشمیری میں کٹّن کہتے ہیں۔ یہ آٹھ نو انچ لمبا ایک پتھر ہوتا ہے اور بٹّے سے ذرا مختلف ——— اس کی ایک سطح ہموار ہوتی ہے تاکہ مصالحہ کو رگڑ سے مہین کیا جاسکے۔ "کاج وٹھ" بھی اسے ہی کہتے ہیں۔ کاج یا کاچ یعنی کانچ کی بدلی ہوئی صورت ہے مطلب شیشہ کے ہیں اگلے وقتوں میں یہاں کے شیشہ گری محلہ میں شیشہ بنایا جاتا تھا اور بعد میں کام میں لایا جاتا تھا۔ پیسنے والے پتھر کو وہ "کاجہ وٹھ" کہتے تھے۔ اسی طرح کاجگری محلہ کے لوگ کانچ کی چوڑیاں "کاچہ ونگر" بناتے تھے۔ کاجہ وٹھ سبز رنگ اور سخت قسم کے پتھر کی کانوں سے (ایک طرف قدرتی طور مسطح) دیکھ کر نکالتے تھے۔ پیپر ماشی کے ساختہ پر گچ کی لپائی کے لئے گچ کے ٹکڑوں کو اسی سل پر بٹے سے پیستے ہیں اور رنگ بھی۔

○ **گچ** — اس کو انگریزی میں پلاسٹر کہتے ہیں۔ دراصل ایک قسم کا چونا ہوتا ہے جس کو کیگل کی طرح دیواروں پر لگاتے ہیں۔ کافی مدت کے بعد اس کو دیواروں سے اکھاڑتے ہیں۔ اس میں چونے میں پایا جانے والا گیس نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں اس کو اکھاڑتے وقت سرخی بھی ملی ہوتی ہے۔ مہرکن (مہریں بنانے والے) اور دنداں سازوں کے قالبوں کو بھی گچ کے طور استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے صاف کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ یہ گچ سل پر پانی ملاکر

پیسا جاتا ہے ۔ کبھی خشخاش کے دانوں جتنا باریک کیا جاتا ہے اور کبھی اس سے موٹا بھی رکھا جاتا ہے ۔ رنگ کو پانی اور سریش ملا کر لیا جاتا ہے پھر دیگ میں اس کو گرم کیا جاتا ہے اور بعد میں مایہ کی صورت میں لیا جاتا ہے خشک ہونے پر پتھر سے ساختہ کی سطح کو ایک اور پتھر سے جس کو کرکٹ کہا جاتا ہے گھسا جاتا ہے تاکہ سطح ہموار ہو ۔ رنگ گھوڑوں کی گردن کے لیے بالوں سے بنائے گئے برش سے لیا جاتا ہے ۔ اب برش بنے بنائے بھی بازار میں ملتے ہیں ۔

○ حریرہ ۔ یہ دراصل پتلے کاغذ یا ریشم کو کہتے ہیں ۔ انگریزی میں حریرہ کو Tissue Paper کہتے ہیں ۔ اگرچہ اس کے کئی رنگ ہوتے ہیں لیکن پیپر میشی میں سفید قسم کا حریرہ ہی استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس کا مایہ دار ہونا ضروری ہے ۔ رنگ کی گھسائی کے بعد اس میں کچھ شگاف اور درز ہو جاتے ہیں جن کو ڈھانپنے کی خاطر حریرہ لگایا جاتا ہے ۔ یہ حریرہ سریش کے پتلے مایہ سے چپکا دیتے ہیں ۔ عدو پر سریش کی لپائی نرم کپڑے کے ٹکڑے یا روئی سے کی جاتی ہے ۔ حریرہ چپکانے میں بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے کہ ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے پر نہ چپکے ۔ اس طرح سطح دوبارہ کھُردری ہونے کا احتمال ہوتا ہے ۔ پھر بھی اگر کچھ شکنیں رہ جائیں تو ان کو ریگ مال مل دینے سے دُور کیا جاتا ہے ۔ عدوں کے اندرونی حصّوں میں حریرہ کا استعمال نہیں ہوتا ۔ حریرہ لگانے کے بعد عدو رنگ کی لپائی کے لئے تیار ہو جاتا ہے ۔

○ رنگ ۔ رنگوں سے انسان قدرتی طور محظوظ ہوتا ہے کیوں کہ قدرت کے کرشموں کا دلچسپ اظہار رنگوں ہی سے ہوتا ہے ۔ ان سے دلچسپی اور کشش پیدا ہوتی ہے ۔ قدرتی اشمار اور اشجار کی ہو بہو نقل کرنے میں اسی طرح کے رنگوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ابھی تک تین قسم کے رنگ تین ذرائع سے حاصل کئے جاتے ہیں ۔ رنگوں کی پہلی قسم Pigment Colour (جماداتی رنگ) ہے ۔ یہ قدرتی معدنوں سے حاصل ہونے کے علاوہ مختلف دھاتوں مثلاً سیسے، جست، تانبے قلعی، چاندی اور سونے وغیرہ سے کشتے بنا کر تیار کئے جاتے ہیں جبکہ قدرتی کانوں سے بھی کشتہ شدہ (oxidised) ہی ملتے ہیں ۔ ان میں کچھ رنگ مٹی جیسے ہوتے ہیں جو زمین کی اوپری تہوں سے ہی فراہم ہوتے ہیں اور کچھ زمین کے اندر مدفون دھاتوں کی کانوں سے ملتے ہیں چنانچہ جب ان کے انگریزی نام گنوائے جاتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کن دھاتوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان دھاتوں میں سے اکثر سیسہ (Lead) جیسی دھات سے منسوب ہیں مثلاً وائٹ لیڈ، بلیک لیڈ، ریڈ لیڈ، بلیو لیڈ ۔ اسی طرح مٹی والے رنگوں کا بھی ایک گروپ ہے جو اوکرس (ochurs) نام سے منسوب ہے، جیسے بلیک اوکر (اوکر = مٹی) یلّو اوکر، گولڈن اوکر، ریڈ اوکر، رومن اوکر، کروم اوکر وغیرہ ۔ اسی طرح کچھ رنگ عنبر نام سے مشہور ہیں جیسے راعنبر، برنٹ عنبر وغیرہ ۔ عنبر (umber) بھی مٹی ہی ہوتا ہے ۔ ایسے رنگ تمام کے تمام سطحوں کی لپائی یا پھیکی رنگ آمیزی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ۔ رنگوں کی دوسری قسم نباتاتی (vegetable) ہے ۔ یہ قسم پھلوں، پھولوں اور درختوں سے حاصل کی جاتی ہے ۔ ایسے رنگ لیکس (Lacks) کے نام سے منسوب ہیں جیسے کرمزن لیک، یلّو لیک، ریڈ لیک، میڈر لیک، اسکارلٹ لیک، پرپل لیک، بلیو لیک وغیرہ ۔ یہ دوسرے گروپ کے رنگ پیپر میشی میں گل بوٹے کرنے میں پرداز کے کام آتے ہیں ۔ رنگوں کی تیسری قسم وہ ہے جو سائنسی طور طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے ۔ یہ رنگ خاص طور پر اونی اور شوتی کپڑوں کی رنگائی میں استعمال ہوتے ہیں ۔ یہ رنگ گھٹیا قسم کی نقاشی میں استعمال ہوتے ہیں جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اڑ جاتے ہیں اور اس طرح

نقاشی پھیکی پڑ کر بدزیب ہو جاتی ہے کیوں کہ نقش و نگار میں وضاحت ماند پڑ جاتی ہے۔ عمدہ نقاشی میں تسلیم شدہ نقاش اور استاد ان رنگوں کو کام میں نہیں لاتے۔ جمادانی رنگ روشنی یا تاریکی کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ روشن ترین رنگ سفید مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد زرد رنگ دوسرے درجہ پر مانا جاتا ہے۔ اسی طرح تاریک ترین رنگ سیاہ مانا جاتا ہے۔ اور نیلا دوسرے درجہ پر تاریک سمجھا جاتا ہے۔ طبعی طور ان رنگوں کو گرم اور سرد گروپوں میں بانٹا گیا ہے۔ گرم رنگوں میں سرخ نمبر ایک ہے۔ دوسرے درجہ پر زرد رنگ ہے۔ تیسرے درجہ پر ان دونوں کی ملاوٹ سے تیار کیا ہوا رنگ قرار دیا جاتا ہے۔ سرد اور گرم رنگوں سے علاج بھی کیا جاتا ہے۔ یعنی گرم مزاج اور جنونی کو سرخ رنگ والے کمرے میں نہیں رکھا جاتا۔ اندھے اور جنونی کو سیاہ رنگ والے کمرے میں رکھا جاتا ہے۔ تاثرات کے لحاظ سے بھی رنگوں کے علیحدہ گروپ میں سفید رنگ امن اور سلامتی کی نشانی خیال کیا جاتا ہے۔ سرخ رنگ ہنگامہ، جنگ اور انقلاب کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ سبز رنگ خوش حالی کے لئے اور سیاہ رنگ ماتم کے اظہار کے طور استعمال ہوتا ہے۔

چیزوں کی تیاری کے وقت مختلف خیال و مذاق رکھنے والوں کے مطابق زمین کے رنگ کے علاوہ نقش پر رنگ آمیزی کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ خوش فہم اور دور اندیش گہرا سرخ، محبت اور خدمت شعار گلابی، دانشور اور ہنرمند نیلا، تمکین مزاج ہلکا زرد، خود پسند نارنجی، متانت پسند اور غیر جانبدار سفید، رومانیت پسند نیلا، قوت فیصلہ کے دھنی گہرا نیلا، روایت پسند خاکی، خوش مزاج اور پُر امید لوگ سبز، ہمدردانہ جذبات والے زمردی اور بندگی اور عبادت گذار بنفشی رنگ کو پسند کرتے ہیں۔ اس طرح اپنی تجارت کو بڑھاوا دینے میں رنگ آمیزی کو بڑا

دخل ہے۔

رنگوں میں زہریلے اثرات بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے نوآموزوں کو ان سے بچنے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ استاد ان سے واقف ہوتے ہیں۔ غفلت شعاری سے صحت بگڑنے کا احتمال ہوتا ہے۔ جمادانی رنگ، جو پیپر میشی صنعت کی بنیاد ہیں، ہزاروں سال پہلے سے استعمال کئے جاتے تھے جن کا پتہ اجنتا کے غاروں سے ملتا ہے۔ یہ رنگ معدنی ہوتے ہیں اور مختلف طریقوں سے حاصل کئے جاتے ہیں کبھی کشمیر، لداخ اور سمرقند کی پہاڑیوں سے حاصل کر کے لائے جاتے تھے۔ آج کل یہ سائنسی طور طریقوں سے ہندوستان میں تیار ہوتے ہیں اور پیکٹوں اور لوتلوں میں دستیاب ہیں۔ نقلی رنگ وارنش سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مخصوص رنگ پھولوں کی برگ کشائی اور چہرہ کشائی میں استعمال ہوتے ہیں۔ خاص کر جب طلائی یا نقرئی ورقوں کی طرح استعمال ہوں۔ معدنی رنگوں کو چپٹی سل پر بٹّوں سے گھوٹ کر اور تھوڑا پانی ملا کر باریک کیا جاتا ہے اور برتنوں میں جمع رکھا جاتا ہے۔

فن نقاشی کے لحاظ سے ابتدائی یا بغیر ملاوٹ کے پانچ رنگ ہیں۔ سرخ زرد یا نیلا اور ان تین رنگوں کی ملاوٹ سے مزید تین رنگ سبز، ارغوانی، نارنجی ظاہر ہوتے ہیں۔ جب رنگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملاتے ہیں تو یہ دوسرے درجے کے رنگ کہلاتے ہیں اور ان کی تعداد دس بن جاتی ہے۔

- ابتدائی درجے کے رنگ:

(۱) قرمزی (۲) نیلا (۳) صاف زرد (۴) سفید (۵) سیاہ

- دوسرے درجے کے رنگ:

(۱) سرخ + زرد = نارنجی (۲) سرخ + نیلا = ارغوانی
(۳) زرد + نیلا = سبز (۴) زرد + سفید = کپاسی

(۵) سرخ + سفید = گلابی (۶) بلیو + سفید = ملائی شرکی، کیوری

(۷) سیاہ + سفید = سلیٹی (۸) سیاہ + سرخ = بھورا

(۹) سیاہ + زرد = پستئی (۱۰) سیاہ + نیلا = مشکی

اسی طرح تیسرے درجے کے رنگ تین یا چار رنگوں کی آمیزش یا ملاوٹ سے بنتے ہیں :۔

(۱) ارغوانی اور سبز ملانے سے زیتونی

(۲) سبز اور نارنجی ملانے سے ترنجی

(۳) نارنجی اور ارغوانی ملانے سے گندمی

(۴) گلابی اور زرد ملانے سے پیازی

(۵) گلابی اور نیلا ملانے سے بنفشی اور

(۶) سبز اور سیاہ ملانے سے اردی سبز رنگ بنتا ہے

○ رنگوں کی تیاری ۔ رنگوں میں بذاتِ خود ایسی قوت نہیں ہوتی کہ وہ کاغذ، دیوار، لکڑی یا پیپر میشی کی کسی چیز پر لگنے سے مضبوط بن جائیں بلکہ اس مضبوطی کے لئے ان کے ساتھ سریش ملایا جاتا ہے۔ ہر رنگ کے ایک پونڈ میں دو چھٹانک پانی میں حل کیا ہوا سریش ملایا جاتا ہے۔ رنگوں کو تیار کر کے باریک ململ سے گزار کر صاف کیا جاتا ہے ۔ رنگ کے دانے یا سریش کی گندگی اس طرح دور کی جاتی ہے۔ ہر رنگ کے لئے خواہ مفرد ہو یا مرکب ایک بڑا یا چھوٹا پیالہ ہوتا ہے۔ زمین کیلئے رنگ کونچی سے لیپا جاتا ہے۔ پھر موقلموں سے کام کر کے اسے پختہ بنانے کے لئے وارنش کی جاتی ہے جو اب ڈبوں میں تیار یا بنی بنائی بازار میں ملتی ہے ۔

○ موقلم اور برش (کونچی) ۔ برش اور موقلم جن سے پیپر میشی کا کام کیا جاتا ہے، مختلف قسم کے بالوں سے تیار کئے جاتے ہیں۔ رنگ کی لپائی زمین Back-ground

تیار کرنے اور وارنش کرنے کے لئے مختلف برش مہیا ہیں مثلاً گھوڑے کی دُم یا گردن کے بال اور بکروں کے بال والے برش۔ اس کے علاوہ پٹ سن سے بھی کونچیاں تیار کی جاتی ہیں۔ موقلم کے لئے بلی کی دُم کے بال یا گلہری کی دُم کے بال کام میں لائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اب ہر طرح کے برش اور موقلم بازار میں تیار ملتے ہیں لیکن کاری گر اکثر اپنے ہی ہاتھ کے بنائے ہوئے برش استعمال کرتے ہیں۔ موقلم آسمانی بطخوں کے پروں کو کاٹ کر ان کی نلیوں کے اندر سے گذار کر تیار کئے جاتے ہیں۔ کشمیری میں ان نلیوں کو پرگز کہتے ہیں جو اصل میں فارسی نام (پرقاض) ہے۔ پھر یہ موقلم پتلے سرے کی طرف سے حسبِ ضرورت کاٹا جاتا ہے یا کاٹے بغیر رہنے دیا جاتا ہے۔ آبی بطخوں کے پر بھی موقلم کے دستے کے طور کام میں لائے جاتے ہیں۔ پھولوں یا ڈیزائنوں کے استر اُلٹائیوں اور پرتازوں کے لئے بھی موقلم استعمال کئے جاتے ہیں۔ پھولوں، اُن کے حصّوں اور مختلف کاموں کے نام اصل میں فارسی سے جو اب بگڑ کر کشمیری میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً پرقاض کی طرح جو پرگز کہلاتے ہیں۔ اسی طرح کاہریزی "کہریزہ" یا لشہ کہلاتی ہے۔ کہربا کو "سیندرونز" کہتے ہیں۔ روغن کو وارنش یا جلاو اسی طرح پرتازوں کو "رکپھ" کہتے ہیں یا شیڈ۔

○ وارنش ۔ جلاؤ کو چمک کہتے ہیں۔ جب آبی رنگ (واٹر کلر) کا کام اختتام کو پہنچتا ہے تو اس پر جلاؤ چڑھایا جاتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک تو کام پختہ ہونا چاہیئے دوسرے چمک اُٹھنا چاہیئے۔ اگلے وقتوں میں السی کا تیل اور مائیہ اس کے لئے استعمال ہوتا تھا اور اسپرٹ میں سیندرونز کوٹ کر حل کیا جاتا تھا اور اسی کی لپائی ہوتی تھی۔ سیندرونز جو کہربا کہلاتا ہے بے رنگ یعنی شیشہ جیسا لاکھ ہوتا ہے ۔ اگرچہ اب تیار وارنش اعلیٰ سے

اعلیٰ درجہ کا مارکیٹ میں مہیا ہے اور کوچی کے ساتھ Apply کیا جا سکتا ہے لیکن سطح پر اس طرح کی لیپ ہمواری کی ضامن نہیں ہوتی۔ اس طرح وارنش شکنوں میں بٹ جاتی ہے۔ چنانچہ اس خامی سے بچنے کے لئے ایک ہی تدبیر ہے، وہ یہ کہ وارنش انگلیوں سے مل دی جاتی ہے۔ علاوہ بر اگر نقاشی کے بعد وارنش نہ ملی تو اس کی مثال مٹی کے ایک کچے برتن کی سی ہوتی ہے جو پانی دیکھتے ہی مسمار ہو جاتا ہے۔

○ طرح ۔ کسی ایک چیز پر جب سطح کے رنگ کی لپائی مکمل ہو جاتی ہے تو یہ فن پیپر میشی کی اصطلاح میں زمین کہلاتی ہے۔ اس زمین پر طرح کا خاکہ ڈالا جاتا ہے۔ طرح کی نوعیت کے مطابق عدد یا چیز کو "وسلہ" کہتے ہیں۔ جب وسلہ پر خاکہ کشی مکمل ہوتی ہے تو خاکہ کے مطابق رنگ آمیزی کی جاتی ہے۔ کیوں کہ پھولوں کے مطابق ان کو رنگوں میں تقسیم کرنا ہوتا ہے۔

پیپر میشی کا کام بہت سی طرحوں میں کیا جاتا ہے۔ ہر طرح (Design) ایک خاص ماحول اور تاریخ کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہم تک پہنچی ہے۔ کچھ مشہور اور متداول طرحیں اس طرح ہیں:۔

- گلِ ولایت ۔ اس میں گلاب، سیب کے شگوفے، رعنا، وربہ گوژ، سنبل کے پھول وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔
- گلِ اندر گل ۔ اس طرح میں مختلف پھولوں کے گچھے اور دستے بنائے جاتے ہیں۔ خصوصاً گلابوں کے۔
- ہزارہ ۔ ہزار قسم کے پھولوں کا ڈیزائن یعنی اس طرح میں بے شمار قسم کے پھول بنائے جاتے ہیں۔
- پُھلے ۔ (شگوفے)۔ سیب، بہی، شفتالو، خوبانی، ناشپاتی اور گلاس کے

شگوفے۔

- چنار ۔ اس میں چنار کے درخت یا اس کے پتوں کو مختلف انداز سے سجایا جاتا ہے۔ چنار کے پتے رنگوں، طلائی ورقوں یا چاندی کے ورقوں سے بنائے جاتے ہیں۔
- ڈل ۔ پانی، کنول، پتے، مچھلی، آبی گھاس اور رام چڑیا (King Fisher) کو اس میں دکھایا جاتا ہے۔
- پولو ۔ اس میں پولو (ایک مشہور کھیل) کھیلے جانے کا منظر دکھایا جاتا ہے۔
- شکارگاہ ۔ جنگل میں خیمہ زن ہو کر عموماً بادشاہ کا جانوروں کا شکار کھیلنا ۔ گھوڑوں پر، ہاتھیوں پر سوار ہو کر اپنے خدام کے ہمراہ نکلنا وغیرہ دکھایا جاتا ہے۔ جنگلی، وحشتناک درندوں کی عکاسی اور قابلِ دید درختوں کی نمائش کے علاوہ ندی نالوں اور پہاڑوں کی منظر کشی اس میں خوب کی جاتی ہے۔
- شال ۔ لمبے لمبے بادام اور محراب برابر برابر دوری اور فاصلے پر رکھ کر ایک دوسرے کے مقابل کر کے سجانا اور خالی جگہوں کو آب و زر کی یا رنگ کی گلکاری سے بھر دینا اس ورائٹی کی خصوصیت ہے۔
- دربار ۔ اس میں مغل بادشاہوں یا ایرانی شہنشاہوں کے درباروں کی تصویر کشی کے علاوہ راجوں نوابوں کی مجلسوں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ان درباروں سے متعلق یادگاری اشعار بھی زیبِ رقم کئے جاتے ہیں۔
- خیام ۔ عمر خیام کی رباعیوں میں بیان تخیل کی پیکر تراشی اور اس کے گرد خوبصورت انداز میں رباعیوں کی تحریر اس کا طرۂ امتیاز ہے۔
- لاسی ۔ اژدھا (Dragon) سانپ اور گلکار بنانا۔ اس کا منبع لہاسہ، تبت اور چین ہے۔

• جنگ ۔ شاہنامہ میں بیان شدہ پہلوانوں وغیرہ کی جنگ کے مناظر یا مہابھارت کی جھلکیاں، جس میں ایک بہادر کے ہاتھ سے دوسروں کے ہاتھ پیر یا سر کٹا ہوا اور تلوار ڈھال وغیرہ دکھائی جاتی ہے ۔

• تصویر ۔ کسی طرح کی بھی تصویریں بنانے اور تصویریں بنا کر ان کے حاشیے پھولکاری سے مزین کرنا اس ٹائپ میں شامل ہے ۔

اسی طرح دوسری طرحیں یوں ہیں :-

سوسن طرح ۔ گوزر گونڈر ۔ حاشیہ دار ۔ دُکھ دار (کم اور زیادہ بھراؤ والے گلبن) ۔ بغل دار ۔ انگیری ۔ رنگ بستہ ۔ نرگسی ۔ گل آفتاب ۔ چین ۔ جانور طرح (آسمانی، آبی اور جنگلی) ۔ شجر دار ۔ اُبھار طرح ۔ سبز پوش ۔ شِرکہ پوش ۔ سیند پوش ۔ رد پہ پوش (نقرئی گلکاری) ۔ سونہ پوش (طلائی گلکاری) ۔ یہ ساری طرحیں رنگوں سے بنائی جاتی ہیں ۔ البتہ زمین کہیں کہیں طلائی اور نقرہ کے اوراق سے تیار کی جاتی ہے ۔ یہ اوراق ایک خاص مرکب جس کو دور کہتے ہیں، پر منڈھ دئے جاتے ہیں ۔

اور اب کچھ چیزوں کے اقسام کے بارے میں ۔ پیپر میشی جو قلمدان[٭] سے شروع ہوئی اب سینکڑوں چیزوں کی شکلوں میں بٹ گئی ہے ۔ اس کی مروجہ اشیا مندرجہ ذیل ہیں :

• فنگر بول اور اس کا سیٹ (سیٹ سات برتنوں کا ہوتا ہے ۔ چھ برتن چار انچ قطر کے اور ایک بارہ انچ قطر کا ۔ گہرائی ان کی ڈھائی انچ یا دو انچ ہوتی ہے ۔ ٹوبرہ ۔ ٹوبہ اور کینٹر (سٹینڈ دار کھانے کا جیسا برتن) مختلف شکلوں اور سائزوں میں]

٭ سری نگر میں نیر گر پورہ ۔ کشیر گر پورہ کا نگرپورہ کی طرح ایک محلہ قلمدان پورہ کے نام سے ابھی تک مشہور ہے جہاں کبھی فقط قلمدان بنائے جاتے تھے ۔

• رائیٹنگ سیٹ ۔ اس میں فائل کور یعنی جلد، بلاٹنگ ہولڈر، ٹکٹ بکس، کاغذ کاٹنے کی چھری اور پن ٹرے وغیرہ ہوتے ہیں ۔

• سٹینڈرڈ لیمپ سٹینڈ ۔ (پانچ فٹ، تین فٹ اور ڈیڑھ فٹ کی لمبائی کے چار انچ موٹے بند دار اور صُراحی نما ہوتے ہیں جو خراد پر تیار کئے جاتے ہیں ۔ یہ ایک لکڑی کی نگن میں چوڑیاں کس کر استادہ رکھے جاتے ہیں ۔ یہ چار تین اور دو حصوں میں Fold ہوتے ہیں ۔ ان کی شکل نکولی اور چوڑی دار بھی ہوتی ہے ۔

• شمع دان ۔ اگربتی دان ۔ بنگل بکس (چوڑی دان یا چوڑیاں رکھنے کا ڈبہ)

• پوڈر بکس (مختلف سائزوں اور شکلوں میں یعنی گول، پہلودار وغیرہ)

• پوڈر سیٹ ۔ (اس میں ایک پلیٹ پر پوڈر بکس، سیندور کی ڈبیہ اور صابن کی ڈبیہ یا بندیا کی ڈبیہ ہوتی ہے) ۔

• جیول بکس ۔ اس بکس میں گہنے اور موتی وغیرہ رکھے جاتے ہیں ۔ مخمل لگے مختلف خانوں سے یہ بکس اندر سے سجایا گیا ہوتا ہے ۔

• شیونگ بکس • سگریٹ بکس اور سگریٹ سیٹ (سیٹ میں ٹرے سگریٹ ڈبہ ایش ٹرے اور ماچس کیس یا لائٹر سٹینڈ شامل ہیں) ۔

• کارڈ بکس • پنسل بکس • پھولدان (میز پر رکھنے کے لئے یا دیواروں پر لگانے کے لئے) ۔

• دیواروں پر لگانے کے لئے بجلی کے اسٹینڈ (جن پر شیڈ ہوتے ہیں) ۔

• دیوار پر لگانے کے لئے پلیٹیں (Wall Plaques)

• Sheild سپر ۔ Panels ۔ جن پر قدیم اور پُراسرار تواریخی واقعات یا افسانوں کی عکاسی کی گئی ہوتی ہے ۔

- سلائی کیس اور سوئی بکس
- مختلف ڈیزائنوں کے پیپر ویٹ (مثلاً سیب ناشپاتی یا دوسری طرح کے)
- لفافہ دان۔ قلمدان Pen and brush holder (کلرکوں اور آرٹسٹوں کے قلموں اور برشوں کے رکھنے کے لئے)۔
- عطردان۔ لیمپ اسٹک اسٹینڈ • رومال بکس — Napkin Ring
- نیک ٹائی بکس (مختلف سائزوں کے مجموعے)۔
- چائے کے ڈبے • Tissue Box ڈبے
- کمربند کے کانٹے • ٹاپس • Dinner Table Set
- Glass mats (آٹھ، بارہ، بیس اور پچیس کی تعداد میں اس کا ایک ایک سیٹ ہوتا ہے) • پھولدان
- کھڑکیوں اور دروازوں کے Plaques' اندرونی چھتوں کی سجاوٹ کے لئے لٹکانے کی خاطر انڈے، ناشپاتی، سیب وغیرہ
- ویسٹ پیپر بکس (ردی دان) • پائپ اسٹینڈ • حقے • طشت
- آفتابے • گلاس اور پیالے وغیرہ

پیپر میشی کا کام دیکھ کر حساس ناظر فرطِ مسرت سے جھوم اٹھتا ہے اور بے ساختہ نرم و نازک اور حسین و جمیل کاری گری کے لئے داد دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آدمی پھول کاٹ کر اس کی خوشبو سے محظوظ رہا ہے۔ بلبلیں دیکھنے والے کی طرف یوں دیکھتی ہیں کہ کہیں وہ چونچ نہ ماریں۔ نہیں تو پھدک کر اڑ نہ جائیں۔ ہاتھ سے بنائے ہوئے پھول قدرتی پھولوں سے اس قدر مشابہ ہوتے ہیں کہ بن بو کے مشامِ جاں سرشار ہو جاتی ہے۔

استادانِ فن نے آج سے سیکڑوں برس قبل خانقاہ معلی 'مدین صاحب' اور حسن آباد کے امام باڑے کو اپنی محبتوں سے نوازا ہے۔ اس کے علاوہ روزگار کے لئے شیر گڑھی (پیٹھان پلیس) اور عجائب گھر کو سجایا ہے۔ موٹے کام کے نمونے شالامار باغ کی بارہ دریوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب کچھ اُن جگہوں یا کارخانوں کے بارے میں جہاں پر پیپر میشی کے کاریگر اپنے خونِ جگر سے اس فن کی آبیاری کرتے رہے ہیں۔

اگلے وقتوں میں کارخانوں کا کوئی منظم وجود نہیں تھا۔ استاد گھروں میں رہ کر اپنے بچوں کو حسبِ قاعدہ اپنا کام سکھاتے تھے۔ اگر کسی شاگرد کی ضرورت بھی ہوتی تو وہ بھی اپنے ہی رشتہ داروں میں سے لیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اس کام میں ماہر ہو کر اپنے گھر کارخانہ کھول لیتا۔

کارخانوں کے مراکز سری نگر میں بالعموم حسن آباد، مدین صاحب، زڈی بل اور کمنگر پورہ میں آج تک چلتے آئے ہیں۔ البتہ خاص طور پر ۱۹۷۵ء کے بعد یہ کام موروثی نہیں رہا۔ کیوں کہ دستکاروں کی ایک ڈائرکٹری قائم کی گئی جس کے ذریعہ مختلف علاقوں میں کئی تربیتی مراکز قائم کئے گئے۔ ہر مرکز میں ایک استاد کاری گر متعین کیا گیا۔ اسے معقول تنخواہ دی گئی۔ ہر استاد کے ساتھ ایک مددگار رکھا گیا۔ ہر وہ لڑکا یا لڑکی جو اس مرکز میں یہ ہنر سیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے اسے وظیفہ دیا جاتا ہے۔ گویا حکومت نے اس کی ترقی کی طرف اور اس کا پھیلاؤ کرنے میں کافی کام انجام دیا ہے۔ تربیتی کورس مکمل کرنے کے بعد امداد باہمی کی انجمنیں انہی نونہالوں نے قائم کی ہیں۔ ان انجمنوں کا مال گورنمنٹ امپوریم خریدتا ہے۔ گویا پیپر میشی جو ایک خاص حلقے میں محدود تھی، اس سے نکل کر دور دور تک اپنے نشان ڈالتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جن اساتذہ فن کو قومی ایوارڈ ملا انہوں نے اپنے کارخانوں میں منی سکول آف ڈیزائن قائم کر کے اس ہنر میں چار چاند لگائے جس

کی ایک مثال گوالسی یار محل کے منشی صاحب کا کارخانہ ہے۔ منشی غلام محمد اس ہنر میں نئی جہتوں کی تلاش کا کام بھی کرتے ہیں اور بیسیوں طرحوں پر عبور رکھتے ہیں۔

ایس پی ہائر سیکنڈری سکول کے ایک سابقہ ڈرائنگ ماسٹر خواجہ غلام محی الدین نے پیپر میشی کے فن پر بڑی عرق ریزی سے ایک کتاب تحریر کی تھی جو تشنۂ طباعت رہ کر شاید ضائع ہو گئی۔ پیپر میشی پر یو پی اکاڈمی کی طرف سے آج سے چند برس قبل ایک اور آرٹ انسٹرکٹر جناب سید مرتضےٰ رضوی کی لکھی ہوئی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو ہماری اکادمی سے نہیں ہو سکا۔ Improved فارم میں میں خود اس فن پر ایک کتاب تحریر کر رہا ہوں جس کے شائع کرنے میں زرِ کثیر کی ضرورت ہوگی۔

پہلے پہلے پیپر میشی راجوں، نوابوں اور امیروں کے لئے ہوتی تھی۔ وہی اس کو خریدتے تھے۔ اس کے بعد اس سامان کی دکانیں کھولی گئیں جہاں سے سیاح لوگ خرید کر اپنے اپنے ملکوں کو مال لے جاتے تھے۔ سردیوں میں کاریگر لاہور اور دیگر جگہوں کو چلے جاتے تھے۔ جہاں وہ یا تو اپنے ہنر فروخت کرتے تھے یا کسی محل یا حویلی میں کام کرتے تھے۔ ہندوستان سے یورپی ممالک کے لوگ یہ مال خریدتے تھے۔ انگلینڈ، اٹلی اور خصوصاً فرانس والے پیپر میشی سے بہت پیار کرتے ہیں۔

ان دنوں پیپر میشی صنعت میں دو کروڑ روپے سے زائد کا زرِ مبادلہ سالانہ کمایا جاتا ہے۔ باہر کے ملکوں میں اس کی مانگ برابر جاری ہے۔ حکومت نے ملک میں اور باہر کے ملکوں میں ایمپوریم کھولے ہوئے ہیں جہاں دیگر دستکاریوں کے ساتھ ساتھ پیپر میشی کا مال بھی بیچا جاتا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بھی مختلف ملکوں میں پیپر میشی کی دکانیں کھولی گئی ہیں جس کے نتیجے میں اس بات کا امکان بڑھ گیا ہے کہ عرب ممالک اپنے سب سے قیمتی ہوٹلوں میں پیپر میشی کا کام کراتے ہیں جہاں ایک ایک کمرے کی نقاشی پر لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔

میری نظر میں پیپر میشی کا مستقبل بے حد روشن ہے لیکن اس کی تیز رفتار ترقی میں کچھ مخصوص رکاوٹیں آتی ہیں۔ ساختہ سازی میں خراد اور لکڑی کے عدم، خام مال مہیا نہ ہونے کے سبب یا بہت زیادہ داموں ملنے کی وجہ سے اس کی تیاری اور لاگت میں بے حد اضافہ ہوتا ہے۔ حکومت اس کی طرف دھیان نہیں دیتی۔ ساختہ ساز بڑی مشکل میں گھرے ہوئے ہیں۔

کوئی بھی ایکسپورٹر جب باہر کے ملکوں سے کثیر تعداد میں آرڈر لاتا ہے۔ تو یہاں وہ مال مطلوبہ نمونہ اور مطلوبہ وقت میں تیار نہیں ہو پاتا یا کاری گر اس کی تیاری میں cooperation نہیں کرتے جس سے اس صنعت کی صحت اور تیز گامی پر بے حد برا اثر پڑتا ہے۔ اس بات کی ذمہ داری سرکار پر بھی نہیں آرڈر دینے والوں اور کاری گروں وغیرہ پر ڈالی جا سکتی ہے سرکار پر اسلئے کہ جہاں وہ غیر پیداواری مدّوں پر سبسڈی خرچ کرتی ہے یا امدادی رقوم فراہم کرتی ہے وہاں اگر اس آبائی صنعت پر بھی کچھ رقم ہی خرچ کرتی تو یہ صنعت کہیں سے کہیں جا نکلتی۔ ٥

بشر بشیر

دھان ۔ بوائی اور اقسام

"ہاکھ بتہ" (ساگ اور چاول) کشمیری کی روزمرہ بول چال میں شاید سب سے زیادہ استعمال کیا جانے والا محاورہ ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زراعت اور "بُتہ" بمعنی پکے چاول تقریباً ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، جس کی وجہ یہی ہے کہ چاول کشمیریوں کی من بھاتی غذا ہے ۔ کشمیر کی اراضی کے بیشتر حصہ پر چاول کی ہی کاشت ہوتی ہے ۔

عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو دنیا کے تمام تر گرمائی ممالک میں دھان زندگی کی بقا کا ایک اہم ذریعہ ہے اور اقتصادی و سماجی لحاظ سے اہم موجودات پر غالب حیثیت رکھتا ہے ۔ چنانچہ عالمی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ چاول کو خوراک کا ایک لازمی حصہ تصور کرتا ہے ۔ دنیا کے کئی گنجان آبادی والے ممالک مثلاً چین، ہندوستان، جاپان اور جاوا میں لوگ چاول کو بکثرت بطور خوراک استعمال میں لاتے ہیں اور اُن کی سب سے اہم زرعی پیداوار یہی ہے ۔ تاریخی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اس بات کے متعلق اگرچہ قطعی طور کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا

ہے کہ دھان کی کاشت کب سے شروع ہوئی ہے، لیکن اتنا کچھ ضرور کہا جاتا ہے کہ دھان کا اصل وطن جنوب مشرقی ایشیا ہے ۔ رفتہ رفتہ یہ دنیا کے تمام تر گرمائی خطہ میں پھیلا اور دھان کی باقاعدہ بوائی چین میں شروع ہوتی ہے ۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق وہاں دھان کی بوائی آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے شروع ہوئی ۔ دھان کی کاشت اور خوراکی اعتبار سے اس کی اہمیت کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ وہاں دھان کی بوائی سے لے کر فصل کے تیار ہونے اور اسکی کٹائی تک کئی تقریبات نے سماج میں جگہ پائی ہے اور اس فصل کی کاشت مختلف مراحل سے منسوب ہے ۔ چاول اور خوراک کا ایک ہی معنی میں استعمال ہونا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ کئی خطوں میں، جن میں کشمیر بھی شامل ہے، دھان کی کاشت تب شروع ہوئی جب زبان اپنے ارتقائی سفر میں ابتدائی مدارج طے کر رہی تھی۔ ہندوستان میں دھان کی کاشت کی تاریخ عام طور سے یونانیوں کے زمانے سے شروع ہوئی ہے ۔ یورپ میں ۱۴۶۸ء میں اٹلی میں پہلی بار دھان کی کاشت کی گئی اور امریکہ میں جنوبی کارولینا میں ۱۶۹۴ء میں دھان کی پہلی بوائی ہوئی جس کے لئے بیج مڈغاسکر سے لائے گئے تھے ۔ کشمیر میں دھان کی کاشت اور اسے بطور خوراک استعمال کرنے کی بھی طویل تاریخ ہے ۔ پُرانوں میں بھی اس سلسلے میں واضح حوالے ملتے ہیں ۔ "نیل مت پران" میں کئی ابیات میں دھان کا ذکر آیا ہے چنانچہ اس ضمن میں ڈاکٹر وید کماری گھئی نے بھی "نیل مت پران" کے ابیات نمبر ۱۳۵ — ۳۲۴ ـ ۵۳۵ ـ ۷۳۲ ـ ۷۴۳ ـ ۷۵۴ ـ ۷۸۱ (جلد اول ۔ صفحہ ۱۲۰) کی نشاندہی کی ہے ۔ شالی یا دھان کو کوٹ کر زیادہ تر بطور خوراک استعمال میں لایا جاتا ہے ۔ تاہم اس میں پروٹین کی کمی کے باعث ایک مستقل خوراک کے استعمال کرنے والوں کو دیگر ایسی خوراکی اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے جن میں پروٹین پائے جاتے

ہوں۔ چنانچہ ایشیا کے لاکھوں لوگ زیادہ تر دال اور چاول کو غذا کے طور استعمال کرتے ہیں۔ کم طاقت ہونے کے باوجود بھی دن بہ دن لوگ چاولوں کو بطور خوراک اپنانے جا رہے ہیں اور پسند بھی کرتے ہیں۔ چاول کا چھلکا عام طور پر چارے کے طور مویشیوں کو کھلایا جاتا ہے اور علاوہ ازیں صنعتوں کی چند مصنوعات میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چند گرم ممالک میں دھان سے کچھ منشیات بھی تیار کی جاتی ہیں۔

عام طور سے کسی بھی خطۂ زمین پر سالانہ ایک بار دھان کی کاشت ہوتی ہے گرم و تر آب و ہوا اس کی کاشت کے لئے موزون ہے اور زمین کی نمی اس کے لئے بے حد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دھان کی کاشت و بُوائی کے عمل کے دوران کھیتوں کو پانی سے بھرا رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ دھان کی ایک قسم سینچائی کے بغیر بھی کاشت کی جاتی ہے لیکن اس کی زیادہ اہمیت نہیں۔ یہاں پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ وسطی اور جنوبی امریکہ میں صرف اسی قسم کے دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ نشیبی علاقوں میں وقفہ وقفہ بعد اس زمین کی سینچائی کی جاتی ہے جس پر اس کی کاشت کی جاتی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ دھان کی زیادہ تر کاشت اُسی زمین پر ہوتی ہے جس کے لئے سینچائی کا خاطر خواہ اور مناسب انتظام ہو۔

ہماری ریاست میں بھی دھان کی کاشت صرف اسی اراضی پر ہوتی ہے جس کی سینچائی کے لئے وافر مقدار میں پانی دستیاب ہوتا ہے۔ بہار کا موسم شروع ہوتے ہی یعنی مارچ کے آخری ہفتے اور اوائل اپریل میں زمین کو جوتا جاتا ہے۔ اگرچہ زراعت کے اس شعبے میں ابھی تک کوئی نمایاں تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوئی ہے اور اس کی کاشت کے لئے روائتی طور طریقوں کو ہی اپنایا جاتا ہے تاہم اعلیٰ قسم کے بیج اور جراثیم کش اَدویات وغیرہ کے استعمال سے دھان

کی پیداوار میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ زمین کو جوتنے میں جو ہل آج کل بھی استعمال کیا جاتا ہے اس میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اب تک یہ ہل اور دیگر ایسے آلات کشاورزی عام لوہاروں کے ہاں بنائے جاتے تھے۔ اور اب اس کام کا کچھ حصّہ مشینوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ میدانی علاقوں میں اب زمین جُوتنے میں ٹریکٹر بھی کام میں لائے جاتے ہیں۔ بُوائی کے وقت بیج چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بوئے جاتے ہیں جہاں سے دھان کی پنیری حاصل کی جاتی ہے یا کئی صُورتوں میں بیج کو براہ راست اسی زمین میں بویا جاتا ہے جس پر اس کی کاشت کی جانی مطلوب ہو۔

عام طور پر بیج کو پانی سے بھگو کر ایک ہفتے تک ٹھیکری کے برتنوں یا جوٹ (پٹ سن) کی بوریوں میں رکھا جاتا ہے جہاں اس کی چھوٹی چھوٹی کونپلیں پھوٹ آتی ہیں۔ پھر اسے کیاریوں میں بو کر ایک مہینے سے لے کر ڈیڑھ مہینے تک دھان کی پنیری تیار ہو جاتی ہے۔ اس دوران کیاریوں میں دھان کے پودوں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کیاریوں میں پانی کی سطح بھی بڑھائی جاتی ہے۔ پنیری کی تیاری میں خاصا احتیاط برتا جاتا ہے۔ اُس زمین کا زرخیز ہونا کافی ضروری ہے جو پنیری کیلئے مخصوص ہو۔ اس مقصد کے لئے گھریلو اور کیمیاوی کھاد بھی استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن کیاریوں کو گھاس پھُوس سے محفوظ رکھا جاتا ہے تاکہ دھان کے بیج کی ننھی ننھی کونپلیں بغیر کسی رکاوٹ کے پانی کی سطح سے اُوپر آ سکیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کیاریوں میں پانی بھر دینے سے پہلے زمین کو کافی حد تک مہین بنایا جائے۔ جُون کے مہینے تک پنیری اونچائی میں تقریباً چھ اِنچ ہو جاتی ہے اور یہ کیاریوں سے نکال کر کھیتوں میں لگائی جاتی ہے (جن میں پہلے ہی سے ہل جُوت کر سینچائی کی گئی ہوتی ہے اور پانی سے سیراب رکھا ہوا ہوتا ہے)۔ اس عمل سے ان کی تہہ نرم کیچڑ سے لدی ہوتی ہے

اور پنیری آسانی سے اپنی نرم جڑیں پھیلاتی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اس زمین میں گھاس وغیرہ بھی اگتی ہے جسے صاف کرنے کے لئے دس پندرہ دنوں کے بعد دھان کے لہلہاتے اور سرسبز کھیتوں میں نلائی کی جاتی ہے۔ اگرچہ اب ان کھیتوں کو فاضل گھاس پھوس سے صاف رکھنے کے لئے مختلف ادویات استعمال کی جاتی ہیں پھر بھی زمین کو نرم رکھنے کے لئے نلائی کو ضروری سمجھا جاتا ہے جس سے کہ دھان کی جڑیں آسانی سے پھوٹ کر زمین میں پیوستہ ہو جاتی ہیں۔ اس عمل کے چند دنوں بعد دھان کے کھیتوں کو وقفہ وقفہ بعد پانی سے سینچا جا سکتا ہے لیکن نشیبی علاقوں میں یہ کھیت برابر سال تک پانی سے بھرے رہتے ہیں۔ اگست یا ستمبر کے اوائل میں دھان کے پودوں کی بالیاں نکل آتی ہیں جو ستمبر کے آخر میں پک کر تیار ہوتی ہیں اس طرح دھان کی فصل کو تیار سمجھا جاتا ہے اور یہیں سے فصل کی کٹائی شروع ہوتی ہے۔ دھان کا پودا دو فٹ سے لے کر چار فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔ کٹائی کے بعد عام طور پر فصل کو کھلیان میں ہی جمع کیا جاتا ہے جب کسان ربیع فصل کی بوائی وغیرہ سے فارغ ہو جاتے ہیں تو دھان کو گاہا جاتا ہے۔ چنانچہ دھان کو چھیلنے کے بعد اس سے چاول حاصل کیا جاتا ہے۔ چونکہ کشمیر میں بیشتر زمین پر دھان کی ہی کاشت ہوتی ہے اور لوگوں کے اکثریتی طبقے کی معاشی زندگی کا دار و مدار دھان کی کاشت پر ہی ہے لہذا سماج میں اس فصل کی بوائی سے لے کر کٹائی اور اس کے بعد تک چند تقریبات نے جگہ پائی ہے البتہ ان تقریبات کی حیثیت انفرادی ہے۔ "گونگل" - "بیاؤ تہر" - "بل" - "ووگربتہ" وغیرہ ایسے تہوار یا نذر و نیاز کہنا زیادہ مناسب ہوگا جو براہ راست فصل کی تیاری کے ارتقائی مرحلوں میں انجام دئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ "نوو" ایک ایسی تقریب ہے کہ جب لوگ نئی فصل کو پہلی بار گھر میں پکاتے ہیں۔ یہاں پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے ان تمام تقاریب پر چاول کو پکایا جاتا ہے اور کھلایا جاتا ہے۔

دنیا بھر میں دھان کی ہزاروں قسمیں اگائی جاتی ہیں۔ صرف ہندوستان میں دھان کی تقریباً ڈیڑھ ہزار اقسام ملتی ہیں۔ ہماری ریاست میں بھی اگرچہ کئی برسوں سے ان ہی اقسام کو زیادہ تر اگایا جاتا ہے جو پیداوار کے لحاظ سے زیادہ فائدہ بخش ہیں لیکن آج سے پندرہ بیس سال قبل بھی ہمارے عام کسان دھان کی کئی روایتی اقسام اگاتے تھے۔ جن کی بوائی کے ترک کئے جانے کی وجہ شاید "تریے" نامی بیماری ہے جو ان اقسام پر زیادہ اثرانداز ہوتی تھی۔ کہیں کہیں اب بھی ان میں سے کچھ اقسام کی دھان کی کاشت کی جاتی ہے۔ بقول پیر غلام حسن کھویہامی (تاریخ حسن جلد اول صفحہ ۱۰۵) دھان کی چھیانوے اقسام یہاں کاشت کی جاتی تھیں۔ یانزن کا کنو زن کا کاٹھ چھان، لارکا انزن، سالور کا گوڈ کر زن، تیل بل کا چغل شیرین اور ملائم ہونے کی وجہ سے کافی مشہور ہے۔ کشمیر۔ جلد ۳ نمبر ۲ مارچ ۱۹۵۳ء کے مطابق ایک سروے سے پتہ چلا ہے کہ کشمیر میں دھان کی چار سو بارہ اقسام اگائی جاتی تھیں (ڈاکٹر وید کماری۔ نیل مت پران۔ جلد اول صفحہ ۱۲۰)۔ موتی لال ساقی نے بھی اس ضمن میں خاصا کام انجام دیا ہے اور دھان کی چونسٹھ ایسی اقسام کا ذکر اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو کشمیر میں اگائی جاتی ہیں (سون ادب (کشر) ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۹۰ تا ۳۰۱) ساقی صاحب نے ان اقسام کے متعلق مختصر لیکن جامع تعارفی نوٹ بھی دئے ہیں۔ یہاں پر ان اقسام کے نام دہرانا نامناسب نہیں ہوگا جن کا ذکر ساقی صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے:

اسماعی کاٹھ چھان۔ امبر خان۔ انزرن۔ اٹل۔ ببر۔ بدرج۔ بچہ توپ۔ باسمت۔ برزہ۔ بانہ۔ بوڈ کاٹھ زور۔ بیگم۔ پوشی براڑ۔ تونلہ مال۔ تہ زنگ۔ چھتہ برج۔ رزول کاٹھ چھان۔ چینا ۱۰۳۹۔ ریشم شیتر۔ سفید کاٹھ چھان۔ سوگ داس۔

سوکول۔ سفید چینا۔ شالہ کیڑو۔ شاہ وُلگ۔ شالہ لوٹ۔ شیرمال (شیرمال)۔ زین

کاٹھ چھان۔ زکر۔ کھُٹ۔ کھٹ گر۔ کرالہ زگ۔ کاوٗلوٗر۔ کاٹھی زگ۔ کاٹھ وور۔

کاٹھ چھان۔ بسکے ہ ے۔ ملد۔ تروگل۔ گیوزیر۔ گلہ زگ۔ گوڈ وونزل۔ گوڈ کرائن۔

گرگوٹی۔ قادر زمٹی۔ قادر گنی۔ لولہ انزن۔ لاٹہ بیول۔ ریتن۔ مونغل (مونغل بیول)

مُنجون۔ مُشکہ بُدج۔ مَہ زنیٹھ۔ نُنبہ بیول۔ نکہ چینا۔ نور۔ ہُرمیری چینا۔ دودھ زج

برنز۔ وہ زل کیرڈ۔ وُلگ اور ریمبرزل۔[1]

---

[1] دھان کی ان اقسام کے علاوہ یار محمد خان کے ایک قلمی مخطوطہ "گلشن کشمیر" میں شالی کی کئی اقسام کے نام گنوائے ہیں۔ موصوف نے یہ مخطوطہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء میں تحریر کیا ہے۔ اس رسالے میں خان صاحب نے کشمیری قواعد، تاریخ، جغرافیہ، ادویات، نباتات، حیوانات اور بہت سے مضامین کو یکجا کیا ہے۔ موصوف پہلے شخص تھے جنہوں نے بائیبل کا کشمیری ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ اسے سلیمان نامی ایک اور شخص سے منسوب کرتے ہیں۔

جو نام اوپر رقم کئے گئے ہیں اور جو یار محمد خان صاحب نے مذکورہ رسالے میں درج کئے ہیں انہیں ملا کر کُل ۱۳۳ اقسام شالی کے نام فراہم ہوتے ہیں۔ "گلشن کشمیر" میں درج کئے گئے نام حسب ذیل ہیں:۔

سکھ بس۔ کاہنامہ۔ لاچہ ہال۔ بترہ ہال۔ مُختہ ہال۔ شاہ گر۔ گرہ تانج۔ شالہ کن۔ واتہ ہال۔ بنہ کٹہ بن۔ کاوہ کریڈ۔ سخ۔ انزن۔ پوت سادہ۔ کابرو۔ کرمہ شرد۔ کنیہ ہال۔ چندر ہال۔ مہ انزن۔ کالوو۔ کیو۔ چھبہ گر۔ تنچہ تجل۔ رام ہال۔ لاشرفو۔ بنہ کلہ۔ چکل۔ کرنہ کرید۔ مختہ برزہ۔ شون۔ کرمنہ ہال۔ کرنہ شون۔ شالہ انزن۔ چھتہ ہال۔ ردہ کرید۔ سگ شال۔ بنگہ بیول۔ کالہ نور۔ بڈہ بیول۔ جُب۔ نہاکو۔ پوت کد۔ دودہ برزہ۔ کرمہ انزن۔ گرہ مشک۔ بانہال۔ مادر۔ چھتہ زگ۔ منگ ہال۔ گرہ۔ زگ۔ چندر۔ کھاس نیور۔ کاوہ انزن۔ چھانہ نور۔ کوچھ انزن۔ گرہ گورہ۔ لہنہ زگ۔ بدرہ زگ۔ بگہ زگ۔ زگہ مادر۔ زگرے۔ کاچہ نور۔ کرنڈ۔ جگہ زرہ۔ زگہ تر۔ ہی بیول۔ کاتہ گرہ۔ اسنا۔

اس طرح سے دھان کی قسموں میں اور ۶۹ قسموں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

(ایڈیٹر)

یاد رہے کہ اس مضمون میں تو ٹہ ٹال[3] کا ذکر ایک ساتھ دوبار آیا ہے۔ اور دونوں کے متعلق تعارفی نوٹ بالکل الگ الگ ہے۔ علاوہ ازیں چند ایسی اقسام کا ذکر اس مضمون میں درج ہونے سے رہ گیا ہے جن کی کاشت کشمیر میں دن بدن مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ ان میں سب سے اہم نام کے۔۳۹ کا ہے۔ کشمیر میں "شیر کشمیر زرعی یونیورسٹی" کے قیام کے بعد جہاں زرعی سیکٹر میں کافی پیش رفت ہوئی ہے وہاں دھان کے متعلق یونیورسٹی کا شعبہ دھان کی پیداوار کو بڑھانے کے سلسلے میں مزید تحقیق کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے۔ اگر ایسی کوششیں جاری رہیں تو توقع کی جا سکتی ہے کہ ریاست جلد ہی اپنی خوراک کی ضروریات کو پوری کرے گی۔

---

[3] ایک قسم کی دھان کے چاول باریک اور بالکل سفید ہوتے ہیں جبکہ دوسری قسم کی دھان کے چاول قدرے موٹے، کافی میٹھے لیکن رنگ میں پہلی قسم کے چاول جیسے سفید نہیں ہوتے بلکہ بھورے یا بادامی رنگ کے ہوتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

نشاط انصاری

آبی مسکن[۲]

اس سے قبل کہ آبی مسکن کی تاریخ، وضع قطع اور اس کے ارتقاء کے بارے میں کچھ کہا جائے بہتر یہی رہے گا کہ پہلے یہ دیکھ لیں کہ بجائے خود کشتی بنانے کی تاریخ کتنی قدیم ہے اور اس کی تعمیر کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ اس سلسلے میں یہ لیجنڈ Legend ذہن میں رکھنا اس گتھی کو سلجھانے میں قدرے مدد دے گا کہ "نیل مت پُران" کی رُو سے خالق کائنات نے جب عالم آب و گل کو پہلی بار بنایا تو ہزاروں برس گزرنے کے بعد زمین پر انسانی زندگی کی تخلیق کی۔ اس تعمیری عمل کے ہزاروں سال کے ٹھہراؤ کے بعد خالق کائنات نے اپنی بنائی ہوئی اُس پہلی دنیا اور اس پر رہنے والی انسانی ہستی کو مٹا کے رکھ دیا۔ ہزاروں سال اور بیت جانے کے بعد خالق کائنات نے دنیا کو دوسری بار بنا لیا اور درمیان میں ہزاروں برس تک اسے انسانی زندگی کے بغیر ہی رکھنا پسند کیا۔ پھر اور ہزاروں سال گزرنے کے بعد انسانی زندگی کی دوبارہ تخلیق کی۔ لیکن ہزارہا برس گزر جانے کے بعد دوسری بار اس دنیا اور تمام انسانوں اور جانداروں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کے رکھ دیا۔

اس طرح بنانے اور بگاڑنے کا عمل برابر چھ بار دُہرایا گیا اور ساتویں مرتبہ جب ہمارے اس آج کے عالم ناسُوت کو اللہ کی طرف سے منصۂ شہود پر لایا جا چکا تو ہزاروں برس بیت جانے کے بعد زندگی کا آغاز ہوا اور روئے زمین پر دنیا کے دیگر خطوں کی طرح سرزمین کشمیر کو وجود میں لانے کا عمل بھی ہوا۔ مگر ابتداء میں زندگی کے آثار اس سرزمین پر کہیں نہ تھے بلکہ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ نیل مت پُران میں درج اس لیجنڈ کے مطابق ساتویں راؤنڈ میں لارڈ شیو (بھگوان) نے ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ہو کر منّو کا رُوپ دھارن کر کے کشمیر کی اُس طویل و عریض جھیل میں بیج بوئے جسے ستی سر کہا جا سکتا ہے اور پھر جب پانی خشک ہوا تو انسانی زندگی کے آثار شروع ہوئے۔ اس طرح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج سے ہزاروں برس پہلے جبکہ کشمیر ستی سر کی شکل میں نمودار ہوا تھا تو اُس زمانے میں یہاں کشتی کا وجود پایا جاتا تھا۔ تب سے اب تک کتنا عرصہ ہوا اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ یہ باتیں تاریخ سے ماقبل کی ہیں۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کشتی سازی یا کشتی رانی کی تاریخ کشمیر میں اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ خود کشمیر۔

جہاں تک اسلامی تواریخ اور خاص کر قرآن حکیم کے سورہ ہائے مقدسہ، خاص کر سورۂ نوحؑ اور ہودؑ[۳] کا تعلق ہے دنیا میں اُس وقت کشتی بنائی گئی جب آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام مبعوث بہ نبوت تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کب پیدا ہوئے اور کس دور میں گزرے، اس کے بارے میں اسلامی کتب میں درج ہے کہ نوحؑ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے ایک سو چھبیس[۱۲۶] برس بعد پیدا ہوئے اور آدمؑ کے بعد وہ گیارھویں پیغمبر تھے۔ حضرت نوحؑ نے دنیا میں دو ہزار برس عمر پائی۔ اس میں

[۳] تفسیر کلام اللہ از مولانا حکیم حافظ سید فرمان علی صدر الافاضل مدرس اعلیٰ مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ۔

سے آٹھ سو پچاس[۸۵۰] برس قبل نبوت اور نو سو پچاس[۹۵۰] برس بعد نبوت تعلیم و ہدایت و ارشاد میں گذارے اور درمیان میں دو سو[۲۰۰] برس کشتی بنانے میں صرف کئے۔ مبعوث بہ نبوت ہونے کے دوسرے حصے کی عمر میں یعنی طوفانِ نوحؑ کے بعد پانچ سو برس تک زندہ رہے اور یہ مدت شہروں کو آباد کرنے اور لوگوں کے پھر سے بسانے میں گذار دی[ے]

اپنی ناہنجار اُمت کے ہاتھوں حضرت نوحؑ نے باوجودیکہ ساڑھے نو سو[۹۵۰] برس ان کی مسلسل فہمائش کرتے رہے، ایسے مصائب، تکلیفیں اور رنج اٹھائے جن کو ضبطِ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ جب وہ لوگوں کو راہِ راست پر چلنے کے لئے سمجھاتے تھے تو اُن کی اُمت اُن کو اس قدر زدوکوب کرتی تھی کہ اُن پر غشی طاری ہو جاتی۔ بعض اوقات اُمتیوں کے پتھراؤ کی وجہ سے وہ پتھروں کے نیچے دب کر رہ جاتے تھے۔ جب حضرت نوحؑ نو سو سال گزرنے کے بعد امت کو سیدھے راستے پر لانے میں بالکل ناکام ہو کر عاجز ہو چکے تو اُن کی تباہی و بربادی کے لئے بددعا کی جس کے نتیجے میں ساری عورتیں بانجھ ہو گئیں۔ چوپائے ہلاک ہوئے۔ باغ و راغ جل گئے۔ چالیس برس تک آسمان سے بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسا۔ مگر اس سختی اور عذابِ الٰہی کے باوجود ان کی اُمت حتیٰ کہ اُن کا ایک بیٹا کنعان اور اس کی بیوی داخلہ بھی نہ اُن پر اور نہ اُن کے خدا پر ایمان لائے۔ پھر نوحؑ کو اللہ کی طرف سے کشتی تعمیر کرنے کا امر ہوا مگر انہیں کشتی بنانے کا کوئی تصور نہ تھا۔ لیکن طاقتِ خداوندی سے فرشتوں نے نوحؑ کو کشتی بنانے کا مکمل تصور دے دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی امت کی عذابی اور حواریوں کے بچاؤ کی خاطر بلوط کی لکڑی سے بارہ سو گز لمبی آٹھ سو گز چوڑی اور اسی گز اونچی کشتی بنائی۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا کہ حضرت نوحؑ

[ے] تفسیر کلام اللہ از مولانا حکیم حافظ سید فرمان علی مدرس اعلیٰ مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ۔

کو اس کشتی کے بنانے میں دو سو[۲۰۰] برس لگے۔ اس کی تین منزلیں تھیں۔ نچلی منزل چوپائیوں کے لئے، دوسری ہر قسم کے اُڑنے والے پرندوں کے لئے اور تیسری منزل اپنے حواریوں اور اہلِ خاندان کے لئے۔

حضرت نوحؑ کی وہ کشتی جب بن کر تیار ہوئی تو اس میں ان کے ۷۲ ساتھیوں کے علاوہ اُن کے تین بیٹے حامؔ، سامؔ، یافثؔ اور ان کی تین بیویاں، اُن کی اپنی اہلیہ اور خود سوار ہوئے۔ جونہی وہ اسّی لوگ کشتی میں اترے تو ایک تنور سے زور کا پانی پھوٹ پڑا اور آسمان سے موسلا دھار بارش ہوئی اور مسلسل چھاجوں پانی برسا۔ پھر بھی نوحؑ لوگوں کو اپنا ہمنوا بننے کے لئے پکارتے رہے۔ کہتے ہیں ملک عراق کے شہر کوفہ میں آج کل جہاں مسجد کوفہ واقع ہے وہاں ہی کشتی بنانے کا عمل تکمیل کو پہنچا اور وہیں سے طوفان کا آغاز بھی ہوا۔ سیلاب کا پانی جوں جوں چڑھتا گیا نوحؑ کی کشتی بھی پانی کی سطح پر تیرتی رہی اور آخرکار کوہِ جودیؔ کی چوٹی کے ساتھ جا لگی۔ یہ جودی رُوم کے حصہ آرمینیا میں کوہ ارادات کی ایک اونچی چوٹی ہے۔ چنانچہ آج سے دس پندرہ سال پیشتر اِلسٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں یہ بات درج تھی کہ ایک یورپی سروے پارٹی نے کوہ جودی پر نوحؑ کی اس کشتی کے ایک سرے کی لکڑی کے کچھ ٹکڑے حاصل کر لئے جو بعد میں تحقیق کے بعد برٹش میوزیم میں رکھے گئے۔

نوحؑ کے اس طوفان میں ساری مخلوق پانی سے جہنم کی آگ میں جا پہنچی، اور طوفان تھم جانے کے بعد نوحؑ نے کوہِ جودی کے دامن میں ایک چھوٹی سی بستی آباد کی اور وہیں رہنے لگے۔ اس بستی کا نام سُوق الثمانین یعنی اسّی آدمیوں کا بازار رکھا گیا۔ خدا کی شان دیکھئے کہ کچھ وقفہ کے بعد وہاں ایسی وبائی بیماری پھوٹ پڑی

[ے] سورۂ ہود

کہ حضرت نوحؑ کے سارے حواری لقمۂ اجل بن گئے اور صرف ان کے تین بیٹے حام، سام، یافث، ان کی تین بیویاں اور نوحؑ اور ان کی اہلیہ ہی زندہ رہے اور نوحؑ کی ہی اولاد سے بعد میں انسانی زندگی کا سلسلہ چلتا رہا۔ اسی لئے نوحؑ کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ حبشی نوحؑ کے بیٹے حام ہی کی اولاد سے ہیں۔

حضرت نوحؑ کا یہ طوفان ۳۲۳۸ سال قبل مسیح اور توارت کے نازل ہونے سے ۶۰۰ برس پہلے آیا تھا[1]۔ اس مدت میں اگر وہ پانچ سو برس بھی جوڑ دیئے جائیں جو نوحؑ نے خدا کے حکم سے[2] کشتی بنانے اور طوفان کے بعد دنیا میں زندہ رہ کر گزارے تو پھر کشتی بنانے کی ابتدا نوحؑ کے ہاتھوں ہی آج سے ۳۷۴۶ سال قبل مسیح مانی جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اسی دور کے آس پاس کا زمانہ ہو جب کہ "نیل مت پران" کے مطابق بھگوان شیو نے ستی سر کی سطح پر کشتی میں سوار ہو کے بیج بونے کا عمل شروع کیا تھا۔

دیکھنا اب یہ ہے کہ ہمارے ہاں کشمیر میں آبی مسکنوں کی ابتدا اور ان کی تعمیر کا کام کب اور کس زمانے سے شروع ہوا کیوں کہ آبی مسکنوں کا رواج دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کشمیر میں ہی پہلے پہل چل پڑا ہے اس سلسلے میں "دی ویلی آف کشمیر" کے مصنف سر والٹر آر لارنس اس پیشہ سے تعلق رکھنے والوں کی آمد اور ان کی آبادکاری کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"It is impossible to obtain any information as to their origin, but the profession is very ancient and history affirms that Raja Prabat Sen introduced boatmen from Sangal-dip"[3]

---

[1] لغات فیروزی شائع شدہ در سال ۱۹۳۰ء   [2] سورہ ہود

[3] "The Valley of Kashmir" Page 315

(یہ کہنا قدرے مشکل ہے کہ آبی مسکن کے پیشہ سے تعلق رکھنے والوں کا ماخذ اور اصل کیا ہے؟ لیکن پیشہ بہت ہی قدیم ہے اور تاریخ اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ راجہ پربت سین[1] نے ملاحوں کو سنگلدیپ سے لا کر یہاں متعارف کرایا)۔ راجہ پرورسین ۱۳۵ بکرمی میں کشمیر کا حکمران تھا۔ اور سر والٹر لارنس کے اس دعویٰ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کشمیر میں ملاحی آج سے ایک ہزار نو سو آٹھ (۱۹۰۸) سال قبل شروع ہوئی ہے۔ لارنس کا یہ کہنا کسی حد تک صحیح بھی ہوسکتا ہے کیوں کہ اگر یہ لوگ دوسرے لوگوں کی طرح راجہ پرورسین کے زمانے میں اسی سرزمین کے باشندے ہوتے تو ان کے بھی اسی طرح اپنے مکان ہوتے جس طرح کہ باقی کشمیریوں کے۔ سنگلدیپ سے یہاں پہنچ کر ان کے اپنے مکان تو تھے نہیں اس لئے یہ لوگ کشتیاں بنا کر یہاں کی بڑی بڑی جھیلوں، ندی نالوں اور خاص کر دریائے جہلم کے کناروں پر اپنی کشتیاں لنگر انداز کر کے زمانہ قدیم سے ہی زندگی گذارتے چلے آئے ہیں۔

چونکہ یہ اس دور کی بات ہو رہی ہے جبکہ کشمیر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کیلئے آج کل کے زمانے کی طرح نہ تو راستے تھے اور نہ سڑکیں۔ اسی لئے رسل و رسائل اور آمد و رفت کا واحد بلکہ اہم ذریعہ دریائی ٹرانسپورٹ ہی تھا۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ آبی مسکنوں کی تعمیر کے لئے زمانہ قدیم سے خالص لکڑی کا ہی سہارا لیا جاتا رہا ہے اور یہ کسی دوسرے مواد سے بنائے نہیں جا سکتے۔ سدا بہار اور گھنے جنگلوں کی وجہ سے تعمیری لکڑی کی فراوانی یہاں قدرتی طور چلی آئی ہے تو اس بات کے پیش نظر اور دیگر وسائل کی فراہمی کی وجہ سے ملاحوں کو یہاں آبی مسکنوں کی تعمیر اور شروعات میں کوئی بھی مشکل درپیش نہ آئی ہوگی۔ سوال پیدا

---

[1] اصل میں یہ راجہ پرورسین ہے نہ کہ پربت سین۔

ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلے پر ان آبی مسکنوں کی ساخت اور وضع قطع کیا اور کس قسم کی تھی۔ ٭ اس کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ابتدائی سٹیج پر جہاں آبی مسکنوں کی تعمیر اقامتی مقاصد کے لئے کی رہی ہوگی وہاں ضروریات زندگی کا سازوسامان اور دیگر اشیاء ڈھونے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لئے بھی ان کو بنایا جا چکا ہوگا۔ اسی وجہ سے اس کا ابتدائی نام "لرناؤ" (LARINAV) یعنی پانی پر تیرنے والا مکان رکھا گیا تھا۔

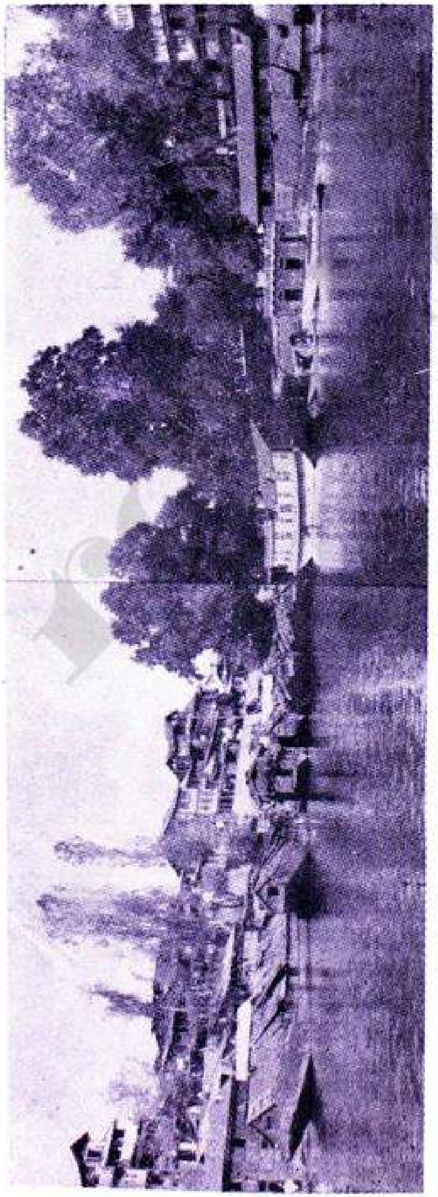
امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ "لرناو" نے اپنے ارتقائی سفر میں کئی اہم تبدیلیاں پائیں اور مختلف قسم کی شکلوں اور ناموں سے ہمارے سامنے آئی۔ ان ناموں میں "بہتھ" (BAHATS) "ڈونگہ" (DUNGA) "کھوچ" (KOUCH) اور "ہاؤس بوٹ" (HOUSE BOAT) جیسے چند نام قابل ذکر ہیں۔ وآر (WAR) ژاکہ وآر (TSAKAWAR) شکارا (SHIKARA) ڈیمبہ ناؤ (DEMBNAO) اور پرندا (PARINDA) کشتیوں کی ہلکی پھلکی قسموں میں سے خاص قسمیں ہیں اور یہ سب کی سب عربی فارسی حروف تہجی کے (ب) حرف کی شکل کی ہوتی ہیں یعنی کشتی کے دونوں سرے پانی کی سطح سے قریباً تین فٹ اور بعض اوقات پانچ فٹ تک اوپر کی طرف اٹھے ہوئے ہوتے ہیں جس کا خیال اس کے بنانے کے وقت ہی رکھا جاتا ہے تا کہ کشتی پانی کی سطح پر اپنا توازن قائم رکھ سکے اور اسے کھینچنے یا کھینے کے دوران اس کا دُنبالہ (STERN) پانی کے بہاؤ کی رفتار کی پوری مدافعت کر سکے اور اپنے سامنے آنے والے پانی کے ریلے کی قوت کو کمزور بنا کر اُسے دو حصوں میں کاٹ کر اپنے یمین و یسار چھوڑ سکے۔ کشتی کے سپاٹ اور چپٹے پیندے میں سے کم از کم آدھ فٹ اور مال ڈھونے کے وقت ایک فٹ تک کا حصہ پانی میں ڈوبا رہتا ہے۔ پھر بھی اس کا اگلا سرا اور دُنبالہ ہمیشہ پانی سے

بہت اُوپر رہتا ہے۔ اس سائنسی ٹیکنیک کا دار و مدار اسکی تعمیری ساخت پر ہی منحصر ہے۔ لیکن چھوٹی اور ہلکی پھلکی قسم کی جو کشتیاں ہوتی ہیں اُن کے سرے اور دُنبالے پانی کی سطح سے چار، پانچ انچ تک اوپر کی طرف اُٹھے ہوئے رہتے ہیں۔

کشمیر کے ان آبی مسکنوں کی تعمیر میں صرف اعلیٰ قسم کی دیودار کی لکڑی ہی استعمال میں لائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لکڑی پانی میں رہنے سے عام طور بوسیدہ ہو جاتی ہے لیکن دیودار کی لکڑی میں یہ خاصیت ہے کہ پانی میں سالہا سال تک رہنے پر بھی یہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہے۔ اگر بوسیدہ ہو بھی جائے تو بھی ساٹھ ستر سال تک بوسیدگی کے عمل سے محفوظ رہ پاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشتیاں بنانے کے لئے دیودار کی لکڑی کے غیر معمولی اور کشادہ تختے اور کڑیاں استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ کشتیوں کے لئے ان خاص قسم کے تختوں کی قیمت دیودار کی عام سائز کی تعمیری لکڑی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ یہ تختے دیودار کے درخت کے اندرونی گودے کی لکڑی سے حاصل کئے جاتے ہیں جو گٹھیلی اور گانٹھ دار نہ ہونی چاہیئے۔

کشتیوں کی تعمیر میں عام ترکھان کام نہیں آتے بلکہ ترکھانوں کا ایک خاص طبقہ ہی کشتیاں بنانے کے فن سے واقف ہوتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اس قبیل کے ترکھان ملاحوں اور ہانجیوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ؎ کشتی کے موٹے موٹے اور وزنی کشادہ تختوں کو آپس میں جوڑنے کی خاطر دیسی طرز اور مقامی طور بنائی گئی کیلوں (وانگنہ) اور کانٹوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور تختوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں درزوں

؎ چنانچہ ایک انگریز سیاح اور مورخ ینگ ہسبنڈ کا کہنا ہے کہ کشمیری ذہین اور عقلمند ترکھان ہیں۔ ٹینڈل بسکو کا قول ہے کہ کشمیری اپنی خاص اُپج سے کشتیاں بنانے کی جبلت رکھتے ہیں۔



دریا بہ دریا سفینے سفینے کنارے کنارے ہزاروں شکارے

سے پانی یا نمی اندر نہ آنے پائے۔ اس کے باوجود دلدلی زمین سے ایک خاص قسم کے خودرو پودوں کے نرم اور ملائم ریشوں کو انتہائی تدبیر سے چھینی کے ذریعے تختوں کے درمیانی جوڑوں میں ایسے پیوست کر دیا جاتا ہے کہ ہوا تک کا بھی گزر ان درزوں سے نہیں ہو سکتا۔ یہ کام کشتی بنانے کے فن میں بہت ہی صبر آزما مانا جاتا ہے۔

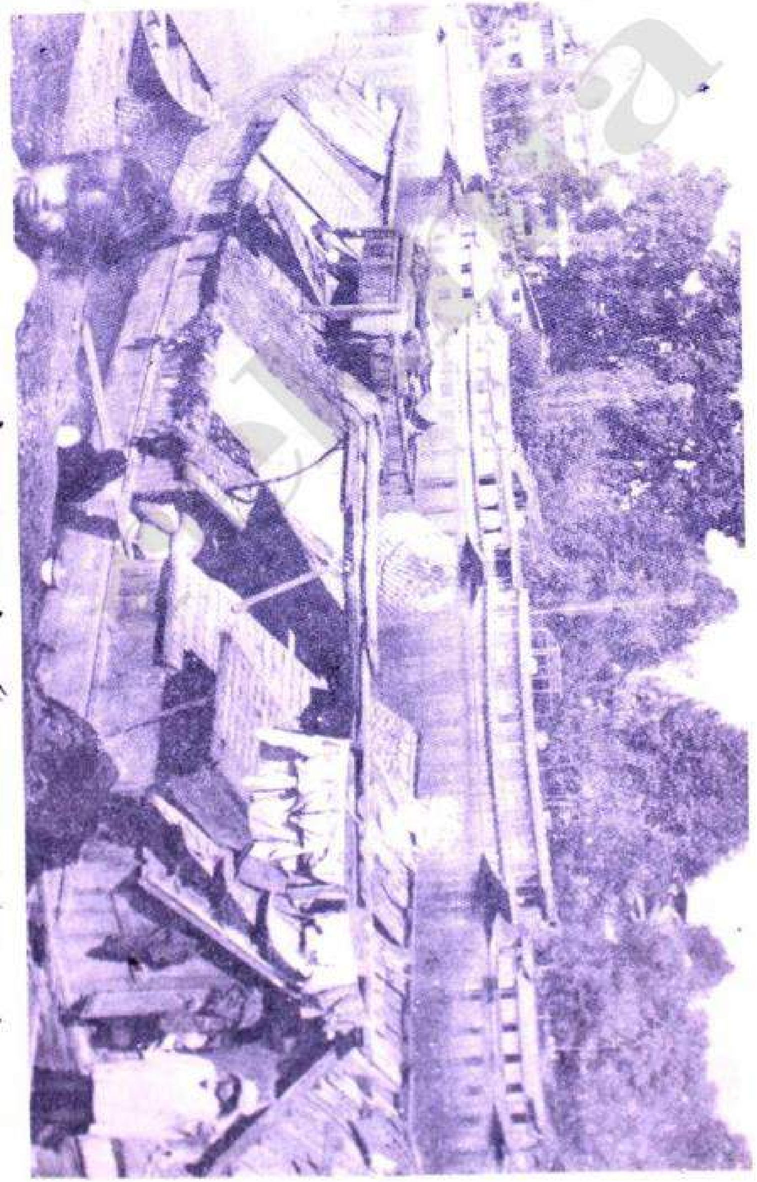
وزنی اور بھاری بھر کم کشتیوں کے خواہ وہ اقامتی ہوں یا غیر اقامتی کھینے میں لمبی لمبی بلیوں اور چپوؤں سے کام لیا جاتا ہے اور بہترین بلی وہ سمجھی جاتی ہے جو بالکل کم عمر دیودار کے پتلے تنے کو صاف کر کے تیار کی گئی ہو۔ ایسی صورت میں پورے درخت سے ایک ہی بلی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی قیمت زیادہ تو ضرور ہوتی ہے لیکن یہ چلتی بہت دنوں تک ہے۔ چپو صنوبر یا کیل کے درختوں کی لکڑی کے علاوہ اور قسم کی لکڑی سے بھی بنایا جاتا ہے اور یہی وہ ملاحی آلہ ہے جس سے کشتی کو پانی کی سطح پر صحیح سمت میں ڈال دیا جاتا ہے گویا چپو کشتی میں وہی کام دیتا ہے جو موٹر یا بس کے لئے سٹیرنگ۔ بلی کی طاقت سے کشتی کو آگے لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پانی کے تیز بہاؤ کے موقع پر کشتی کو مخالف سمت میں لینے پر لمبی لمبی رسیوں سے بھی کام لیا جاتا ہے جن کو کہ دو دو تین تین توانا اور صحت مند ملاح آگے سے کھینچتے رہتے ہیں۔ چھوٹی کشتیوں کو چلانے میں زیادہ تر چپو ہی سے کام لیا جاتا ہے لیکن جب پانی کی سطح کم ہو جائے تو بلیوں کا سہارا ہی لیا جاتا ہے۔

جہاں تک "بہرش" کی مسکنی اور اقامتی افادیت کا تعلق ہے اس کے دنبالہ میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں جن میں ملاح اور اس کا مختصر کنبہ زندگی کے دن بسر کرتا ہے۔ اسی حصے میں ایک کونے پر کھانا پکانے کے لئے مٹی کا ایک چھوٹا سا چولہا بنایا گیا ہوتا ہے اور اس حصے پر گھاس یا نرسل کی بنی ہوئی مستقل چھت لگی ہوئی ہوتی ہے۔ عقبی حصے کو غلہ، اناج اور دیگر اشیائے خوردنی کو

ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ اس حصے پر بھی اٹھاؤ قسم کی چٹائیوں سے بنائی ہوئی عارضی چھت لگی ہوتی ہے جو بارش اور برفباری کے دنوں میں اناج کو خراب ہونے سے بچاؤ کا کام دیتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر بہڑ کے اس حصے کو اٹھا بھی دیا جاتا ہے۔ یہ اس قدر بھاری بھر کم ہوتی ہے کہ اس میں آٹھ سو سے ایک ہزار من تک کا بوجھ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کی لمبائی پچاس سے ساٹھ فٹ اور چوڑائی چھ فٹ تک ہوتی ہے۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں لکھتا ہے کہ اس قسم کی کشتیاں تجارتی مقاصد کے لئے ہی بنائی جاتی ہیں۔

"کھونچ" دو طرح کا ہوتا ہے، ایک چھوٹے سائز کا اور دوسرا بڑے سائز کا۔ چھوٹے سائز کے کھونچ میں رہائش کے لئے کوئی انتظام نہیں ہوتا ہے، البتہ بڑے سائز والے کھونچ میں عارضی رہائش کا کوئی نہ کوئی انتظام ضرور ہوتا ہے جو صرف ایک کمرے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس قسم کے آبی مسکنوں میں کھُردرے قسم کا ساز و سامان جیسے تعمیری لکڑی، اینٹیں، پتھر، بالن اور ریت وغیرہ ڈھویا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی بہڑ سے کم ہوتی ہے اور اس میں چار سو من تک کی وزنی اشیا لادی جا سکتی ہیں۔

بہڑ کی ترقی یافتہ شکل مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ڈونگہ کے نام سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کا پیندا بہڑ کے مقابلے میں چپٹے قسم کا ہوتا ہے اور لمبائی میں پچاس سے ساٹھ فٹ اور چوڑائی میں چھ فٹ ہوتا ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں اس پر بھی چٹائیوں سے بنی ہوئی چھت لگی ہوتی تھی اور طرفین پر سرکنڈے کی تیلیوں کی قسم سے بنائی ہوئی چلمنیں لٹکائی جاتی تھیں مگر بعد میں جب یہاں غیر ملکی سیاحوں کا آنا شروع ہوا تو شنگلی کی چھت نے چٹائیوں سے بنی ہوئی چھت کی جگہ لے لی اور اس کے دونوں سائیڈوں پر چلمنوں کے بدلے ہلکے پھلکے تختوں کی دیوار دل



بہڑ — آج بھی کشمیر کے بعض علاقوں میں تجارتی سامان لانے لے جانے کا اہم ذریعہ ہے

نے جگہ پائی۔ ڈونگہ کے دُنبالہ میں صاحبِ خانہ اور اس کے کنبے کے لوگ رہائش اختیار کرتے ہیں اور دو کمرے اس کے عقبی سرے کی طرف ہوتے ہیں جن میں سیاحوں کو بٹھایا جاتا ہے۔ بہٹ کے مقابلے میں یہ آبی مسکن اس قدر ہلکا ہوتا ہے کہ ایک کھینچن یا بلہ میں پانی کی سطح پر دو فٹ کی جست لگاتا ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں ڈونگہ میں اگر سیر کی جائے یا گھوما جائے تو بہت ہی لطف آتا ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل جبکہ سرینگر میں ٹرانسپورٹ کی سہولتیں بہم نہ تھیں، سیر سپاٹے کے شوقین مغل باغات کی سیر ڈونگوں میں بیٹھ کر ہی کیا کرتے تھے اور موسیقی کی محفلیں سجائی جاتی تھیں۔ کچھ لوگ شادی کے موقعہ پر دولہا کی برات ڈونگہ میں لے جانا فخر سمجھتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں جب سیاح کشمیر آنا چھوڑ دیتے ہیں تو ڈونگہ کو بھی اناج ڈھونے کے کام میں لگایا جاتا ہے اور یہ دو سو من وزن کا غلہ اٹھا سکتا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں جب غیر ملکی، خاص کر یورپی سیاحوں کی آمد و رفت کا سلسلہ یہاں بڑھنے لگا تو آبی مسکنوں اور اقامتی کشتیوں کی زیادہ تعمیر کے ساتھ ساتھ ان کو زیادہ آرام دہ، دیدہ زیب اور پُرکشش بنانے کی طرف خاص توجہ دی جانے لگی۔ اس کے نتیجے میں ڈونگہ نے، جو اُس وقت تک آبی مسکنوں میں آرام دہ مسکن سمجھا جاتا تھا، ہاؤس بوٹ کی شکل اختیار کی۔ اقامتی مقاصد کے لئے اگرچہ یہاں مسلمان حکمرانوں کی شاہی جبلہ سے ہی دو منزلہ کشتیوں کے بنانے کی طرح بھی ڈال دی گئی تھی اور اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ اکبر اعظم جب ۱۵۹۶ء میں اپنی تاج پوشی کی ایک سالگرہ یہاں منانے آئے تو اُن کی خاطر پہلی بار دو منزلہ کشتی تعمیر کی گئی جس میں بیٹھ کر وہ سرینگر کی سیر سے لطف اندوز ہوئے۔ لیکن ہاؤس بوٹ کا موجودہ تصور جس یورپی شخص نے آج سے لگ بھگ ستانوے اٹھانوے سال

قبل ۱۸۸۸ء میں دیا وہ مسٹر کینارڈ[1] (MR. KENNARD) تھا۔ اسی کی کوششوں سے ۱۹۱۸ء میں یہاں پہلی بار دو منزلہ ہاؤس بوٹ بنایا گیا جس کا نام "COL. R. Sartorins & Marty Kennard VICTORY" رکھا گیا۔ کینارڈ کی کوششوں سے بنا ہوا وہ ہاؤس بوٹ[2] آج بھی سری نگر میں راجباغ کے قریب دریائے جہلم کی سطح پر کھڑا ماضی کی یاد دلا رہا ہے۔

ہاؤس بوٹ اصل میں یہاں تجارتی مقاصد کے پیشِ نظر ہی بنایا جاتا ہے اور اپنی وضع قطع، ساخت اور تزئین کاری میں بہت ہی دیدہ زیب اور پُرکشش ہوتا ہے اور بزبانِ حال ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

کے مصداق ہر سیلانی کا دل موہ لیتا ہے۔ ہاؤس بوٹ چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی۔ بڑے ہاؤس بوٹوں کی لمبائی ساٹھ (۶۰) سے نوے (۹۰) فٹ اور چوڑائی پندرہ (۱۵) سولہ (۱۶) فٹ کے قریب ہوتی ہے۔ ایک عالی شان بنگلے کی طرح ہاؤس بوٹوں میں بھی کمروں کی تقسیم کاری کا باضابطہ طور التزام کیا جاتا ہے جن میں کہ دیوان خانہ (ڈرائنگ روم)، کھانے کا کمرہ (ڈائننگ روم)، سونے کا کمرہ (بیڈ روم) اور نعمت خانہ پینٹری (Pantry) اس کے خاص کمرے ہوتے ہیں۔ ہاؤس بوٹ کی مسطح چھت پر گرمیوں کے موسم میں ارد گرد کے ماحول اور قدرتی ماحول کا نظارہ کرنے کے لئے ایک بالا خانہ (Balcony) ضرور ہوتا ہے جس میں کرسیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں اور سائیڈوں پر باریک پردے لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہاؤس بوٹ کا دیوان خانہ اس کے دوسرے کمروں کے مقابلے میں قدرے

---

[1] "KASHIR" - M.D. Sofi

[2] "شیرازہ" - (کشمیری) - جلد ۲۲، شمارہ ۶، "کاشری عجائبات نمبر" مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی - سرینگر

کشادہ اور ایرانی اور کشمیری قالینوں سے سجا سجایا ہوتا ہے۔ اخروٹ کی لکڑی سے بنا ہوا فرنیچر کسی بھی ہاؤس بوٹ کے لئے لازم و ملزوم ساز و سامان سمجھا جاتا ہے۔ اس میں ڈائننگ ٹیبل، کرسیاں، صوفہ سیٹ اور دوسرا آرائشی سامان لگا ہوا ہوتا ہے۔ ہاؤس بوٹ کی بھیتری چھت (ceiling) عام طور پر "ختم بند" طرز کی بنائی جاتی ہے۔ اس طرز کی بھیتری چھت بنانے میں یہاں کے فن کار اپنا ثانی نہیں رکھتے اور اس کے لئے صنوبر کے درخت کی لکڑی ہی کام آتی ہے۔

ڈرائنگ روم میں بھی قالین یا قیمتی ڈریجٹ بچھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کے دروازوں اور کھڑکیوں پر تزئین کارانہ پردے لگائے جاتے ہیں۔ کمرے کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کی غرض سے بھیتری چھت کو شیشے کے فانوس سے سجانا لازمی خیال کیا جاتا ہے۔ گرمی کے موسم میں کمروں کو ٹھنڈا اور سردیوں کے دوران گرم رکھنے کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔ آج کل کے اس لگژریس (LUXURIOUS) دور میں ہاؤس بوٹ کے بیڈروم کو سیاحوں کی کشش اور تفریح کے لئے ٹیلی ویژن سیٹ سے کسی بھی طرح خالی نہیں رکھا جاتا۔

کھانے کے کمرے میں بھی دوسرے کمروں کی طرح قالین بچھے ہوتے ہیں اور دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی الماریوں میں چینی ظروف، شیشے کے برتن اور کٹلری سامان دیکھنے کو ملے گا۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں تبریدی یا خنک ساز الماریاں (REFRIGERATORS) اور کشمیری فنون کے بہترین نمونے سجاوٹ کے طور رکھے جاتے ہیں۔ نعمت خانہ دوسرے کمروں کے مقابلے میں بالکل چھوٹا ہوتا ہے اور اس میں سیاحوں کے لئے کھانے پینے کے قیمتی برتن اور دوسرا ساز و سامان دیواروں کی شلفوں پر قرینے کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں سیاحوں کی پسند کے مطابق مشروبات وغیرہ اسی کمرے کی زینت بنائے جاتے ہیں۔

جہاں تک ایک بیڈروم کی سجاوٹ کا تعلق ہے اس میں اخروٹ کی لکڑی سے بنے ہوئے دیدہ زیب پلنگ دائیں بائیں سجے ہوتے ہیں جن پر ڈنلپ کے نرم و نازک گدے بیڈروم کی زینت کا ایک لازمی حصہ مانے جاتے ہیں۔ سنگار کی آئینہ دار میز (Dressing Table) اس کمرے کی جزئیات میں شامل ہے۔ بجلی کے انتظام سے قطع نظر گیس لیمپ اور عصری دور میں جنریٹر کا انتظام ہاؤس بوٹ کے لوازمات کا ایک ضروری حصہ مانا جاتا ہے۔ بیڈروم کے ساتھ لگے ہوئے غسل خانہ میں سرد و گرم دونوں طرح کے پانی کی فراہمی کا خیال رکھنا ناگزیر بات ہے۔

ایک ہاؤس بوٹ کے ساتھ لگے ہوئے ڈونگہ میں مالک ہاؤس بوٹ اور اس کے کنبہ کے لوگ قیام کرتے ہیں اور وہاں سے ہی کرایہ دار سیاحوں کے لئے کھانا پکا کر لایا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کے ان آبی مسکنوں کی تعداد ایک تازہ سروے کے مطابق ایک ہزار کے قریب ہے[1]۔ یہ آبی مسکن ریاست کی گرمائی راجدھانی سرینگر میں نگین، (باغ)، نسیم باغ، چنار باغ، جھیل ڈل اور پرانے امیرا کدل پل سے رام منشی باغ تک دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر سیاحوں کو ہر وقت دعوت نظارہ دیتے رہتے ہیں۔ اسی لئے یورپی سیاح اکثر ہوٹلوں اور کرایہ کے مکانوں میں قیام کرنے کے بجائے ہاؤس بوٹوں میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ریاستی محکمہ سیاحت نے ان آبی مسکنوں کی درجہ بندی کرکے سیاحوں کے کھانے پینے اور قیام کرنے کے لئے جو روزانہ شرح مقرر کی ہے اس کے مطابق ہر سیاح کو ڈی لکس قسم کے ہاؤس بوٹ میں رہنے کے لئے ۲۲۰ روپے، اے کلاس میں ۱۵۰ روپے، بی کلاس میں ۱۰۰ روپے، سی کلاس میں ۹۰ روپے اور ڈی کلاس میں ۴۵ روپے ادا کرنے پڑتے ہیں۔

---

[1] "شیرازہ" (کشمیری) — جلد ۲۲۔ شمارہ ۶ "کاشُر عجائبات نمبر" مطبوعہ کلچرل اکیڈمی سرینگر

ایک آبی مسکن کی تعمیر پر موجودہ گراں بازاری کے دور میں لاکھوں روپے کا صرفہ اٹھانا پڑتا ہے۔ عام طور پر ہاؤس بوٹ تین ربع صدی تک بغیر کسی خرابی کے چل سکتا ہے بشرطیکہ اس کی دیکھ ریکھ اور رکھ رکھاؤ میں احتیاط برتا جائے۔

خدا کی بنائی ہوئی اس جنت نظیر سی چھوٹی دنیا میں یہاں کی ہر چیز اپنی دل رُبائی میں منفرد بھی ہے اور بے مثال بھی۔ کیوں کہ جس دیس میں جس چیز پر نظر پڑے وہ دل پر جادو کر دے۔ ہر منظر نگاہوں میں کھب جائے۔ ہر سماں من کو بھائے ہر نظارہ رہ رہ کر آنکھ مچولی کرے اور ہر نظر کا بان دیکھتے ہی دل میں اُتر جائے تو وہاں طبیعت میں خود بخود ترنگیں ہی ترنگیں پیدا ہوں گی اور ان ترنگوں پر ہمیں یہاں کے آبی مسکن ماضی قدیم سے برابر ابھارتے رہے ہیں ؎

چہ کشمیر انتخاب صنعت کشور
قسم خوردہ بنجاکش حوض کوثر
نظر چنداں کہ بربستش گماری
بجز آب زمرد نیست جاری
درین گلشن ز جوش خندۂ گل
نمی آید بہ گوش آواز بلبل

(قدسی)

○

معراج الدین

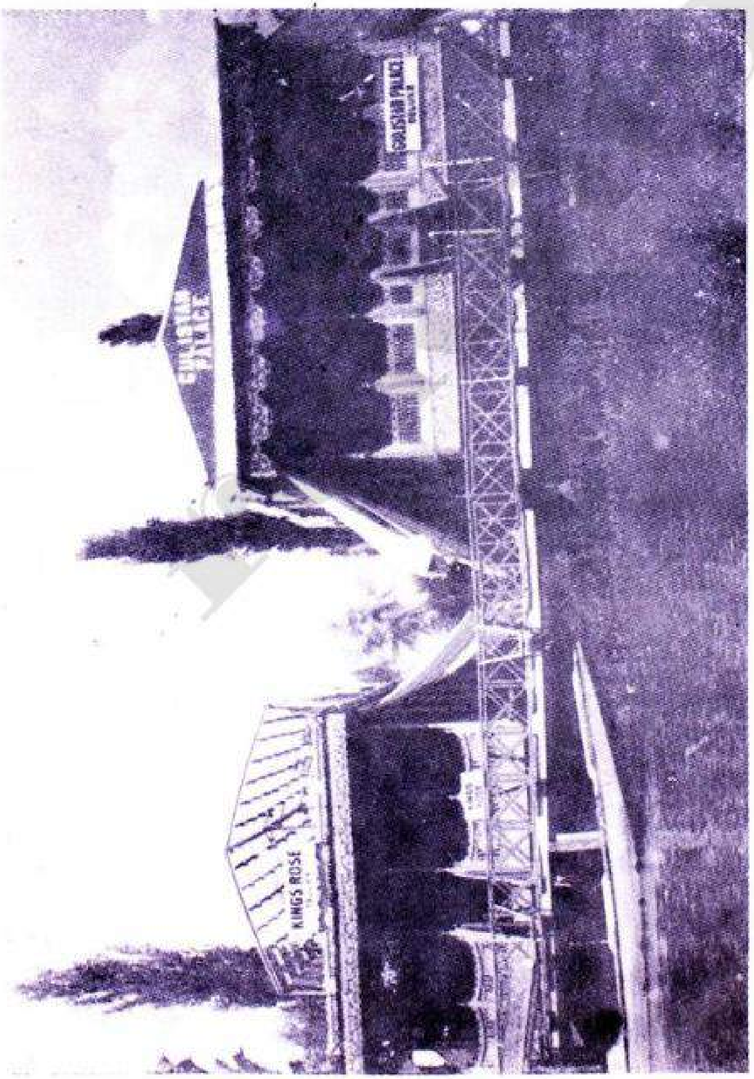
ہاؤس بوٹ

سرینگر میں ہاؤس بوٹ زیادہ تر ڈل جھیل، نگین جھیل اور دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر نظر آتے ہیں جو اپنی جسامت اور اعلیٰ کاریگری کی وجہ سے اہلِ ذوق اور اہلِ نظر کو اپنی اور متوجہ کرتے ہیں۔ ایک اور بات جو ان ہاؤس بوٹوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتی ہے وہ ان کے انوکھے، دلچسپ اور بھانت بھانت کے نام ہیں ــ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت سرینگر میں ہاؤس بوٹوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ "شیرازہ" (کشمیری) کے عجائبات نمبر میں "ہاؤس بوٹ" کے عنوان سے جناب معراج الدین کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے ہاؤس بوٹوں کے کچھ دلچسپ نام بھی درج کئے تھے۔ یہاں پر ہم اس مضمون سے ہاؤس بوٹوں کے نام قارئین کی دلچسپی کے لئے درج کر رہے ہیں۔

(ــ ادارہ)

ڈل جھیل کے پانیوں پر موجود ہاؤس بوٹوں میں سے چند نام:-

1. Taj Mahal 2. Golden Palace
3. Hamayun Palace 4. High Land Palace



یاتری کا من پسند مسکن ـ ہاؤس بوٹ

5. White Shores
6. Janat Palace
7. Queen of the Lake
8. Taj Palace
9. Savoy
10. Floating Castle
11. Persian Palace
12. Bangkok
13. Top Erien
14. New Taj
15. Lango Palace
16. Manzoor
17. Navy
18. Gulistan
19. Dastan
20. kings Rose
21. Shabistan
22. Gulistan Palace
23. Y. Golden Palace
24. Paristan
25. Wood Land
26. Bostan
27. Tunda Palace
28. Gulzar
29. New Blue Jay
30. New Erin
31. Prince of Vales
32. Flower Garden
33. Tehran
34. Pakhtoon Palace
35. Dalgoma
36. Snow view
37. starling
38. Star Night
39. Peer Palace
40. Fayaz
41. Ruhani Palace
42. Star of Kashmir
43. New Dangola
44. Dangola Palace
45. Alziria
46. Erin
47. New Ruby
48. Sun Beam
49. Ruby
50. Union Jack
51. New Chinar
52. Helen
53. Buloo Palace
54. Sheikh Palace

55. New Ara Bella
56. Cultural Palace
57. New Flower Garden
58. Floating Palace
59. Zandar Palace
60. Hermes
61. New Texas
62. S. Shabash
63 Golden Hind
64. Helen of Troy
65. Tree of the Life
66. New Colombo
67. Heaven
68. Harmony
69. Chinar
70. Queen Elizebth
71. Armstrong
72. Bulbul
73. Shera Palace
74 Texas
75. Dawn
76. Merry Dawn
77. Dawn Group
78. Happy Dawn
79. Lucky Dawn
80. New Armstrong
81. Arizona
82. Gulfam
83. Golden Palace
84. Ajenta Palace
85. Royal Kashmir
86. Golden Fleece
87. Rover
88. Jacqueline
89. Kotree Palace
90. Anaar Kali
91. Zum Zum
92. Prince of Kashmir
93. Katherine
94. City Star
95. Vale of Kashmir
96. Diamond
97. Far Pavollion
98. Alaska
99. Mughal Palace
100. Happy Dinner's Club.
101. Veinna Palace
102. Uamarina
103. Blue Dolphin
104. Switzerland



ڈرائنگ روم — ڈائننگ روم

105 Duke of windsor
106. Dubloo Palace
107. New Lucky flower
108. Queen of mountain
109. High Lucky flower
110. Badami
111. Lalzar.
112. Pansy
113. Mughal-e-Azam
114. San Souci
115. New Australia
116. New Sydney
117. New Cherry Stone
118. Pagooma
119. Yuvraj
120 Rolex
121. Treking
122. Malaya
123. King of Kashmir
124. King of Sea
125. Shahpare
126. Queen of Sheba
127. Royal Orchard
128. Solomen Sheba
129 New San Souci
130. Hong Kong
131. Silver Jublee
132 Miss England
133. King Tiger
134 Khyber
135. Jilwi Palace
136 Gul Rose
137. Roxana
138. Pala Palace
139. Rosa Mary
140. Sun Flower
141. Little Flower
142. Goa
143. New Life
144. Royal Soverign
145. Crown of India
146. Ajaz
147. Shabnam
148. Donoo Palace
149. Buckingham Palace
150. New Cherry Life
151. Morning Glory
152. Shabina
153. Pearl Ship
154. Miss India

155. Golden Bell
156. Duke well
157. New Pala Palace
158. New Batkoo Palace
159. Lotus
160. New Titwillow
161. Monalisa
162. Pandora
163. Himalya
164. Noahsark
165. Mandalay
166. King fisher
167. Paintail
168. Heaven Sun
169. Lucifer,
170. Derby Shine
171. Richard Green
172. Beausite
173. Dulce Domum
174. H.M.S. Pinafore
175. Venezia
176. Khuroo Palace
177. Queen of Heaven
178. Prince House
179. New Manila
180. Gemni
181. Coronation
182. New Manhattan
183. Mountana
184. Golden Eagle
185. New Golden Lily
186. Fairy Land.
187. Nightingala
188. Happy House
189. Indoor
190. Timour
191. King Gori
192. New Shabash
193. Dream Palace
194. Zulekha
195 Gulshan Rose
196 Lalla Rukh
197. Gul-o-Bul Bul
198. Mayflower
199. Suffering Moses
200. Mother India.
201. King Fisher
202. Soul kiss

نگین جھیل کے ہاؤس بوٹوں میں سے چند ایک کے نام:

1. New Doreen
2. Silver Bell
3. Moscot one
4. Moscot two
5. New Moscot
6. Lord Palace
7. Royal Suite
8. The Lion
9. Lion of kashmir
10. Sher-i-kashmir
11. Jewel of Kashmir
12. Worrier
13. Inshallah
14. Sobara
15. Yaad Ghar
16. New Yaadghar
17. Nageen Princess
18. H.B. Wangnoo Palace
19. H.B. Manarc
20. New Gurkha.
21. Huermuka
22. Golden Privel
23. Gurkha
24. Islamabad
25. Peocock
26. Canada
27. Golden Flower
28. New Golden Flower
29. Jedha
30. H.B. New Jedha
31. Shalimar
32. New Shalimar
33. Majestic
34. washington
35. Paradise of India
36. Flora
37. Lady of Shirton
38. Bajoom
39. New Bajoom
40. Shah Pari
41. New Blue Bird
42. Blue Bird.
43. Martein
44. Jubblee Noor
45. Perfume Garden
46. Zenith
47. Butterfly.

موتی لال ساقی

زعفران

زعفران اور امبری یا عنبری سیب کشمیر کے دو ایسے تحفے ہیں جنہوں نے قدرت کے اس شاہکار کے خدوخال کو زیادہ دلکش اور دلفریب بنادیا ہے۔ شاید اسی بات کے پیشِ نظر حُسن شناس اور حُسن تراش شہنشاہ جہانگیر نے لکھا ہے کہ کشمیر کے اس قطعۂ ارضی کو ملک نہیں بلکہ باغ کہا جانا چاہیئے۔

زعفران اور امبری اس وقت ہماری فضاؤں کو معطر کردیتے ہیں جب خزاں کی خنک ہواؤں کی آمد آمد ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب وادی کے اطراف و اکناف میں سبھی پھول اپنی بہار دکھا کر رخصت ہونے کو ہوتے ہیں۔ اس موڑ پر زعفران کے مخملی پھول کھل اٹھتے ہیں اور امبری کی خوشبو دل و دماغ کو تازہ کرتی ہے۔ زعفران اور امبری کی خوشبو سے میلوں تک فضا مہک اٹھتی ہے۔ آپ زعفران زار میں جائیے یا امبری سیبوں کے باغ میں آپ محسوس کریں گے کہ آپ عطر فروش کی دکان میں ہیں جہاں عطر کی شیشیوں کے ڈھکن کھلے پڑے ہیں۔

زعفران کو سنسکرت میں کُم کُم یا کنکُم کہا جاتا ہے۔ ہندی میں زعفران کو کیسر اور کشمیری میں "کُونگ" کہا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں زعفران کی کاشت زمانۂ قدیم سے ہوتی چلی آئی ہے۔ کلہن نے راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ زعفران کی گٹھلی تکھشک ناگ نے مہاراجہ للتا دت (۶۹۵ء۔ ۷۳۱ء) کے وزیر کو تحفے کے طور پر دی تھی اور تب ہی سے اس کی کاشت تکھشک ناگ کے آس پاس پانپور کے علاقے میں ہوتی ہے۔ مگر کلہن کے اس بیان کی تردید خود اس کے اپنے ہی لکھے سے ہوتی ہے کیوں کہ "راج ترنگنی" کی پہلی ترنگ میں ہی کلہن نے کشمیر کو کیسر کی دھرتی کہا ہے۔ کلہن کے بیان کی تردید "نیل مت پوران" سے بھی ہوتی ہے جس میں زعفران کا ذکر واضح الفاظ میں ہوا ہے۔ "نیل مت پوران" ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان لکھا گیا ہے۔ جبکہ "راج ترنگنی" بارہویں صدی میں لکھی گئی ہے۔ نیل مت پوران پر ہی بس نہیں، مشہور چینی سیاح ہیون سانگ (۶۲۹ء۔ ۷۳۱ء) نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ کشمیر میں زعفران کی کاشت کا سہرا بودھ ارہٹ مدھیانتک کے سر ہے جو زعفران کی گٹھلی گندھ میدان سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اُس نے یہ بھی لکھا ہے کہ خزاں میں کشمیر کے لوگ زعفران کے پھولوں کی مالا بیل کو پہنا دیتے تھے اور پوجا کے دوران بدھ دھرم کے ماننے والے زعفران کو استعمال میں لاتے تھے۔ مدھیانتک بھگوان بدھ کے نروان کے بعد چوتھی صدی قبل مسیح میں اجات شترو کے دورِ حکومت میں بہت سے بودھ ارہٹ ساتھ لے کر کشمیر آیا۔ کشمیر میں بودھ دھرم کا پرچار اُسی نے شروع کیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بودھ سنگ کا سربراہ سنگ واس زندہ تھا۔ ہیون سانگ سے پہلے بھی ایک چینی کتاب، جو بنیادی طور پر سنسکرت میں لکھی گئی مہایان بدھ مت کے بارے میں ہے،

میں کشمیری زعفران کا ذکر ہوا ہے۔ اس کتاب کا اصلی نام "مہا سنمتا" ہے اور اس کا چینی ترجمہ ۵۸۹ء اور ۶۱۸ء کے درمیان ہوا ہے[1]۔ اس کتاب میں زعفران کا چینی نام کونگ۔ مُو۔ ہِنہ۔ کیا لکھا ہے۔ اور ایک بودھ بزرگ کا نام کونگ 'مو' ہِنہ مُنی لکھا گیا ہے جس کا مسکن کشمیر تھا۔ بعض عالموں نے زعفران کو کشمیری نام "کوہ نگ" کو کُم کُم سے ماخوذ بتایا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ صوتی اعتبار سے کشمیری "کوہ نگ" چینی کونگ سے زیادہ قریب ہے۔ قاعدے کے مطابق چینی نام کے باقی حروف حذف ہو گئے ہیں اور خالی "کوہ نگ" باقی رہ گیا ہے جو اکثر صورتوں میں ہوتا چلا آیا ہے۔ چینی میں زعفران کیلئے متبادل نام مروّج ہونے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چین میں بھی زعفران کی کاشت ہوتی تھی یا ہوتی ہو[2]۔

کشمیر میں بودھ پرچارک مدھیانتک کی بدولت زعفران کی کاشت کو بڑھاوا ملا کہاں تک درست ہے، یہ ایک بحث طلب امر ہے۔ مگر اس بات کی تصدیق کہ مدھیانتک کشمیر آیا تھا 'لنکا کی قومی تاریخ' "مہاونش" اور تارانا تھ کی ہندوستان میں بودھ دھرم کی تاریخ" سے بھی ہوتی ہے۔ تواریخی حوالہ جات کی روشنی میں کشمیر میں زعفران کی کاشت گذشتہ ۲۲ سو سال سے چلی آتی ہے۔ چونکہ ایشیا میں زعفران کی کاشت صدیوں سے کشمیر سے مخصوص ہے۔ شاید اسی بنا پر

---

[1] زعفران کا ذکر مہابھارت میں بھی آیا ہے، جنگ کے خاتمے پر جو تحفے ہمالیائی علاقے کے راجاؤں نے مہاراجہ یدھشٹر کو پیش کئے ان میں زعفران بھی شامل تھی۔ چونکہ کشمیر ہمالیائی علاقے کا ایک حصہ ہے اور ساتھ ہی زعفران کشمیر کے بعد سارے ملک میں کہیں اور پیدا نہیں ہوتی اس لئے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ زعفران کشمیر میں ہزارہا سال سے اُگتی چلی آرہی ہے۔

[2] کشمیر میں پیدا ہونے والی زعفران کا ذکر پانچویں صدی میں کالی داس نے رگھوونش میں بھی کیا ہے اور ہرش وردھن نے چھٹی صدی میں رتناولی میں زعفران کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔



زعفران زار، کھلتے ہوئے سوسن کی کلیں

پر زعفران کو "کشمیر جا" بھی کہا گیا ہے۔

زعفران زمانۂ قدیم سے استعمال میں لائی جاتی رہی ہے۔ کشمیر میں اس کا استعمال ہندو ٹیکا بنانے اور پوجا کے لئے زمانۂ قدیم سے کرتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ زعفران سے خاص قسم کا مرہم اور دوائی بھی تیار کی جاتی تھی۔ ضیافتیں تیار کرنے میں بھی زعفران خوشبودار مسالے (مصالحے کے طور پر) استعمال ہو رہی ہے۔ چائے کے رسیا کشمیری قہوے کو خوشبودار بنانے کے لئے زعفران کا استعمال کرتے ہیں۔ مرغوب اور قیمتی شئے ہونے کے ناطے زعفران کا لفظ مختلف جہتوں میں ہمارے لوک ادب میں بار بار آیا ہے۔ دو اشعار کا مفہوم کچھ یوں ہے سہ

ہم نے تمہارے لئے زعفران کی خاص ترکاری تیار کی ہے۔
محبت سے اس ترکاری کو سبھی لوگ قبول کیجیے۔

یا

ہے رسے کبھی پانپور کے زعفران زار میں زعفران چننے چننے
کیا تو زر روز لوہات پانے کے لئے دیر لگا رہی ہے۔

ایک خاص قسم کا پلاؤ تیار کرنے میں بھی زعفران کا استعمال ہوتا ہے۔ اس پلاؤ کو زعفرانی پلاؤ کہا جاتا ہے۔ کشمیر کے علاوہ زعفرانی پلاؤ ایران اور سپین میں بھی کافی مقبول ہے۔ مغربی دنیا میں جنوبی امریکہ کے علاوہ سپین میں بھی زعفران کی کاشت ہوتی ہے۔

مغربی دنیا کی بات چلی ہے تو سب سے پہلے یونان سامنے آجاتا ہے۔ یونان میں دربار، عدالت اور تھیٹروں کو معطر کرنے کے لئے زعفران کام میں لائی جاتی تھی۔ روم کے لوگ غسل خانوں میں زعفرانی عطر کا چھڑکاؤ کرتے تھے۔ اس بات کے حوالہ جات موجود ہیں کہ جس وقت نیرو روم کے شہر میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں

ۓ امرکوش میں زعفران کو کشمیری الاصل بتایا گیا ہے۔ تبتی میں اسے کر کم کہا جاتا ہے جو کہ سنسکرت کر کم ہی کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔

کے گلی کوچوں کو زعفرانی عطر کے چھڑکاؤ سے مہکا دیا گیا تھا۔ عطر کے علاوہ مغربی دنیا میں بھی زعفران کا استعمال طباخی اور ادویات کی تیاری میں ہوتا تھا۔ عرب فاتحین نے زعفران کی کاشت کو ۹۶۱ء میں شروع کیا۔ انگلستان میں لندن سے ۴۴ میل دور والڈن کے قصبے میں زعفران کی کاشت کو رواج دینے سے متعلق آرا میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہاں پر زعفران کی کاشت کو مروّج کرنے کا سہرا ترپیولی کے ایک زائر کے سر ہے جو زعفران کی ایک گٹھی اپنے عصا کے کھوکھے میں چھپا کر لایا تھا جب کہ دوسرے کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ انگلستان میں زعفران کی کاشت صلیبی جنگوں کے بعد شروع ہوئی۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ زعفران کا اصلی وطن ایشیائے کوچک ہے، جہاں اس کی کاشت کو ر گوز میں ہوتی تھی اور وہیں سے اس کی گٹھیاں مشرق اور مغرب کے ممالک میں پہنچ گئیں (یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ زعفران کے پھول سے کسی قسم کا بیج نہیں نکلتا۔ البتہ زمین میں لگائی گئی گٹھیوں کی تعداد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے)۔ اگرچہ کچھ لوگوں نے کشمیر کو زعفران کا آبائی وطن مانا ہے مگر لودھ ارہٹ مدھیانتک کے حوالے سے جو بات زعفران کی کاشت کے بارے میں کہی گئی ہے کہ زعفران کی گٹھی کشمیر میں باہر سے لائی گئی ہے اگرچہ یہ کام آج سے دو ڈھائی ہزار سال پہلے انجام دیا گیا ہے۔

آٹھویں صدی ہجری کے عربی مخطوطے مسالک الابصار فی ممالک میں زعفران کو ہندوستان کی خاص پیداوار گردانا گیا ہے۔ جس سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کشمیر کے زعفران سے بیرونی دنیا اب سے کافی پہلے آشنا تھی کیوں کہ کشمیر کے بغیر سارے برصغیر میں زعفران کسی اور جگہ پیدا نہیں ہوتی۔ اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ کشمیر میں الماس بھی پایا جاتا ہے جو نادر ہے اس لئے کافی قیمتی ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں وادی کے علاوہ زعفران کی کاشت کشتواڑ میں بھی ہوتی ہے۔ وہاں پر جو زعفران پیدا ہوتی ہے رنگ کے اعتبار سے اگرچہ وہ زیادہ شوخ ہے مگر اس کی خوشبو کشمیری زعفران کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

زعفران کے جو کھیت آج ہمارے کسانوں کے لئے خوشحالی اور فارغ البالی کے ضامن ہیں شخصی دور میں یہی سونا اگلنے والے کھیت اُن کے لئے باعثِ مصیبت تھے۔ ہندو دور کے بارے میں تو معلوم نہیں البتہ شاہمیری سلاطین کے زمانے میں زعفران پر سرکار کی اجارہ داری تھی۔ پھول چُننا اور زعفران کو پھولوں سے الگ کرنا۔ یہ کام لوگوں سے زبردستی کروایا جاتا تھا۔ اس بیگار کے عوض ان کو تھوڑا سا نمک دیا جاتا تھا (یاد رہے کہ پرانے زمانے میں نمک کشمیر میں کافی مہنگا اور نایاب تھا) دو پل زعفران چننے کے بدلے ایک پل نمک زعفران چننے والے کو دیا جاتا تھا)۔ غازی خان چک کے زمانے میں زعفران چُننے کے لازمی بیگار کو ختم کر دیا گیا۔ اس نے ۵۵ سیر زعفران کے پھول چُننے کے عوض پانچ سیر چُنے ہوئے پھول مزدوروں کے لئے اُجرت کے طور پر مقرر کئے۔

زعفران چُننے اور صاف کرنے کے پرانے غیر منصفانہ اور ظالمانہ طریقۂ کار کو شہنشاہ اکبر نے ۱۵۹۶ء میں ختم کر دیا۔ مگر شہنشاہ کی وفات کے ساتھ ہی بیگار کا پرانا طریقۂ کار پھر سے بحال کیا گیا اور لوگ ظلم کی چکّی میں پستے رہے۔ شاہ جہاں کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے بیگار کے طریقے کو منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ زعفران کے کھیت چونکہ سرکار کی ملکیت ہیں اس لئے ان کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو باقاعدہ مزدوری دی جانی چاہیے مگر شہنشاہ نے جاگیرداروں کو یہ آزادی دے رکھی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں زعفران کی اپنی فصل جمع کروا سکتے ہیں۔ اس بات سے اشارہ ملتا ہے کہ سرکار کے علاوہ

زعفران کی کاشت اُس زمین میں بھی ہوتی تھی جو جاگیرداروں کی ملکیت تھی۔ پٹھان دور میں زعفران کے کھیتوں کو نیلامی کے ذریعے ٹھیکے پر دیا جاتا تھا۔ کامیاب بولی دہندہ رقم سرکاری خزانے میں جمع کر دیتا تھا اور بعد میں زعفران کے پھول اپنی مرضی کے مطابق اکٹھے کروا کر زعفران بیچ دیتا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ٹھیکہ دار دوسرے علاقوں سے مزدور لا کر پھول چُننے میں لگا دیتا تھا۔ پٹھانوں کے بعد سکھوں اور ڈوگرہ مہاراجوں نے بھی ٹھیکے کے سلسلے کو جاری رکھا۔ اس زمانے میں زعفران سرکاری آمدنی کا ایک خاص ذریعہ تھی۔ مگر قحط کے دوران جان بچانے کی خاطر لوگ زعفران کی گنٹھیاں کھا لیتے تھے اور پیداوار گر جاتی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۳۲ء کے قحط میں جب لوگ کم و بیش زعفران کی تمام گنٹھیاں کھا گئے تو کاشت کرنے کیلئے بیج کی گنٹھیاں کشتواڑ سے لائی گئیں۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں کسانوں کو زمین کے مالکانہ حقوق مل جانے کے ساتھ ہی استحصال کا صدیوں سے مروّج سلسلہ آئندہ کے لئے ختم ہو گیا۔ گذشتہ زمانے میں اس کی کاشت پانپور سے مخصوص تھی۔ اگرچہ ابُوالفضل نے لکھا ہے کہ اندرکوٹ میں ایک میل پر عریض رقبے میں زعفران کی کاشت ہوتی تھی۔ مگر جہانگیر نے اس کے بیان کو یہ لکھ کر رد کیا ہے کہ کشمیر بھر میں زعفران صرف پانپور میں اگائی جاتی ہے۔ سکھ گورنر میہاں سنگھ نے کریوہ مٹن اور کریوہ دامودر پر زعفران کاشت کرنے کا تجربہ کیا تھا مگر ناکام رہا۔ پر اب صورت حال نے پلٹا کھایا ہے۔ آج کل ناگام کریوہ ستمبر کے مہینے میں زعفران کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے اور میلوں تک زعفران کے پھول لہلہاتے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی زعفران اُگائی جاتی ہے جو پانپور کی زعفران سے کسی لحاظ سے کم تر درجے کی نہیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ اب وسعت پکڑتا جا رہا ہے حالاں کہ چوہے زعفران کی کاشت میں کافی اڑچن پیدا کرتے ہیں مگر اب اس مشکل پر بھی قابو پایا جا رہا ہے۔ اس

سلسلے میں محکمہ زراعت بھی کافی سرگرم عمل ہے۔ اس نئی صورت حال نے اُس اسطوری روایت کو مسمار کر کے رکھ دیا ہے کہ پانپور کے سوا زعفران کی کاشت دوسرے مقامات پر کامیابی کے ساتھ کرنا ممکن نہیں۔

زمانے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ زعفران کی پیداوار میں بھی کمی و بیشی ہوتی رہی ہے۔ اکبرنامے میں درج ہے کہ اُس زمانے میں ایک گنٹھی پر تین پھول کھلتے تھے اور سرکار کو کبھی ۲۸ من اور ۸۸۸½ من پھول حاصل ہوتے تھے۔ مرزا حیدر دوغلات کے وقت ۲۵۰۰ من زعفران کے پھول حاصل ہوتے تھے اور سنہ ۱۵۹۵ء میں جب زعفران کے زیر کاشت رقبے کو سرکاری تحویل میں لیا گیا۔ ہر گنٹھی پر آٹھ پھول کھل اُٹھے اور پیداوار ۱۱۲۸۰ من تھی۔ قدیم اندازے کے مطابق ایک سیر خالص زعفران ۲۸ سیر پھولوں سے حاصل ہوتی تھی۔

ابوالفضل کے مطابق زعفران کی گنٹھی تھوم کی گنٹھی جیسی ہوتی ہے اور اسے اپریل کے مہینے میں زمین میں لگایا جاتا ہے۔ بارش سے گنٹھی اپنی جڑیں جما لیتی ہے اور ستمبر کے مہینے میں پھول کھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ زعفران کا پودا ایک فٹ کے قریب اونچا ہوتا ہے مگر پودے کی اونچائی کا دارومدار زمین کی زرخیزی پر منحصر ہے۔ ممکن ہے کہ مغلوں کے زمانے میں گنٹھیاں اپریل میں بوئی جاتی رہی ہوں مگر اب کے یہ طریقہ بدل گیا ہے۔ آج کل گنٹھیاں جولائی اور اگست کے دوران کیاریوں میں لگائی جاتی ہیں۔ ہر کیاری جسے کشمیری میں "کونگ واڑ" کہتے ہیں، چوکور ہوتی ہے۔ جس کی لمبائی آٹھ فٹ اور چوڑائی سات فٹ ہوتی ہے۔ زمین میں ہل چلا کر سب سے پہلے مٹی کے ڈھیلے اچھی طرح توڑے جاتے ہیں۔ تاکہ ڈھیلے مہین ہو جائیں۔ اس کے بعد اسے کیاریوں میں بانٹا جاتا ہے۔ کیاریوں کا ڈھلوان ہونا ضروری ہے تاکہ بارش کا فاضل پانی ان میں ٹھہرا نہ رہے کیوں کہ پانی ٹھہرا رہنے سے گنٹھیاں سڑ

جاتی ہیں۔ پانی کے نکاس کے لئے کیاری کے اردگرد نالی یا راستہ بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد کیاری میں ۱۰ انچ سے لے کر ایک فٹ کی اونچائی کی مینڈھیں بنائی جاتی ہیں جن میں پانچ سے چھ انچ کی دوری پر زعفران کی گٹھیاں لگائی جاتی ہیں۔ زعفران کی کاشت کے لئے غیر آبپاشی اراضی کی ضرورت ہوتی ہے مگر زمین بنیادی طور پر کافی زرخیز ہونی چاہئے۔ کیونکہ کاشت کے لئے نہ تو زمین میں کسی قسم کی کھاد کا استعمال ہوتا ہے اور نہ ہی اسے پانی دیا جاتا ہے حالانکہ چند ایک سال تک زیر کاشت لانے کے بعد زعفران کی کیاریوں کو سالہا سال تک خالی چھوڑنا پڑتا ہے، تاکہ ان کی زرخیزی قدرتی عمل سے خود بخود بحال ہو جائے۔ گٹھیاں چودہ سال تک بھی زمین میں صحیح و سالم رہتی ہیں۔ اس کے بعد اُن کی جگہ نئی گٹھیاں لے لیتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اتنی دیر تک گٹھیوں کو زمین میں رہنے نہیں دیا جاتا اور ہر تین سال کے بعد گٹھیاں اکھاڑنے اور نئے سرے سے ان کو بونے کا طریقہ اپنایا گیا ہے جس کی بدولت پیداوار اچھی ہوتی ہے۔

زعفران کا مخملی رنگ پھول کینو سے ملتا جلتا ہے۔ جب زعفران زار کھِل اٹھتا ہے اس وقت ہر طرف خوشبو کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ اور کیف و سرور کا سماں بندھ جاتا ہے۔ حالانکہ زعفران کی اس خوشبو کا اثر ان لوگوں پر نہیں ہوتا ہے جو زعفران چننے کے عادی ہوتے ہیں مگر یہ بات ہر ایک کے لئے سچ ثابت نہیں ہو سکتی۔ جہانگیر نے یہ تک لکھ چھوڑا ہے کہ جب اہلکاروں سمیت زعفران زار کا نظارہ دیکھنے کے لئے گئے تو سبھی لوگ سر درد کا شکار ہو کے رہ گئے۔ زعفران چننے کا عمل بھی خاصا دلچسپ اور صبر آزما ہے۔ چننے کے بعد پھولوں کو دھوپ میں سکھایا جاتا ہے۔ دوسرے مرحلے پر پھول کے بیچ میں موجود ڈنڈیوں کو چن

لیا جاتا ہے۔ یہ ڈنڈیاں کیسری رنگ کی ہوتی ہیں۔ مگر اس کا کچھ حصہ سفید ہوتا ہے۔ زعفران کی ان ڈنڈیوں کو کشمیری میں "ہینچھ" کہا جاتا ہے۔ ڈنڈیوں کے سُرخ حصہ کو شاہی زعفران کہتے ہیں۔ اس کا سفید حصہ بھی زعفران ہی ہوتی ہے۔ مگر شاہی زعفران سے کمتر درجے کی۔ شاہی زعفران کا شمار اعلیٰ درجے میں ہوتا ہے جبکہ سفید حصے والی دوسرے درجے کی زعفران ہوتی ہے۔ ڈنڈیاں الگ کرنے کے بعد پھولوں کو پھر دھوپ میں سکھایا جاتا ہے۔ پھر ان پھولوں کو چھڑی سے ہلکے ہلکے کوٹا جاتا ہے۔ اس عمل کے بعد پھولوں کو پانی میں ڈالا جاتا ہے۔ پھول پانی پر تیرتے رہتے ہیں اور نچلی زعفران، جس میں زرگل بھی شامل ہوتا ہے تہہ میں جمع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پانی کو نتھار کر تہہ میں جمی زعفران کو سکھایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ تین بار دہرایا جاتا ہے۔ شاہی زعفران کو کشمیری میں "منگر" اور دوسرے درجے کی زعفران کو "لَچھ" کہتے ہیں۔ زعفران کی کیاریوں سے جو پیداوار حاصل ہوتی ہے اس کے بارے میں جانکاری دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ زعفران کاشت کرنے والوں کی زبان میں پچاس کیاریوں پر محیط رقبے کو پیَھ کہتے ہیں۔ اس ایک پیَھ سے پہلے سال ڈھائی سیر پھول حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے سال یہ پیداوار ۲½ سیر اور تیسرے سال ۹ سیر تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر کیاریوں کی نگہداشت اچھی طرح نہ کی جائے اور چوہوں کا سدباب نہ ہو تو پیداوار کافی گھٹ جاتی ہے۔ سال میں زمین کی چار بار گڈائی کرنا ضروری ہے۔ زمین میں نمی کا قائم رہنا اچھی فصل نہ ہونے کی ضمانت ہے۔ اگر اپریل اور مئی کے دوران بارشیں اچھی ہوں تو زعفران کی بھرپور کھیتی کی آشا کی جا سکتی ہے۔ ورنہ اس میں کمی ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ ابھی تک زعفران بیماریوں سے بچی ہوئی ہے مستقبل کیا گل کھلائے گا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شہد کے جو

چھتے زعفران کے کھیتوں کے آس پاس لگے ہوتے ہیں، اُن سے حاصل ہونے والا شہد کافی لذیذ اور خوشبودار ہوتا ہے۔

زعفران کی دھرتی کشمیر رنگوں اور نظاروں کی سرزمین ہے۔ اس سرزمین کو کبھی شاردا پیٹھ تو کبھی ایران صغیر اور کبھی زعفران کی نسبت سے کیسر کی دھرتی کا نام دیا گیا ہے۔ ہماری دھرتی نام کی ہی نہیں بلکہ سونا اُگلنے والی دھرتی ہے جس کے چمن زاروں میں زعفران پیدا ہوتی ہے جو سونے سے کسی طرح کم نہیں۔ ہمارے زعفران زار سونے کی ایسی کانیں ہیں جو کبھی بھی خالی نہیں ہو سکتیں۔

○

قارئین سے گذارش

- شیرازہ کے بارے میں اپنی رائے بطور خاص مرحمت فرمائیے اور اپنے مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیئے۔
- شیرازہ کو اپنے دوستوں سے متعارف کرائیے اور خریداری کے لئے توجہ دلا کر اسے زیادہ سے زیادہ ادب نوازوں تک پہنچانے کی کوشش میں ہمارا ساتھ دیجئے۔

○

دو نوشتے

کاشر انسائیکلو پیڈیا سے

① اسلام آباد

اسلام آباد شہر سری نگر کے جنوب مشرق میں ۵۵ کلو میٹر کی دوری پر ۳۳° ۴۹ عرض بلد اور ۷۵° طول بلد کے درمیان علاقہ مراز کا سب سے بڑا قصبہ اور ضلع کا صدر مقام ہے۔

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہی اسلام آباد کو قصبہ کی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں مغل گورنر اسلام خان (۱۶۶۴ء — ۱۶۶۵ء) نے اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء — ۱۷۰۷ء) کے لئے ایک باغ تعمیر کیا تھا جس نے بعد میں اس جگہ کا نام گورنر کے نام کی مناسبت سے ہی اسلام آباد رکھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں اس کا نام دوبارہ اننت ناگ رکھا۔ چنانچہ آج کل یہ قصبہ ان دونوں ہی ناموں سے جانا جاتا ہے۔

آج کل اسلام آباد میں زمانۂ قدیم کی تعمیرات میں سے کوئی بھی تعمیر دیکھنے میں نہیں آتی۔ بارن ہوگل (۱۸۳۵ء) نے جب کشمیر کا دورہ کیا تھا تو اس نے

اس وقت مغل دورِ حکومت کے کئی آثار اپنی خستہ حالی میں دیکھے تھے۔ اس بارے میں وہ رقمطراز ہے کہ اسلام آباد کو ایک عرصہ تک کشمیر کا دوسرا بڑا شہر سمجھا جاتا تھا۔

اسلام آباد میں بڑے چشمہ کے نزدیک سیمنٹ کے ایک چبوترے کی شکل میں بغیر چھت کی وہ مسجد دیکھی جا سکتی ہے جو سارے کشمیر میں منفرد نوعیت کی مسجد ہے۔ عام طور اسے دارا شکوہ کی مسجد کہا جاتا ہے۔ لیکن اس ثبوت میں اس مسجد پر کوئی بھی کتبہ وغیرہ پایا نہیں جاتا۔ پرانے زمانے میں شیر باغ کے احاطے میں ایک سرائے ہوا کرتی تھی۔ مگر آج اس میں ایک دو دھرم شالائیں ہیں۔ اسلام خان گورنر کے وقت میں ہی اس چشمہ پر جو گھاٹ باندھے گئے تھے جن کی بعد میں مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء - ۱۸۸۵ء) نے مرمت کروائی تھی۔

قصبہ میں ریشی مول صاحب کی مشہور زیارت بھی ہے جو مرجعِ خلائق ہے۔ ریشی مول صاحب کا اصلی نام بابا ہردی ریشی تھا جن کے متعلق شیخ نورالدین علمدارِ کشمیر نے اپنے شاگرد بابا نصر سے ایک دن اس زیارت کی جگہ ستاتے وقت کہا تھا کہ یہ قطعۂ ارض اس مردِ درویش کی آخری قرارگاہ ہوگی جس پر کہ ریشی سلسلہ ختم ہوگا۔ ریشی مول صاحب کی زیارت اب نئے سرے سے تعمیر کی جا چکی ہے لیکن اسکی تعمیر کاری ریشی استھاپنوں کی طرح چار بام طرز پر ہے جس کے اوپر لکڑی کا بنا ہوا گنبد اور گنبد پر کلس لگا ہوا ہے۔ اس استھاپن کے نزدیک ہی اسلام آباد کی جامع مسجد ہے۔

اسلام آباد کا قصبہ گبہ دوزی، شالبافی اور لکڑی کی بنی ہوئی چیزوں کے کام کے لئے ماضی سے ہی مشہور تھا اور اب یہ کشمیر میں نئے طرز کا ایک بڑا قصبہ سمجھا جاتا ہے جہاں نئی زندگی کی ساری سہولتیں میسر ہیں۔

۵۔ (کشمیری سے ترجمہ
اصل: موتی لال ساقی
مترجم: نشاط انصاری)

۶۔ کتاب نامہ:

BATES / HUGAL
SOFI : KASHEER

۲ اشوک ایشور مندر

اشوک ایشور مندر بجبہاڑہ میں تھے۔ راجہ وجے نے یہاں ایک مندر بنوایا تھا جسے اس دور میں شیو وجے ایشور کہا کرتے تھے۔ اسی مندر کے احاطے میں راجہ اشوک (۲۲۸ء - ۲۶۳ م۔ب) نے اشوک ایشور کے نام سے دو مندر بنوائے تھے۔ حال ہی میں بابا نصیب الدین صاحبؒ کی زیارت کے پاس پرانے آثار ملنے کے ثبوت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ وجیشور مندر سے لے کر بابا نصیب صاحب کی زیارت تک اور اس کے دائیں بائیں پورے علاقہ کے احاطہ بند ہونے کی بات یقینی ہے۔ بابا نصیب الدین کے احاطے میں جو پرانے آثار بہم ہو چکے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر میں حجری (پتھر کی) تعمیرات کی ابتدا مسیح سے تین سو سال پہلے ہو چکی تھی۔ مگر لگتا یہی ہے کہ اس دور میں شاید راج محلوں کی تعمیر میں پتھروں کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ بصورت دیگر ہمیں کسی نہ کسی جگہ حجری تعمیرات کے آثار ضرور ملے ہوتے۔ اندازہ یہی کیا جاتا ہے کہ اشوک ایشور مندر کے آثار وہی ہیں جو بابا نصیب الدین کی زیارت کے اردگرد منتشر حالت میں ہیں۔

سٹائن جب پہلی بار (۱۸۸۹ء میں) بجبہاڑہ گیا تو اس نے وہاں کچھ ٹوٹے پھوٹے پتھر مٹی کے نیچے دبے پائے اور ۱۹۸۱ء میں یہاں کچھ مورتیاں اور پتھر کے ستونوں کے پلیٹ فارم بھی ہاتھ آئے ہیں۔ (م۔ع)

۵۔ (کشمیری سے ترجمہ۔ اصل: مجید عاصمی
مترجم: نشاط انصاری)

۶۔ کتاب نامہ:

STEIN : Raj
STEIN : Geog.

بزمِ شیرازہ

○ مکتوب نگار کی رائے سے ادارے یا ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ○

علقمہ شبلی۔ کلکتہ۔

شیرازہ مل رہا ہے۔ کچھ دنوں پہلے تین شمارے ایک ساتھ ملے تھے۔ کل مارچ کا شمارہ ملا ہے۔ ممنون کرم ہوں۔ تازہ شمارے میں جوگندر پال نے وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کا جائزہ صحیح تناظر میں لیا ہے پال کی طرز نگارش نے مضمون کو دل چسپ بنا دیا ہے۔ قدوس جاوید نے بھی پریم چند، شرت چندر اور ٹیگور کے تقابلی مطالعہ کی کوشش کی ہے۔ یہ تینوں اپنے دور کے Genius تھے۔ ان کا مطالعہ فکر انگیز اور پُر لطف ہے۔

اسلم حنیف۔ گنور۔ یوپی

سالِ رواں کا شمارہ نمبر ۳ موصول ہوا۔ شکریہ۔

جدیدے کے تمام تر مضامین معیاری ہیں۔ وزیر آغا کی انشائیہ نگاری پر جوگندر پال نے کُھل کر لکھا ہے۔ وزیر آغا کی شخصیت میں جو تخلیقی اور تنقیدی عناصر بہ یک وقت حلول کئے ہوئے ہیں ان کا تجزیہ شاید بہ وقت ناممکن ضرور ہے۔

اسی لئے مبصر نے ان کے ایک تابناک پہلو پر جو روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے وہ وسیع امکانات پر سے پردے سرکاتی ہے۔ انشائیہ جتنی مشکل صنفِ سخن ہے، وزیر آغا نے اسے اپنے یہاں اتنا ہی محتاط ہو کر برتا ہے۔

'ایسے کو تیسا' اور 'بڑا آدمی' بھی متاثر کرنے والے مضامین ہیں۔ مؤخر الذکر کو انشائیہ قرار دینے میں از سرِ نو غور کی ضرورت در پیش آتی ہے۔ غزلیات کا انتخاب بھی خوبصورت ہے۔ جدیدے کو اس ادبی معیار تک پہنچانے کی جہدِ پیہم کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

پہلی بار میں اپنا تحقیقی اور تنقیدی مضمون آپکی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ یہ مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ میں نے اس میں اردو تنقید کے غلط اندازِ فکر کو مسترد کرتے ہوئے جدید اصناف کی تحقیق و تدوین کے وقت عربی ادب سے استفادہ کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی۔ نئی دہلی۔

اپریل ۱۹۸۶ء کا شیرازہ نظر نواز ہوا۔ گوشۂ اقبال نے دل جیت لیا۔ میں بھی اقبال کا زبردست مداح ہوں اور راسی "ہاتفِ غیبی کا ہیولہ" کہنے کا دم بھرتا ہوں۔ محمد یوسف ٹینگ صاحب کے مضمون کو پڑھ کر حیران رہ گیا۔ الہٰی ... کیا نثر ہے۔ نثر میں شاعری ہو رہی ہے۔ اللہ اللہ رے کرایک ڈاکٹر محمد حسین کو دیکھا جو بات سے بات پیدا کرتے ہوئے بھی نثر میں شاعری کے امکان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اب ٹینگ صاحب کو ـــ طبیعت جھوم گئی۔ یہ لطف اب تک لے رہا ہوں کہ ہاتھ میں قلم ہے اور قلم ٹینگ صاحب کے زورِ قلم کا قصیدہ پڑھ رہا ہے۔

شیرازہ کا یہ شمارہ 'آجکل' اردو کے دفتر سے ملا۔ میرا دہلی کا پتہ نوٹ کر لیں۔ خط و کتابت اور تمام امور کے لئے اب یہی پتہ استعمال کرتا ہوں۔ آپ کے پاس میری دو کہانیاں اور بھی ہوں گی۔

فاروق شفق - ایم اے - کلکتہ

"شیرازہ" کے مارچ اور اپریل کے شمارے ایک ساتھ ملے۔ میں آپ کی اس محبت کا دل سے ممنون ہوں۔ مواد کے اعتبار سے دونوں شمارے خاص نمبر کا حکم رکھتے ہیں۔ اپریل کے شمارے میں گوشۂ اقبال "بھی خوب ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ہر مضمون نگار نے ایک نئے اور اچھوتے زاویے سے اقبال کے فن کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مارچ کے شمارے کو ارجن دیو مجبور کے دلچسپ اور معلوماتی مضمون نے ممتاز اور منفرد بنا دیا ہے۔ ایسے کام کے مضامین آئندہ بھی چھاپنے کا اہتمام کیجئے۔

دونوں شماروں میں منظومات کا حصہ بھی خاصا وقیع اور رنگارنگ ہے۔ مصور سبزواری اور فضا ابن فیضی کی غزلیں اپنی مخصوص فضا کی وجہ سے متاثر کرتی ہیں۔ دیگر غزلوں کے بھی بیشتر اشعار پسند آئے۔ جوگندر پال نے وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کا اچھا جائزہ پیش کیا ہے۔ تجزیاتی مطالعہ کے فقدان کی وجہ سے مضمون بہرحال بہت اوپر نہیں اٹھ سکا۔

'شیرازہ' کے لئے دو بالکل تازہ اور غیر مطبوعہ غزلیں بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے پسند آئیں گی۔

ڈاکٹر خورشید سامی - مظفر پور، بہار۔

"شیرازہ" کے دو شمارے بیک وقت موصول ہوئے۔ بہت ہی کامیاب اور خوبصورت شمارے ہیں۔ طبیعت خوش ہو گئی۔

اس سے پہلے بھی "شیرازہ" کے لئے لکھوایا تھا آپ نے۔ اس لئے میں نے سوچا اس بار آپ کی فرمائش سے قبل ایک مضمون بھیج ہی دوں۔ مجھے یقین ہے مضمون ضرور پسند آئے گا۔

سید احمد سحر - شاہجہانپور۔

جناب خورشید ملک کی نوازش سے جنوری ۶۳ء کا شیرازہ دیکھنے کو ملا۔ رسالے کا سائز اور انداز بھی ۱۹۶۲ء سے کہیں بدلا ہوا پایا۔ مگر بہت بہتر ہے اور خالص ادبی۔ بغیر کسی خاص تعارف کے غزل بھیجنے کی ہمت کی ہے۔ کیوں کہ روایت اور جدیدیت کے چکر نے بھی ویسے ہی لیبل شعراء اور ادبا پر لگا دیے ہیں جیسے کبھی ترقی پسند تحریک والوں نے لگائے تھے۔ پھر معروف ناموں کی بھی رسائل پر خاصی اجارہ داری مسلم ہے۔ معلوم نہیں ایسی حالت میں آپ کے رسالے میں بھی ہم جیسوں کے لئے کوئی گنجائش ہے یا نہیں۔

بہرحال رسالے میں دی گئی تمام پابندیوں کا خیال رکھتے ہوئے دو غیر مطبوعہ اور تازہ غزلیں ارسال خدمت ہیں۔ اگر پسند فرمائیں تو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔

بلقیس حسن - نئی دہلی

"شیرازہ" موصول ہوا۔ اس نوازش کے لئے تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ آفاق احمد اور مصور سبزواری کی غزلیں پسند آئیں۔ کرشن موہن بھی اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ عزیز اندوری صاحب کا یہ شعر محل نظر ہے ؎

میں کب سے زیست کے اندھے کنویں میں مرتا ہوں
عزیزِ مصر! یہاں سے نکال دے مجھ کو

جبکہ جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے 'یوسف کو اندھے کنویں سے نکالنے والے عزیزِ مصر نہیں اہلِ کارواں تھے! عزیزِ مصر نے تو ان کو خریدا تھا۔ افسانے ٹھیک ہی ہیں۔ جوگندر پال اور قدوس جاوید کے مضامین پسند آئے۔ مجموعی طور پر آپ کی کاوشیں قابلِ داد ہیں۔

دو غزلیں بھیج رہی ہوں۔ پسند آئیں تو "شیرازہ" میں شامل کر لیجئے۔ کہانی

بھی جلد ہی بھیجنے کی کوشش کروں گی۔

شبیب رضوی۔ اندرون کاٹھی دروازہ سرینگر

ایک "سفید غزل" شیرازہ میں غالباً شائع ہوئی تھی۔ اب مختلف قافیوں میں تین "سفید غزلیں" روانہ کر رہا ہوں۔ نمبر آنے پر شریکِ اشاعت فرما لیجئے گا۔ ایک ہی اشاعت میں آجائیں تو اچھا رہے گا۔

سرداری لال نشتر۔ شملہ

دلکش، دلفریب "شیرازہ" کے مارچ اور اپریل ۸۳ء کے دونوں شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے۔ ان کا حسن و خوبی دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ آپ کی یادآوری اور کرم فرمائی کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔

ایک پڑھنے والے کے لئے اس سے زیادہ مسرت انگیز بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اسے اپنے مذاق کے موافق پڑھنے کے لئے ادبی مواد دیا جائے..... دونوں شمارے بہت خوب ہیں اور اپنے اندر ایک بیش بہا ادبی ذخیرہ رکھتے ہیں۔ شمارہ نمبر ۳ میں جناب جوگندر پال صاحب کا مضمون "وزیر آغا کی انشائیہ نگاری" بہت قابلِ قدر ہے۔ انہوں نے اسے جس خوبی سے لکھا ہے اُس کی ستائش بے سود ہے۔ جناب فردوس جاوید نے "پریم چند، شرت چندر اور ٹیگور" نہایت پاکیزہ مضمون لکھا ہے۔ اس طرز کے لکھنے والے بہت کم ہیں۔ شیخ سلیم احمد صاحب کا "بڑا آدمی" بے حد دلچسپ ہے۔ دونوں افسانوں کا انتخاب قابلِ داد ہے۔ حصۂ نظم بھی ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ جنید حزیں لاری کی غزل کے کیا کہنے!

شمارہ نمبر ۴ (اپریل ۸۳ء) کا "گوشۂ اقبال" ایک خاصے کی چیز ہے ــــ پانچوں مضامین کو پڑھنے سے شاعرِ اعظم کی شخصیت اور ان کے فن کو پورے طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بلکہ ہم اُن کے فن کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں! اس قسم کے مضامین اگر دیگر شعراء پر بھی لکھے جائیں تو ہمیں اُن کی عظمت سے باخبر ہونے کے مواقع ملتے رہیں گے۔ "تزکِ جہانگیری" (کاشی ناتھ پنڈت) کاوش و تحقیق سے بھرپور ہے۔ دونوں افسانے پُرلطف ہیں ـــ جناب شفیع اللہ خان راز اٹاوی کی نظمیں بہت خوب ہیں۔ جناب نظام الدین کا "اقبال اور ہمالہ" پڑھ کر زبان بے اختیار کہہ اٹھی کہ "ہمالیہ ہے، ہمیشہ رہے گا، ہمارا رہے گا"۔ کیوں کہ وہ ہے، اس لئے ہم ہیں!

اور ہاں سب سے ضروری بات تو کہنا بھول گیا ــــ جناب ہنسراج رہبر کا "ایسے کو تیسا" اور جناب احسن دلو مجبور کا "بلتی زبان"۔ ان دونوں مضامین میں فاضل ادیبوں نے نہایت اچھوتے موضوعات پر نہایت دلچسپ پیرائے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ سلیس و شگفتہ زبان نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو اگر علمی و ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ، نازک خیالی و پاکیزہ بیانی کے اعلیٰ ادبی مضامین اور فنونِ لطیفہ کے بارے بھی نگارشات "شیرازہ" کے صفحات کی زینت بنتے رہیں۔

میری قلمی اعانت ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے۔

• تھاپی (Wooden Hammer): اس سے کٹالی اور ٹانکی کو گتے یا کسی چیز کو کاٹتے وقت چوٹ مارنے کے کام لایا جاتا ہے۔

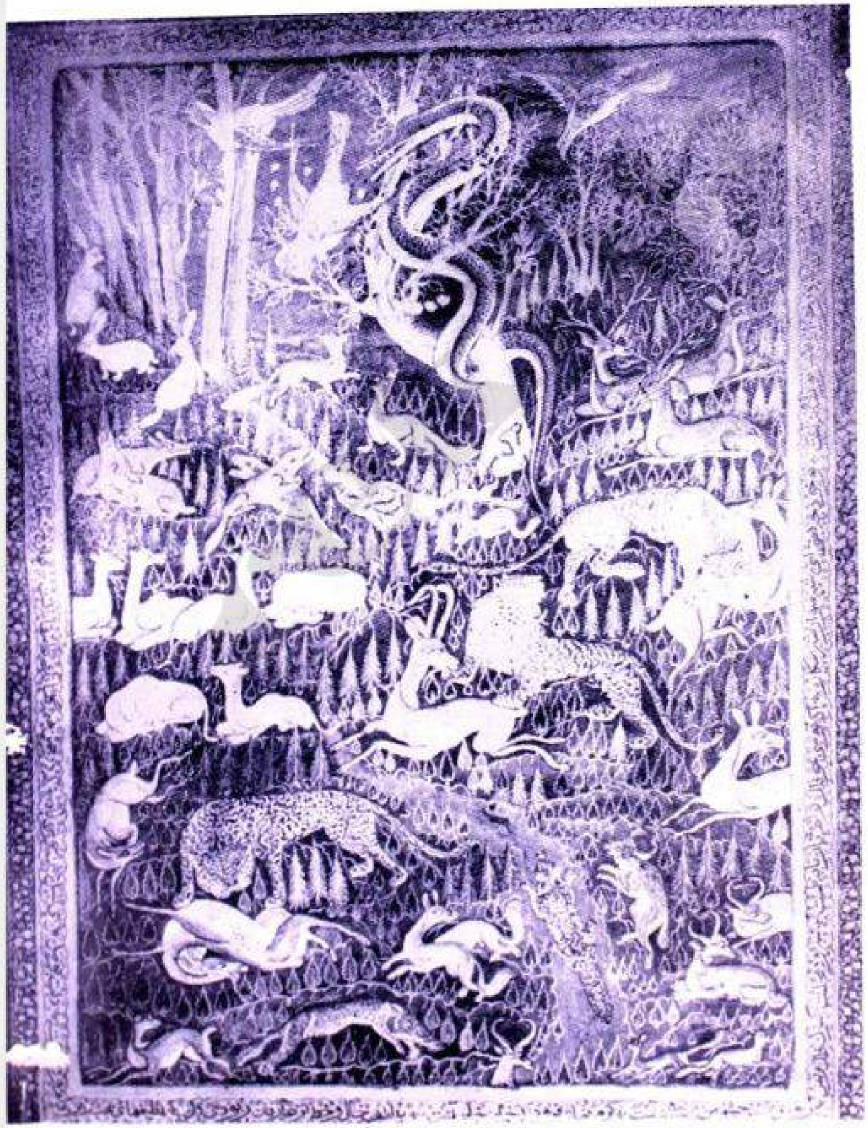
• سل: چپٹی (ہموار) اور پتلے پتھر کی ہوتی ہے جس پر بورے کو رکھ کر لئی کے ساتھ ملایا جاتا ہے اور جوڑی ہوئی مسطح چیزوں کو سوکھ جانے تک وزن کے طور سرے پر رکھا جاتا ہے۔ اس کا سائز ۱۸" x ۱۲" ہوتا ہے۔

• آری اور استیغ - یہ دونوں قسم کی آریاں ساختہ سازی میں ضروری اوزار ہیں۔ آری عام چیر پھاڑ کے استعمال میں آتی ہے۔ اس کے دندانے استیغ سے قدرے موٹے ہوتے ہیں۔ استیغ کے دندانے باریک ہوتے ہیں۔ یہ ساختہ کے عددوں کے ڈھکنوں کو سیدھ میں کاٹ کر علیحدہ کرنے میں کام آتی ہے۔

• ریتی یا سوہان: یہ ایک موٹے دندانے کی ہوتی ہے اور دوسری دو رُخ والی یعنی ایک کو File Rasp اور دوسری کو File کہتے ہیں۔ اس کی ایک سطح چپٹی اور دوسری نیم گول ہوتی ہے۔ ایک اور File بالکل گول ہوتی ہے۔

• کرنی: یہ چھوٹی اور بڑی ہوتی ہے۔ کام کی مناسبت سے استعمال ہوتی ہے۔ لچکدار اور پتلے اسپات والی کرنی بہترین مانی جاتی ہے۔ اس سے mould پر لُوبا (مالیدہ) ڈھانپتے وقت ہموار رکھا جاتا ہے۔ یہ لوہاروں اور ہارڈ ویئر والوں سے دستیاب ہوتی ہے۔

• بٹّا: تقریباً آدھ سیر وزن کا پتھر ہوتا ہے جو ایک طرف چپٹا اور دیگر اطراف سے کہیں گولائی لئے ہوئے اور کہیں ترچھا ڈھلوان یا نالی دار ہوتا ہے۔ یہ ساختہ سازی میں بڑا ہی کارآمد ہے۔ اس کو انگریزی میں Moul-der کہتے ہیں۔ اور کشمیری میں "وٹہ" - یہ عموماً پہاڑی ندی نالوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ "آرہ وٹھ" بھی کہلاتا ہے۔ بورے والے ساختہ کو



تصویر نقاش - پیپر ماشی شکارگاہ

ملتے رہیں گے۔ "تزکِ جہانگیری" (کاشی ناتھ پنڈت) کاوش و تحقیق سے بھرپور ہے۔ دونوں افسانے پُرلطف ہیں۔ جناب شفیع اللہ خان راز اٹاوی کی نظمیں بہت خوب ہیں۔ جناب نظام الدین کا "اقبال اور ہمالہ" پڑھ کر زبان بے اختیار کہہ اٹھی کہ "ہمالیہ ہے، ہمیشہ رہے گا، ہمارا رہے گا۔" کیوں کہ وہ ہے، اس لئے ہم ہیں!

اور ہاں سب سے ضروری بات تو کہنا بھول گیا ۔۔۔ جناب نسراج رہبر کا "ایسے کو تیسا" اور جناب ارجن دیو مجبور کا "بلتی زبان"۔ ان دونوں مضامین میں فاضل ادیبوں نے نہایت اچھوتے موضوعات پر نہایت دلچسپ پیرائے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ سلیس و شگفتہ زبان نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو اگر علمی و ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ، نازک خیالی و پاکیزہ بیانی کے اعلیٰ ادبی مضامین اور فنونِ لطیفہ کے بارے بھی نگارشات "شیرازہ" کے صفحات کی زینت بنتے رہیں۔

میری قلمی اعانت ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے۔



.... جس کی گرمی سے فلک پر ہے دماغِ اہلِ بزم